حیاتِ امداد رحمۃ اللہ علیہ

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکہ رحمۃ اللہ علیہ کے تاریخی علمی، ادبی روحانی اور مجاہدانہ حالات کا دلچسپ اور معلومات افزا مرقع اور ان کی تصنیفات اردو فارسی انشا نگاری اور فن شعر و سخن پر فنکارانہ تبصرے اور ضمنی طور پر حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ اور مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ کا تذکرہ نیز دار العلوم دیوبند کی ہمہ گیر خدمات پر مفصل مقدمہ پیش خدمت ہے۔

تحریر

مولانا محمد انوار الحسن صاحب شیرکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

پروفیسر اسلامیہ کالج لائل پور

مکتبہ دار العلوم کراچی

باہتمام : شرافت علی
طبع : صفر المظفر ۱۴۴۲ھ مطابق اکتوبر ۲۰۲۰ء

ملنے کے پتے

مکتبۂ دارالعلوم کراچی
(احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی)
فون نمبر : 021-35042280
استقبالیہ : 021-35049774-6
ای میل :
mdukhi@gmail.com

- ادارۃ المعارف، احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی
- مکتبہ معارف القرآن، احاطہ دارالعلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات، ۱۹۰ انارکلی لاہور
- ادارہ اسلامیات، اردو بازار کراچی
- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- بیت المعارف، بنوری ٹاؤن

فہرست مضامین حیاتِ امداد

عنوان	صفحہ
مدعائے ضروری الاظہار	۱۳
حرف آغاز دار العلوم دیوبند اور تعارف کتاب	۱۹
دار العلوم دیوبند علامہ رشید رضا کی نظر میں	۲۰
دار العلوم شیخ الاسلام فلپائن کی نظر میں	۲۲
شاہ افغانستان اور دار العلوم	۲۳
مولانا ابوالکلام آزاد۔ وزیر تعلیم ہند کی نظر میں	۲۴
پروفیسر گریونٹ اور دار العلوم	۲۵
امریکی وفد کی نظر میں	۲۵
ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر ہند کی رائے	۲۵
دار العلوم اکبر الہ آبادی کی نگاہ میں	۲۷
تجزیۂ خیالات	۲۷
بانی دار العلوم	۲۹
درخشندہ چہرے	۳۰
حاجی امداد اللہؒ صاحب	۳۰
مولانا محمد قاسمؒ صاحب	۳۰
مولانا رشید احمدؒ صاحب	۳۱

عنوان صفحہ

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب ۳۱
مولانا اشرف علیؒ صاحب ۳۱
مولانا سید انور شاہ صاحب ۳۲
مولانا حسین احمد صاحب ۳۲
مولانا عبید اللہ صاحب ۳۲
مولانا شبیر احمد صاحب ۳۳
دار العلوم نے کیا دیا ۳۴
علم ۳۵
تصنیفات ۳۶
ندوۃ المصنفین ۳۹
عمل ۳۹
احسان، اخلاص اور تقویٰ ۴۰
تکمیل شریعت ۴۲
سیاسیات ملکی اور آزادیٔ ہند میں علمائے دیوبند کا حصہ ۴۳
ریشمی رومال کی تحریک اور مولانا محمود حسن صاحب ۴۴
مسلم لیگ اور کانگریس ۴۴
نظریۂ پاکستان اور علمائے دیوبند ۴۶
حضرت تھانوی اور پاکستان کی پیشینگوئی ۴۸
آغاز تبلیغ بقائدِ اعظم ۴۹
پہلی تبلیغی ملاقات ۴۹
دوسری تبلیغی ملاقات ۵۰
تیسری تبلیغی ملاقات ۵۰

عنوان	صفحہ
قائداعظم کا حضرت تھانوی پر اعتماد	۵۱
خط و کتابت	۵۱
حکیم الامت کا ایک خط بنام قائداعظم	۵۲
جواب قائداعظم	۵۲
قائداعظم کی حکیم الامت سے عقیدت	۵۳
شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی اور مسلم لیگ	۵۳
شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب اور کانگریس	۵۴
مفکر اسلام مولانا عبیداللہ سندھی	۵۵
علمائے دیوبند کا اعتقادی پہلو	۵۶
حضرت مہر علی شاہ صاحب کے مفتی مولانا غلام محمد صاحب کی رائے	۵۸
دیوبند میں چار نوری وجود میاں شیر محمد صاحب شرقپوری	۵۹
علمائے دیوبند کا رنگ اعتدال	۵۹
گلابی وہابیت	۶۰
علمائے دیوبند کے عقائد	۶۱
کثرت درود عین ثواب ہے	۶۲
ختم نبوت اور مولانا محمد قاسم صاحب	۶۲
مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر میں ختم نبوت کا مخالف کافر ہے	۶۳
اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے	۶۳
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف بڑے بھائی کی طرح فضیلت دینا کفر ہے	۶۳
میلاد شریف اور علمائے دیوبند	۶۴
علم غیب اور علمائے دیوبند	۶۴
رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ایمان ہے	۶۵

عنوان صفحہ

یارسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے ۶۶
اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے امداد مانگنا ۶۶
اسلام ایک ٹھوس اور متعین مذہب ہے ۶۷
تکفیر سے تا بمقدور علمائے دیوبند کی احتیاط اور اسلامی فرقوں سے رواداری ۶۷
علمائے دیوبند کے متعلق مولانا ابوالحسنات مکتبِ بریلی کی رائے ۷۰
مولانا محمد قاسم صاحب پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں ۷۱
مولانا اشرف علیؒ صاحب مجدد تھے ۷۲
علمائے دیوبند اور ادبی خدمات ۷۲
عربی زبان کی خدمات ۷۲
فارسی زبان کی خدمات ۷۳
اردو زبان اور علمائے دیوبند ۷۳
دورِ اوّل۔ دورِ دوم ۷۴
دورِ سوم ۷۵
دورِ چہارم و پنجم ۷۸
وجہ تصنیف مشاہیر دیوبند ۸۰
آغازِ تصنیف ۸۱
حیاتِ امداد ۸۳
نذرِ عقیدت ۸۴
حمد ۸۶
نعت ۸۷
حاجی صاحبؒ کا نام، لقب اور تاریخی اسم ۸۸
پیدائش، وطن اور نسب نامہ ۸۹

بھائی بہن۔ والدہ کی وفات ۹۰

تعلیم ۹۰

مولانا محمد قاسم صاحبؒ حاجی صاحب کی زبان تھے ۹۱

حاجی صاحب کے ظاہری علمی مقامات کی مثالیں ۹۲

علم الیقین۔ عین الیقین اور حق الیقین ۹۳

دو حدیثوں کی مطابقت ۹۳

فیضان کی قسمیں۔ حالی۔ قولی۔ فعلی ۹۴

خدا کا دنیا میں دیکھنا ۹۵

مولانا نصیر الدین سے بیعت ۹۶

میانجی نور محمد جھنجھانوی سے بیعت ۹۶

حاجی صاحب کا روحانی مقام ۹۷

اتباعِ شریعت و کرامت ۹۷

شاملی ضلع مظفر نگر میں جنگ آزادی اور حاجی صاحب اور ان کے رفقاء کا جہاد ۹۹

ذکر خیر حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ ۱۰۶

حافظ صاحب کا سراپا ۱۰۸

عادات و اخلاق ۱۰۸

تعلیم و تربیت ۱۰۹

حالات بیعت ۱۰۹

حصول سلوک میں حافظ صاحب کا مقام ۱۱۰

مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ کا حافظ صاحب سے کسب روحانیت ۱۱۱

اتباع شریعت اور زہد و تقویٰ ۱۱۲

شہادت اور کشف شہادت ۱۱۳

عنوان صفحہ
شہادت سے پہلے ۱۱۴
شہادت کا دولہا ۱۱۴
مولانا رشید احمد صاحب کے زانو پر ۱۱۵
سن پیدائش اور عمر بوقت شہادت ۱۱۵
تاریخ شہادت ۱۱۶
جہاد سے پہلے ۱۱۸
جہاد کے بعد مسجد پیر محمد تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر کی حالت ۱۱۹
حافظ صاحب کی جدائی میں حکیم ضیاء الدین کی بیقراری ۱۱۹
مسجد پیر والی تھانہ بھون کا منظر حکیم محمد عمر چرتھانوی کے الفاظ میں ۱۲۱
مفتی الٰہی بخش صاحب ۱۲۳
پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف ۱۲۶
حاجی صاحب کا پہلا حج ۱۲۶
جنگ آزادی کے بعد ۱۲۷
مکہ معظمہ میں غربت کی زندگی ۱۲۸
سلطان بابو کا واقعہ ۱۲۹
حاجی صاحب کے ساتھ بھی قدرت کا خصوصی معاملہ ۱۳۰
ہجرت سے پہلے مالی حالت ۱۳۰
مکہ معظمہ میں قیام ۱۳۰
شہرتِ ولایت ۱۳۱
نکاح اول، دوسرا نکاح اور تیسرا ۱۳۱
اخلاق و عادات اور حاجی صاحب کا سراپا ۱۳۲
معاصرین، خلفا اور مریدین ۱۳۳

حاجی صاحب کا کتب خانہ ۱۳۴
حاجی صاحب کا ورثہ مکہ معظمہ میں ۱۳۵
حاجی صاحب کا ترکہ اور تبرکات ۱۳۶
وفات ۱۳۶

باب دوم

علمیات اور حاجی صاحبؒ کی تصنیفات ۱۳۹
مثنوی مولانا رومیؒ ۱۴۰
مثنوی کی تالیف کا سبب ۱۴۱
حاجی صاحب کا مثنوی پر حاشیہ ۱۴۲
حاجی صاحب کا درس مثنوی ۱۴۴
مثنوی کا کشفی درس ۱۴۵
تفصیلات حاشیہ پر مزید تحقیقی نظر ۱۴۷
حاجی صاحبؒ کا خط مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نام ۱۵۱
تحشیہ مثنوی اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ۱۵۲
مثنوی کی تکمیل اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کا کارنامہ ۱۵۴
مولانا احمد حسن کانپوری اور طباعت مثنوی ۱۶۰
مثنوی کی طباعت کے منتظمین ۱۶۳
اصل حاشیہ پر تحقیقی نظر ۱۶۵
حاجی صاحب کے بعض حواشی اور مطالب مثنوی ۱۷۶
دفتر ہفتم مثنوی از مولانا شیخ محمدؒ ۱۸۰
ذکر جمیل مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ ۱۸۱
تاریخ پیدائش اور نام ونسب، والد کا نام اور وطن ۱۸۱

عنوان

تعلیم ۱۸۲
قیام وطن تھانہ بھون اور گھر کی مالی حالت ۱۸۲
منزل فقر وسلوک ۱۸۲
سفر حج اور واپسی ۱۸۳
نکاح۔ اولاد۔ میرٹھ اور ٹونک کا قیام ۱۸۴
اخلاق وعادات ۱۸۵
خلفاء اور مریدین ۱۸۶
تصنیفات ۱۸۷
وفات ۱۸۸
مولانا شیخ محمدؒ کی مثنوی پر ایک سرسری نظر ۱۹۰
افتتاح مثنوی ۱۹۲
پھر حاجی صاحب کی تصنیفات کی طرف ۱۹۶
۲..... غذائے روح ۱۹۶
۳..... جہاد اکبر ۱۹۷
۴..... مثنوی تحفۃ العشاق ۱۹۹
۵..... دردنامۂ غمناک ۲۰۵
۶..... ارشاد مرشد ۲۰۶
۷..... ضیاء القلوب ۲۰۷
۸..... وحدۃ الوجود ۲۰۸
۹..... فیصلہ ہفت مسئلہ ۲۰۹
۱۰..... گلزارِ معرفت ۲۱۳
۱۱..... مرقوماتِ امدادیہ ۲۱۴

۱۲.....مکتوبات امدادیہ ۲۱۴
حاجی صاحبؒ کی شاعری اور اردو فارسی نثر و نظم ۲۱۵
تخلص، سلسلۂ تلمذ ۲۱۵
شاعری کے لئے داخلی یا خارجی جذبہ کی ضرورت ۲۱۶
شعر و سخن سے دلچسپی ۲۱۶
حاجی صاحب کے کلام کا ذخیرہ ۲۱۸
تفصیل کلام ۲۱۸
اردو اشعار کا کل مجموعہ ۲۲۰
فارسی کلام ۲۲۰
کل اردو اور فارسی اشعار ۲۲۱
اصناف کلام ۲۲۱
دردنامۂ غمناک پر ایک نظر ۲۲۲
جہادِ اکبر پر تبصرہ ۲۲۶
غذائے روح ایک نظر میں ۲۲۸
فارسی شعروں کا اردو اشعار میں ترجمہ ۲۳۰
مثنوی تحفۃ العشاق پر ایک نظر ۲۳۱
فراق ضامن شہید ۲۳۱
حضرت تحفہ کا سراپا ۲۳۳
رباعی ۲۳۵
مثلث و مخمس و تضمین ۲۳۶
نعت و حمد و مناجات ۲۳۷
تاریخی مادے ۲۳۷

عنوان صفحہ
غزل ۲۳۸
متقابل اور متضاد الخیالی ۲۳۹
حمدیہ غزل ۲۴۰
ایک اور اردو غزل ۲۴۰
اردو نثر ۲۴۲
خط نویسی ۲۴۲
مراقبے کا طریقہ ۲۴۴
فارسی ادب ۲۴۵
فارسی خط بنام مولانا قاسمؒ صاحب و مولانا محمد یعقوب صاحبؒ ۲۴۷
وحدت الوجود کی حقیقت ۲۵۸
وحدت الوجود کی فارسی زبان ۲۶۲
طریقۂ حصول زیارت سرکار مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ۲۶۲
طریق تلاوت قرآن کریم ۲۶۴
نماز کا دوسرا طریقہ ۲۶۹
فارسی زبان پر تنقید ۲۷۰
فارسی شاعری ۲۷۱
خاتمہ ۲۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین

مدعائے ضروری الاظہار

آئندہ اوراق میں حرف آغاز کے ماتحت دارالعلوم دیوبند اور پیش نظر کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے اور انہی صفحات سے دراصل ہماری اس کتاب کا آغاز ہو رہا ہے، اس لئے ان سطور کی حرفِ آغاز سے پہلے ضرورت نہ تھی لیکن صورت حال کچھ ایسی آپڑی ہے کہ حرفِ آغاز سے پہلے بھی ”مدعائے ضروری الاظہار“ کے عنوان کے ماتحت ہمیں کچھ عرض کرنا پڑ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم نے دراصل ”مشاہیر دیوبند“ کے نام سے پہلی جلد لکھی تھی جس میں چھ حضرات یعنی حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین کا تذکرہ لکھا تھا اور سب کو مشاہیر دیوبند جلد اوّل کے نام کے ساتھ یک جا طبع کرانا تھا۔ یعنی ہر دور کے اکابر کے حالات کی ایک ایک علیحدہ جلد لکھ کر شائع کرنے کا خیال تھا۔ اسی خیال کے پیش نظر مذکورہ بالا چھ حضرات کے حالات جو دوراوّل سے تعلق رکھتے ہیں ہم نے لکھ لئے تھے۔ کتاب کی طباعت کا ذمہ ایک صاحب نے جن کو حاجی محمد شفیع کہتے ہیں اور وہ لاہور میں غالباً صرافے کا کام کرتے ہیں لے لیا تھا

اور یہی طے شدہ بات تھی کہ وہ اس کی طباعت کے تمام اخراجات برداشت کریں گے لیکن جب کتاب کی طباعت کے متعلق ان سے کہا گیا تو پھر نہ معلوم کن حالات سے متاثر ہو کر انہوں نے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کیا، اسی لئے پیش نظر کتاب حیاتِ امداد کے حرفِ آغاز کے آخر میں حاجی محمد شفیع کا شکریہ ہم ادا کر چکے تھے اور وہ آپ کے سامنے سے گذرے گا بھی، اب ان کی بجائے ہم حضرت علامہ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کے شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت کی طرف توجہ فرمائی، لیکن مناسب یہ سمجھا گیا کہ اتنی ضخیم کتاب کو یکجا چھپوانے کی بجائے مذکورہ بالا حضرات کے حالات سے متعلق ہر ایک بزرگ کے سوانح علمی و عملی کو علیحدہ علیحدہ ایک ایک حصے میں طبع کرایا جائے، ایسا کرنے سے ایک تو قارئین کو پڑھنے میں سہولت ہوگی اور خریداوں کو بھی خریدنے میں آسانی ہوگی اور طباعت بھی دشوار نہ ہوگی، اس لئے اب اس کتاب کی نوعیت یہ ہوگی کہ ”سلسلہ مشاہیر دیوبند“ کے ماتحت ہر ایک بزرگ کے نام سے اس حصے کو موسوم کر دیا گیا ہے جن کے حالات اس میں درج ہیں۔ چونکہ سب سے اوّل میں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں اس لئے پیش نظر کتاب کا نام ”حیاتِ امداد“ رکھدیا گیا ہے۔

اب آئندہ آنے والوں کے حالات پر طبع ہونے والی کتابوں کا حصوں کے نمبر ایک، دو، تین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ جلدوں ہی کا سلسلہ ہوگا، بلکہ ہر شخصیت کے سوانح مستقل طور پر علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوتے رہیں گے۔ جن کا ایک دوسرے سے مضامین کا کوئی تعلق نہ ہوگا لہٰذا اس کتاب کے حرف آغاز میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ”مدعائے ضروری الاظہار“ کو آخری بات سمجھئے۔ حیاتِ امداد کے اوّل میں جو حرفِ آغاز کے ماتحت دارالعلوم دیوبند کا تعارف ہے تو وہ بھی دراصل مجموعۂ کتاب کا مقدمہ تھا لیکن اب وہ صرف حیاتِ امداد کا مقدمہ بن کر رہ گیا ہے مگر آپ اس کو دورِ اوّل کے تمام حضرات سے متعلق سمجھئے۔

بہر حال حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور عملی روحانی اور فقہی، ادبی نثری اور شعری حالات پر مشتمل یہ کتاب ''حیاتِ امداد'' کے نام سے پیش خدمت ہے۔ ان کے بعد ہماری پہلی ترتیب کے مطابق حضرت حاجی صاحبؒ کے بعد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح زندگی کو پیش کرنا تھا لیکن اب یہ ترتیب بھی پیش نظر نہ ہوگی، بلکہ اس کتاب کے بعد ہم ''یادگارِ قاسم'' کے نام سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند پر کتاب شائع کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

یادگارِ قاسمؒ

اپنی نوعیت کی یہ کتاب ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کی جائے گی جس کا فیصلہ قارئین ہی کرسکیں گے۔ اور جس طرح ہم نے ''حیاتِ امداد'' میں حضرت حاجی صاحبؒ کے ضمن میں حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شیخ محمد محدث رحمۃ اللہ علیہ کا مفصل ذکر کیا ہے اسی طرح یادگارِ قاسم میں حضرت مولانا محمد مظہر صاحبؒ مولانا محمد احسن صاحبؒ مولانا محمد منیر صاحبؒ، حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالغنی صاحبؒ، حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ اور حاجی عابد حسین صاحب رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے حالات بھی درج کیے ہیں۔ یادگارِ قاسم کی کتابت ہورہی ہے۔ اور ہماری کوشش ہے کہ اس کو بھی جلد طبع کرا کر ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔ خدا کرے کہ اس کے مطالعے کا وقت بھی جلد آجائے۔

تصحیح ''حیاتِ امداد''

حیاتِ امداد کے مطالعہ کرنے سے پہلے از راہِ کرم ان اغلاط کو کتاب میں صحیح فرمالیجئے جن کی فہرست ہم نے ابتدا میں دیدی ہے صرف فہرست اغلاط اور صحت نامے کے پڑھنے پر اکتفا نہ کیجئے، بلکہ کتاب کے صفحات میں جہاں جہاں غلطیاں رہ گئی ہیں ان کو قلم سے درست کرلیجئے تاکہ پڑھتے وقت بدمزگی نہ ہو۔

میں حیران ہوں کہ اس قدر اغلاط کہاں سے نکل آئیں، حالانکہ میں نے کاپیاں بڑے غور سے پڑھ کر غلطیوں کی اصلاح کے نشانات لگانے میں بڑی جانفشانی کی تھی۔ اب کاتب صاحب کی ستم ظریفی پر صبر کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ پھر کتاب ایسی جلدی میں چھپی کہ پروف پڑھنے کا بھی مجھے موقع نہیں ملا ورنہ پلیٹوں پر ہی غلطیاں ٹھیک کردی جاتی۔ بات یہ تھی کہ کتاب کراچی میں چھپ رہی تھی اور میں لائل پور میں بیٹھا تھا۔ محترم علامہ محمد یوسف صاحب کی شخصیت سخت مصروف رہی اس لئے موصوف پروف بھیجنے کا اہتمام نہ کرسکے۔ بالآخر کتاب کے ساتھ صحت نامہ لگانا پڑا۔ امید ہے کہ آپ ہماری ان گذارشات پر توجہ فرما کر پیش نظر کتاب کا مطالعہ فرمائیں گے۔ اور ہماری تاریخی، علمی، ادبی اور لسانی غلطیوں سے ہمیں آگاہ فرما کر ممنون فرمائیں گے تاکہ آئندہ کسی ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہوسکے۔

شکریہ

مصنف

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں

پیچ و خم کھاتی ہوئی راہوں کو چمکاتا رہا   مہر عالمتاب رنگ و نور برساتا رہا
قرنِ اول کے صحابہ کی ادائے خاص میں   داستانِ سید الابرار دہراتا رہا
عہدِ استبداد کی تیغِ ستم کا بانکپن   اس کی شمشیرِ نگہ کے ڈر سے تھراتا رہا
بوذر و سلماں کے اوصاف کا مظہر تھا وہ
اس صدی میں غیرتِ اسلام کا پیکر تھا وہ

(شورش کاشمیری)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

حرفِ آغاز

دارالعلوم دیوبند اور تعارفِ کتاب

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد جن رحمت بھرے ہاتھوں نے رکھی، ان کی روحانی عظمت کا خود یہ شاہکار واضح نشان ہے۔ ان کے خلوص نے بارگاہِ بے نیاز میں جو رنگ قبول پایا اسی کے نتیجے میں آج یہ اسلامی یونیورسٹی نہ صرف ہندوپاکستان میں مشہور ہے، بلکہ اس کے فیض کے چشمے تمام دنیائے اسلام میں بہ نکلے۔ یوں تو آپ کو مصر میں جامع ازہر جیسا مرکز علم دیکھنے میں آسکتا ہے جس کو اسلامی سلطنت کی سرپرستی ہمیشہ سے حاصل رہی ہے لیکن روحانیت اور علمیت کا بہترین امتزاج جو آپ کو سرزمین دیوبند کے اس دارالعلوم میں ملے گا وہ دنیا کے کسی علمی ادارے میں ڈھونڈنے سے بھی آپ نہ پاسکیں گے۔ جب ہم اس گہوارۂ علم وفن کے متعلق یہ الفاظ لکھ رہے ہیں تو ہم آپ کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم یہ لکھ کر کوئی شاعری نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو ہمارے قلم سے تراوش کر رہی ہے۔ اپنے اس بیان کی تائید میں ہم اُن ہزاروں دارالعلوم کی زیارت کرنے والوں میں سے چند عظیم المرتبہ شخصیتوں کے جذبات وخیالات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو انہوں نے اس مرکز علوم وفنون کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند علامہ رشید رضا مصری کی نظر میں

علامہ رشید رضا مصر کے مشہور فاضل جن کو مفتی محمد عبدہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے جب ندوۃ العلماء لکھنؤ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تو موصوف اسلامیہ کالج لاہور، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور دیکھتے ہوئے ندوۃ العلما لکھنؤ پہنچے۔ بعد ازاں علیگڑھ کالج اور پھر ۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء کو صبح سات بجے حکیم اجمل خاں صاحب اور مولانا سید عبدالحق صاحب بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر عربی علیگڑھ کالج کے شوق دلانے پر مولوی رشید احمد صاحب انصاری اور پروفیسر صاحب بغدادی کے ہمراہ دارالعلوم دیوبند پہنچے۔ آپ کا علمائے دیوبند نے زبردست استقبال کیا، آپ کو عربی میں ایڈریس پیش کیا گیا، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب نے دارالعلوم اور اُس کے مسلک اور فقہ حنفی پر عربی میں زبردست تقریر کی۔ بعد ازاں علامہ رشید رضا نے عربی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

لولم أرها لرجعت من الهند حزينا۔

اگر میں دارالعلوم دیوبند کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے غمگین واپس لوٹتا۔

(رسالہ القاسم دیوبند جمادی الاولیٰ ۱۳۳۰ھ مطابق مئی ۱۹۱۲ء ص ۴)

علامہ رضا بارہ گھنٹے دیوبند رہے اور شام کو سیدھے بمبئی روانہ ہو گئے۔ مصر پہنچنے کے بعد انہوں نے ماہِ شعبان ۱۳۳۰ھ کے اپنے المنار رسالے میں ہندوستان کے سفر کی جو مختصر سی روئیداد لکھی ہے اس میں مسلمانانِ ہند کی علمی حالت پر روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

على أنني رأيت في مدرسة (ديوبند) التي تلقب بازهر الهند نهضة دينية علمية جديدة أرجو أن يكون لها نفع عظيم۔

(منار شعبان ۱۳۳۰ھ)

اس کے علاوہ یہ کہ میں نے مدرسۂ دیوبند میں جس کو ازہر ہند کا خطاب دیا جاتا ہے ایک جدید علمی تحریک دیکھی جس سے نفع عظیم کی مجھے اُمید ہے۔

اسی مضمون میں آگے چل کر موصوف تحریر فرماتے ہیں:

> ماقرت عيني في الهند كما قرت برؤية مدرسة ديوبند ولاسرت بشيء هناك كسرورها بما لاح لها من الغيرة والاخلاص في علماء هذه المدرسة۔ (منار شعبان ۱۳۳۰ھ)
>
> ہندوستان بھر میں میری آنکھ کو ایسی ٹھنڈک کہیں نصیب نہیں ہوئی جیسی دارالعلوم دیوبند میں حاصل ہوئی تھی اور نہ اتنی خوشی کہیں حاصل ہوئی جتنی وہاں ہوئی۔ اور یہ صرف اس غیرت واخلاص کی وجہ سے تھی جو میں نے اس مدرسے کے علماء میں دیکھی۔

ان خیالات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک مصری علامہ ہندوستان کے تمام علمی اداروں سے زیادہ دارالعلوم دیوبند کو فوقیت دیتے نظر آتے ہیں، بلکہ صاف یہ فرمارہے ہیں کہ اگر میں دیوبند نہ دیکھتا تو مجھے ہندوستان سے افسوس کے ساتھ لوٹنا پڑتا، گویا دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان کی لاج رکھ لی، حالانکہ بعض اہل ہند دنیاداروں نے یا بالفاظ دیگر انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے دارالعلوم کے علماء کو متشدد کہا لیکن علامہ رشید اسی عبارت میں لکھتے ہیں:

> وكان كثير من إخواني المسلمين في بلاد الهند المختلفة يذكرون لي هذه المدرسة ويصف رجال الدنيا منهم علماءها بالجمود والتعصب ويظهرون رغبتهم في اصلاح تعميم نفعها وقد رأيتهم ولله الحمد فوق جميع ما سمعت عنهم من ثناء وانتقاد۔ (منار شعبان ۱۳۳۰ھ)
>
> میرے سامنے مختلف شہروں میں بہت سے مسلمان بھائیوں نے اس مدرسے کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا اور بہت سے دنیادار لوگوں نے علمائے مدرسہ کے متعلق جامد ومتعصب ہونے کا خیال ظاہر کر کے اپنی رغبت اس کی اصلاح اور تعمیم نفع

کی طرف ظاہر کی لیکن خدا شکر ہے کہ میں نے ان علماء کو مدح کرنے والوں کی مدح اور نکتہ چینوں کی نکتہ چینیوں سے بہت بلند پایا۔

علاّمہ کی مذکورہ عبارت سے واضح ہے کہ علمائے دیوبند پر دین میں سخت گیر اور جمودِ فکر کا الزام غلط ہے۔ اور انہوں نے دارالعلوم اور اس کے علماء کو اس الزام سے بلند پایا جو دنیا داروں یعنی انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے لگایا تھا۔

دارالعلوم شیخ الاسلام فلپائن سیّد محمد وجیہ کی نظر میں

شیخ الاسلام سید محمد وجیہ مرحوم ملک شام کے تاریخی شہر نابلس کے رہنے والے تھے۔ فلپائن کے حاکم اور وہاں کے مسلمان باشندوں کی درخواست پر جو وفد کی صورت میں قسطنطنیہ پہنچے تھے اور انہوں نے ملک امریکہ کے اس شہر کے دس لاکھ باشندوں کی رہنمائی کے لئے کسی عالم کی تجویز کی درخواست کی تھی، قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام نے سید محمد وجیہ صاحب کو فلپائن کا شیخ الاسلام مقرر کر دیا تھا، موصوف شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے تھے اور خلافت ترکیہ کی طرف سے ایڈریانوپل کے عہدۂ قضا پر بھی رہ چکے تھے آپ جب اپنے وطن سے رخصت ہو کر فلپائن کے لئے روانہ ہوئے تو پہلے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر ہندوستان تشریف فرما ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور شہروں اور یہاں کی درسگاہوں کا معائنہ کرتے ہوئے دہلی علیگڑھ اور وہاں سے ۱۶؍دسمبر ۱۹۱۳ء کو گیارہ بجے صبح دیوبند پہنچے، دیوبند میں داخل ہوئے تو فرمایا:

أَرَىٰ نورًا

میں یہاں نور دیکھتا ہوں۔

اور پھر طلباء، علماء اور مدرسے کو دیکھ کر فرمایا:

وَجَدْتُ ضَالَّتِي الْمَنْشُوْدَه (القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ص۲)

میں نے اپنی گم شدہ چیز کو جس کی میں تلاش میں تھا پالیا۔

بعد پہنچے تو دارالعلوم دیوبند کو دیکھ کر جو تاثر انہوں نے لیا اس کا ترجمہ اردو میں حسب ذیل ہے:

> ”میں بہت مسرور ہوں کہ آج مجھے دارالعلوم کو دیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔ یہ دارالعلوم، افغانستان میں اور خاص طور سے وہاں کے مذہبی حلقوں میں بہت معروف و مشہور ہے۔ افغانستان کے علما دارالعلوم دیوبند کے بانیوں اور یہاں کے اساتذہ کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں، اور علم و روحانیت کے یقین میں جو فضیلت اور مرتبت انہیں حاصل ہے اس کے ہمیشہ قائل و مداح رہے ہیں۔ بہت سے افغان علما اس دارالعلوم سے فیضیاب ہوئے۔ اور انہوں نے اپنے وطن عزیز واپس جا کر وہاں علم کی روشنی پھیلائی اور ملک کی خدمات انجام دیں۔ (آئینہ دارالعلوم)

مولانا ابوالکلام آزاد، وزیر تعلیم ہند کی نظر میں

مولانا ابوالکلام مرحوم اپنے عہد وزارت تعلیم میں دارالعلوم آئے تو انہوں نے فرمایا:

> ہندوستان میں اسلامی تعلیمات کے اس عظیم ترین ادارے میں نہ صرف یہ کہ اس ملک کے تمام حصوں سے بلکہ بعید ترین علاقوں مثلاً انڈونیشیا، ملایا، افغانستان اوسط ایشیا اور چین سے طلبا کھنچے چلے آتے ہیں اتنے وسیع رقبے کے طلبہ اور علما میں اس کی مقبولیت اس کی عظمت و شہرت کی دلیل ہے، اس بنا پر یہ ادارہ صحیح معنی میں تعلیمات اسلامی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی ہے۔ (آئینہ دارالعلوم)

ترکی کے نیاز بر کیز نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھ کر فرمایا:

> ”لائبریری اور اس کے بیش قیمت قلمی کتب کے ذخیرے نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا۔ میں نے یہاں اتنا خلوص پایا کہ اپنی ممنونیت کے اظہار کے لئے پوری طرح الفاظ نہیں پاتا۔“ (آئینہ دارالعلوم)

آپ نے مدرسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

> إنی رأیت فی هذه المدرسة أنوارًا فوق نور فی درر تاج الملوك وإنها بنيت علی التقوی والتعليم فيها تعليم أهل السنة والجماعة۔ الخ

> میں نے اس مدرسے میں ایسے انوار پائے ہیں جو بادشاہوں کے تاج میں موتیوں سے بھی زیادہ روشن ہیں اس مدرسے کی بنیاد تقویٰ پر ہے اور اس میں اہل سنت والجماعت کے طریقے پر تعلیم دی جاتی ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی جن دنوں دار العلوم کے صدر مہتمم یا وائس چانسلر تھے، مصر سے جامعہ ازہر کے علماء کا ایک وفد دار العلوم دیوبند آیا۔ وفد کے لیڈر اور رئیس ابراہیم جبالی نے اپنی رائے میں ظاہر کیا:

> فقد سعدنا بزیارة جامعة دارالعلوم الدیوبندیة وطفنا علی درسها فی مختلف الطبقات واجتمعنا بمدیرها فضیلة الاستاذ الشیخ شبیر احمد العثمانی وحضرات أساتذة الأکرمین فشهدنا ما ملأ قلوبنا سروراً ولمحنا للعلم فی وجوههم نوراً۔ الخ (آئینہ دار العلوم دیوبند)

> ہمیں جامع دار العلوم دیوبند کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی ہم نے مختلف درجات میں پھر کر درس و تدریس کا معائنہ کیا اور اس مدرسے کے مدیر جناب شیخ شبیر احمد عثمانی اور حضرات اساتذہ کرام سے ملاقات کی۔ ہم نے ایسا منظر دیکھا جس نے ہمارے قلوب کو مسرت سے پر کر دیا اور ان کے چہروں پر علم کا نور دیکھا۔

شاہ افغانستان اور دار العلوم

شاہِ افغانستان جناب ظاہر شاہ جب ہندوستان کے سرکاری دورے پر آزادیٔ ہند کے

پروفیسر گریونٹ اور دارالعلوم

پروفیسر گریونٹ آکسفورڈ یونیورسٹی لندن نے دارالعلوم کو دیکھ کر کہا:

> یہ میری بڑی خوش قسمتی ہے کہ مجھے دیوبند دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ قدیم اسلامی کلچر اب بھی یہاں پوری آب وتاب سے درخشاں ہے۔ ایک مؤرخ کے لئے اس سے زیادہ روشن مواقع کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ (آئینہ دیوبند)

امریکی وفد کی نظر میں

آزادیٔ ہند کے بعد امریکی وفد ہندوستان آیا جو مختار حسن، عمر حسن احمد، امیر رشید سعید احمد، امیر حسین، محمد احمد حضرات پر مشتمل تھا انہوں نے دارالعلوم کا معائنہ کر کے لکھا:

> ہماری امریکی جماعت کو ایک دن یہاں (دارالعلوم دیوبند میں) قیام کرنے کا موقع نصیب ہوا۔ ہم نے مشہور علماء اور ان کے شاگردوں سے ملاقاتیں کیں درحقیقت اسلام ہی کا جذبہ، روح کو نور بخشتا ہے اور یہ نور یہاں (دیوبند میں) ضوفشاں ہے۔ (آئینہ دیوبند)

دارالعلوم ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کی نظر میں

مذکورہ بالا اقوال تو دارالعلوم کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا غیر ممالک کے حضرات کے تھے لیکن خود ہندوستان کے غیر مسلم صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کیا کہا وہ بھی سنئے:

> آپ کے دارالعلوم نے صرف اس ملک کے بسنے والوں ہی کی خدمت نہیں کی بلکہ آپ نے اپنی خدمات سے اتنی شہرت حاصل کر لی ہے کہ غیر ملک کے طلبہ بھی آپ کے یہاں آتے ہیں اور یہاں سے تعلیم پا کر جو کچھ انہوں نے یہاں سیکھا ہے اپنے ممالک میں اس کی اشاعت فرماتے ہیں۔ یہ بات اس ملک کے سب ہی باشندوں کے لئے قابل فخر ہے...... اگر خدا کو اس دنیا کو رکھنا منظور

ہے تو دنیا کو بالآخر اسی لائن پر آنا ہے۔ میں دارالعلوم میں آ کر بہت زیادہ مسرور ہوا اور یہاں سے کچھ لے کر جا رہا ہوں۔ (آئینہ)

اب آپ ہی غور فرمایئے کہ رئیس جمہوریہ ہند دارالعلوم کے متعلق کیا کہہ گئے۔

یہ کچھ تو چند حضرات کے تاثرات نثر میں تھے لیکن نظم میں بھی دارالعلوم کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے جن میں سے صرف دو تین شاعروں کے اشعار پر ہم اختصار کے باعث بس کریں گے۔ مولانا ظفر علی مرحوم پنجاب کے مشہور لیڈر اور اخبار نویس لکھتے ہیں:

دیوبند

شاد باش و شاد زی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند
ملت بیضا کی عزت کو لگائے چار چاند
حکمت بطحا کی قیمت کو کیا تو نے دوچند
اسم تیرا بامسمّٰی، ضرب تیری بے پناہ
دیو استبداد کی گردن ہے اور تیری کمند
تیری رجعت پر ہزار اقدام سو جاں سے نثار
قرن اوّل کی خبر لائی تری اُلٹی زقند
تو علم بردار حق ہے، حق نگہباں ہے ترا
خیل باطل سے پہنچ سکتا نہیں تجھ کو گزند
ناز کر اپنے مقدر پر کہ تیری خاک کو
کرلیا اُن عالمان دین قیم نے پسند
جان کر دیں گے جو ناموس پیمبرؐ پر فدا
حق کے رستے پر کٹا دیں گے جو اپنا بند بند
کفر ناچا جن کے آگے بارہا تگنی کا ناچ
جس طرح جلتے توے پر رقص کرتا ہے سپند
اس میں قاسم ہوں کہ انور شہ کہ محمود الحسن
سب کے دِل تھے دردمند اور سب کی فطرت ارجمند

گرمی ہنگامہ تیری ہے حسین احمد سے آج
جن سے پرچم ہے روایات سلف کا سربلند

مولانا ظفر علی کے دِل کی گہرائی سے نکلے ہوئے ان اشعار میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما کی ان تمام خصوصیات یعنی ہند میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے، ملت بیضا کی عزت کو چار چاند لگانے، حکمت بطحا کی قیمت کے دوچند کرنے قرن اول یعنی صحابہ کے دور کا سا نمونہ

پیش کرنے، حق کے نگہبان ہونے اور باطل کو مٹانے، علمائے دیوبند کے سامنے کفر کے عاجز ہونے اور ان کی تبلیغی سرگرمیوں سے کفر کے پامال ہونے کا اتنی خوبصورتی اور عمدگی سے نقشہ کھینچا گیا ہے کہ اس سے زیادہ مختصر الفاظ میں ان خصوصیات کا بیان کرنا سہل نہیں۔

دارالعلوم اکبر الہ آبادی کی نگاہ میں

ہاں مولانا ظفر علی سے بھی بہتر اور مختصر صرف پانچ الفاظ میں اکبر الہ آبادی نے ندوہ اور علیگڑھ کا مقابلہ کرتے ہوئے دارالعلوم کی تعریف حسب ذیل شعر میں اس طرح کی ہے۔

ہے دِل روشن مثال دیوبند   اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

شاعر کے علیگڑھ سے متعلق اشعار یہاں ہم نے لکھنا پسند نہیں کیے کہ اس میں اک گونہ اس کی تنقیص پائی جاتی ہے۔ بہرحال اکبر الہ آبادی مرحوم نے دیوبند کو دِل روشن سے تشبیہ دے کر اپنی قلمی اور ذہنی قوتوں کو دارالعلوم کے تعارف میں معراج پر پہنچا دیا ہے۔ ''دِل روشن'' کی یہ ترکیب اضافی درحقیقت ہزاروں دفتروں کی فصیح و بلیغ نثروں سے زیادہ معنی آفریں اور سینکڑوں قصائد کے مجموعوں سے زیادہ دلنشیں ہے۔

تجزیۂ خیالات

ہم دارالعلوم دیوبند کے فضائل ومناقب میں مذکورہ بالا صرف چند مقتدر اور مستند اہل علم وفضل کے خیالات پیش کر سکے ہیں کیوں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ کتاب کا یہ مقدمہ کہیں خود کتاب نہ بن جائے، اس لئے انہی چند پُر زور اور پُر عظمت بیانات پر اکتفا کرتے ہوئے ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علامہ رشید رضا مصری، شیخ الاسلام فلپائن شیخ محمد وجیہ، جلالۃ الملک شاہ محمد ظاہر (افغانستان)، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پروفیسر ابراہیم الجبالی مصری، وفد ولایات متحدہ امریکہ، مولانا ظفر علی خاں اور اکبر الہ آبادی نہ تو دارالعلوم کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ اس کے زیر اقتدار، مگر اس کے باوجود دارالعلوم دیکھ کر اس سے اس قدر متاثر اور اس کے اس قدر معتقد نظر آتے ہیں جس سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند ایک

نا قابل تردید مقبولیت اور نا قابل تردید شہرت کی مالک ایک اسلامی یونیورسٹی ہے، جس کے مقابلے میں دنیا اس نوعیت کی درس گاہ پیش کرنے سے قاصر ہے جہاں دنیا کے گوشے گوشے سے تحصیل علوم کے لئے ہر سال طلبہ کھنچے چلے آتے ہیں اور علوم ظاہری کے ساتھ باطنی دولت اور روحانی عظمت سے بھی بہرہ ور ہو کر جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر اب ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ دار العلوم جس مقام پر رہا اور اب ہے وہ کسی کی تعریف و توصیف سے بلند ہے بقول حافظ شیرازی۔

زعشقِ ناتمام ماجمالِ یار مستغنیست
بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

بلکہ

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گرد لیلے خواہی از وے رُومتاب

جس طرح آفتاب خود اپنی چمک اور دمک سے اپنے وجود پر آپ دلیل ہے اسی طرح سرزمین دار العلوم دیوبند بھی ایک ایسا آسمان ہے جس پر سینکڑوں نہیں، بلکہ ہزاروں آفتاب و ماہتاب اور ستارے طلوع ہوئے جو آج تک نہیں، بلکہ قیامت تک اپنی چمک اور دمک سے دنیا کو روشن کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، ہاں اگر آفتاب کی روشنی سے چمگادڑ کی نظریں چکا چوند ہو جائیں تو اس میں آفتاب کا کیا نقصان اور قصور ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

دار العلوم پر ہم تفصیلی کلام زیر نظر کتاب میں حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں کر چکے ہیں وہاں آئندہ اوراق میں آپ کی نظر سے گذرے گا، لہٰذا ہم اپنے تمہیدی مقصد کی طرف آتے ہیں اور کہنا یہ چاہتے ہیں کہ:

دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ایسے رحمت بھرے ہاتھوں نے ڈالی جس کو قدرت نے رنگ قبول بخش کر بقائے دوام کا تاج اس کے سر پر رکھا اور جس طرح یہ سدا بہار پھول عہد فرنگ میں کھلا تھا اسی طرح عہد برہمن میں بھی تروتازہ اور شاداب ہے۔

بانی دارالعلوم

وہ رحمت بھرے ہاتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نور اللہ مرقدہ کے ہاتھ تھے جنہوں نے اس کی بنیاد ڈالی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی مہاجر مکی قدس اللہ سرہ اور دیگر اولیائے کرام کی دعاؤں کا نتیجہ تھا اور حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سرپرستی کا پھل تھا جو بانی مرحوم کے بعد عمل میں آئی۔ نیز مولانا رفیع الدین صاحب جیسے ولی کامل مہتمم اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جیسے متقی اولین شیخ الحدیث اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا جیسے سب سے پہلے طالب علم رحمہم اللہ علیہم کی برکتوں کا ثمرہ تھا۔

یوں تو دارالعلوم دیوبند نے ہزاروں عالم پیدا کیے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر وہ صرف ایک ہی یگانہ روزگار، امام عصر، علامہ سیّد محمد انور شاہ صاحب جیسا عظیم الشان عالم پیدا کر کے مستقبل کے لئے بند ہو جاتا تو پھر بھی لاکھوں ستاروں سے زیادہ منور شمس انور کافی تھا۔ لیکن آگے دیکھئے کہ دارالعلوم نے مفتی عزیز الرحمٰن جیسے فقیہ النفس، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب جیسے مجدد، علّامہ شبیر احمد صاحب عثمانی جیسے مفسر و متکلم، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب جیسے ادیب و مفکر، حضرت مولانا حسین احمد صاحب جیسے عالم محدث، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب جیسے ثانی شامی، مولانا عبید اللہ صاحب جیسے دیدہ ور مبصر، مولانا اعزاز علی صاحب جیسے ادیب اور حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب جیسے مقدس اور مولانا مرتضیٰ جیسے مناظر، مولانا رسول خاں صاحب جیسے منطقی اور مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی جیسے فلسفی پیدا کیے۔ کوئی بتائے کہ آسمان دارالعلوم کے علاوہ کوئی اور ایسا آسمان ہے جس پر

ان جیسے آفتاب و ماہتاب چمکے ہوں، اور سرزمین دارالعلوم سے بڑھ کر اور کوئی سرزمین ایسی ہے جہاں ایسے سدا بہار پھول کھلے ہوں۔ اس مقام پر پہنچ کر اگر ہم شورش کاشمیری کے وہ اشعار پیش کریں تو مناسب ہوگا جو انہوں نے مذکورہ بالا حضرات میں سے بعض کے متعلق اپنے میگزین چٹان مورخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۶۲ء کے صفحات ۱۴ اور ۱۵ میں نام بنام شائع کیے ہیں اور جن کا یہاں درج کرنا نہایت برمحل ہوگا۔ شورش صاحب لکھتے ہیں:

درخشندہ چہرے

حاجی امداد اللہ صاحبؒ

پیچ و خم کھاتی ہوئی راہوں کو چمکاتا رہا   مہر عالمتاب رنگ و نور برساتا رہا
قرن اوّل کے صحابہ کی ادائے خاص میں   داستان سید الابرار دھراتا رہا
عہد استبداد کی تیغ ستم کا بانکپن   اس کی شمشیر نگہ کے ڈر سے تھراتا رہا
بوذر و سلمان کے اوصاف کا مظہر تھا وہ
اس صدی میں غیرت اسلام کا پیکر تھا وہ

مولانا محمد قاسم صاحب (بانی دارالعلوم دیوبند)

شافع کون و مکاں کی راہ پر لاتا رہا   گمراہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا
پرچم اسلام ابر دُرفشاں کے روپ میں   بتکدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا
ہمرہانِ دِل گرفتہ کو باعلان جہاد   تیغ جوہر دار کا آئینہ دکھلاتا رہا
اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمین میں حُجتِ اسلام تھا

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

اس زمین پر عصر حاضر کا فقیہ بے مثال   عظمت اسلام کی تصویر دکھلاتا رہا
اُمت مرحوم کو دیتا رہا درس حدیث   سُنتِ خیر الوریٰ کے زمزمے گاتا رہا
ضربت توحید سے اشراک کی بنیاد و بیخ   جس طرف نکلا، جہاں پہنچا وہیں ڈھاتا رہا
نام اس کا حشر تک تاریخ میں پائندہ ہے
اس مقدس بزم میں تابندہ درخشندہ ہے

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

گردشِ دوراں کی سنگینی سے ٹکراتا رہا   مالٹا میں نغمۂ صبر ورضا گاتا رہا
فقر واستغنا کی تصویر کہن کا ہمہمہ   اس کی جد وجہد کا عنوان کہلاتا رہا
حادثوں کی جاں گُسل موجوں سے ہوکر بے نیاز   نقشۂ قربانی وایثار ، دکھلاتا رہا
واقعہ یہ ہے کہ شمع عشق کا پروانہ تھا
خواجۂ کون ومکان کے نام کا دیوانہ تھا

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

جسکی صحبت سے ہوئے اہل طریقت مستفید   جس کی ہیبت سے بتوں کا دبدبہ جاتا رہا
باندھ کر اپنے خدا سے رشتۂ عہد الست   دعوت ارشاد کے میدان گرماتا رہا
اس خدا آگاہ پر شورش خدا کی رحمتیں   جو دلِ پیر وجواں پر لطف فرماتا رہا
اس طرح شیرازۂ صرصر پریشاں کردیا
اس نے ہر شاخ گلستاں کو گُل افشاں کردیا

مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ

غاشیہ بردار دربار رسول اللہ کا   ماضی مرحوم کے اعجاز دکھلاتا رہا
آدمی کے روپ میں قدرت کا روشن معجزہ   علم کی ہیبت سے رزم و بزم پر چھاتا رہا
سادگی میں عہد اولیٰ کے صحابہ کی مثال   سیرت پیغمبر کونین سمجھاتا رہا
یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں
پھر بھی اس دنیا میں انورشاہ کا ثانی نہیں

مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ

شہر استبداد کے دیوار و در ڈھاتا رہا   گم شدہ اسلاف کی تصویر دکھلاتا رہا
ہیچ تھا اس کے لئے اندیشۂ دار و رسن   پائے استحقار سے دنیا کو ٹھکراتا رہا
خواجۂ کونین کے روضے کی جالی تھام کر   نور کے تڑکے دعا کو ہاتھ پھیلاتا رہا
ان کمالات و محاسن میں جواب اس کا نہیں
اس قبیلے میں کوئی بھی ہمرکاب اس کا نہیں

مولانا عبید اللہ سندھی صاحبؒ

عمر بھر اپنے تخیل کی سزا پاتا رہا   دار پر بھی نغمۂ مہر و وفا گاتا رہا
اپنے دامن کی ہوا سے لشکر احرار میں   جہد و ایثار و غا کی آگ بھڑکاتا رہا
ہر کہ و مہ سے حدیث عاشقی کہتا ہوا   آئے دن کے حادثوں پر ناز فرماتا رہا
کیا ہمیں اس نے کہا یہ بات ہی مانی نہیں
ہم نے اس کی صورت افکار پہچانی نہیں

شورش صاحب نے جیسا کہ راولپنڈی میں مولانا غلام اللہ صاحب کے سامنے میرے سوال کے جواب میں فرمایا کہ علامہ شبیر احمد عثمانی کے متعلق اشعار رہ گئے لہذا اس کا کفارہ

اگلے پرچے میں ادا کروں گا۔ انہوں نے تو نہیں کیا لیکن علامہ کے متعلق راقم الحروف کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی صاحبؒ

وہ زمانے کا غزالی نور برساتا رہا   کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتا رہا
ترجمان فقہ وتفسیر وحدیث مصطفیٰ   خود کلام اس پر ہمیشہ ناز فرماتا رہا
ثانی قاسم تھا اور ظل ولی اللہ تھا   حکمت واسرار کے عقدوں کو سلجھاتا رہا
جامع معقول اور منقول اس کی ذات تھی
دین ودانش سے منور اس کی ہر اک بات تھی

یہ ہیں آسمان دار العلوم کے ماہ پارے اور درخشندہ چہرے جن کا شورش صاحب نے حقیقت سے بالکل قریب ہو کر نقشہ کھینچا ہے۔

جن حضرات کے اسمائے گرامی ہم نے مذکورہ صفحات میں پیش کئے ہیں وہ دورِ اول، دوم اور سوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دورِ چہارم پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ان میں مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مولانا محمد طیب صاحب نبیرۂ قاسم العلوم، مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان، مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم، مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم، مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی ایم۔ اے، یہ سب حضرات دار العلوم کے فضلا اور علماء ہیں، جن کی تصنیفات ان کی فضیلت پر بہترین گواہ ہیں اور خدا جانے کس قدر عظیم المرتبہ ہستیاں ہیں جو اس وقت قوت حافظہ میں محفوظ نہیں اور نہ یہاں تمام حضرات کا استقصا مقصود ہے، بلکہ صرف سرسری تعارف مطلوب ہے۔ ان حضرات میں یوں تو ہر شخص علم کا پیکر ہے لیکن مولانا محمد طیب صاحب کی ذات گرامی سے مہتمم ہونے کی حیثیت سے دار العلوم کو ان کے دور اہتمام میں جو تعمیری اور مالی ترقی ہوئی ہے وہ اب تک کے تمام ریکارڈ توڑ چکی ہے اور بلاشبہ وہ اپنے جد محترم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

آج ملک میں ان کی ہر طرف دھوم ہے اور ان کی شخصیت مقبول بارگاہ ایزدی اور ہر دلعزیز مسلمانان ہند و پاکستان ہے۔

دار العلوم نے کیا دیا

دارالعلوم کی بنیاد ۱۸۵۷ء کے دس سال بعد اُس پُر آشوب دور میں رکھی گئی جبکہ مسلمانوں کی سلطنت اور مذہب پر تابڑ توڑ حملے ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ آٹھ سو سالہ حکومت و اقتدار کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑائی جا چکی تھیں اور ہندوستان میں ان کی عظمتوں کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ شاہجہانی قلعے پر انگریزوں کا پھریرا لہرا رہا تھا اور اس پر عیسائی مشنریاں اور آریائی دسیسہ کاریاں اسلام کے چراغوں کو بجھانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھیں۔

ایسے حالات میں ضرورت تھی کہ قدرت کا غیبی ہاتھ اسلام اور مسلمانوں کی حوادث کے بھنور میں پھنسی ہوئی کشتی کو پار لگائے، چنانچہ قدرت نے حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب کو اس مقصد کے لئے کھڑا کیا اور انہوں نے مسلمانان دیوبند کو ایک ایسے مدرسے کی بنیادیں اٹھانے کا مشورہ دیا جو ایسے علماء تیار کرے، جو اپنے علم و عمل اور مجاہدانہ روحانیت و اخلاص سے مسلمانان ہند کی رہبری کریں اور ان کے ایمان کو تھام لیں۔ ان کی عظمت وارفتہ کو واپس لائیں اور دین کی ایسی شمعیں روشن کریں جن سے مسلمانوں کے تاریک دلوں میں روشنی پیدا ہو جائے اور ان کو انکا راستہ نظر آ جائے، چنانچہ یہ مدرسہ قائم ہو گیا اور مدرسے سے ترقی کر کے آج یہ اسلامی یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا۔

دارالعلوم نے مسلمانوں کو کیا دیا اور اس کی شہرت کو چار چاند کیسے لگے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو علم، عمل، اخلاص، ادب اور سیاست سے مالا مال کیا اور ہر ہر پہلو اور ہر ہر کروٹ پر ان کے لئے رہنمائی اور رہبری کا سامان فراہم کیا۔ اب اہل انصاف خود فیصلہ فرمائیں کہ جس دارالعلوم نے ہر ہر قدم پر مسلمانوں کی رہنمائی کی اور ان کو

علم وعمل، اخلاص اور ادب وسیاست سے آراستہ کیا اس سے بڑھ کر دارالعلوم دیوبند کا اور کیا شاہکار ہوسکتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> شریعت را سہ جُزء است، علم وعمل واخلاص تا این سہ جُزء متحقق نشوند شریعت متحقق نشود، چون شریعت متحقق شد، رضائے حق سبحانہ وتعالیٰ حاصل گشت کہ فوق جمیع سعادات دُنیویہ واُخرویہ است وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰہِ أَکْبَرُ (مکتوبات مجدد مطبوعہ امرتسر حصہ اول دفتر اول ص ۹۸)۔
>
> شریعت کے تین جز ہیں، علم، عمل اور اخلاص جب تک یہ تین جزء موجود نہ ہوں شریعت کا وجود نہیں ہوتا۔ اور جب (ان تینوں کے وجود سے) شریعت وجود میں آگئی تو خدائے پاک وبلند کی رضا حاصل ہوگئی جو تمام دنیوی اور دینی نیک بختیوں سے بھی زیادہ ہے اور اللہ کی خوشنودی سب سے زیادہ ہے۔

دارالعلوم نے بقول حضرت مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ علم وعمل اور اخلاص سے مزین علماء پیدا کرکے دنیائے اسلام میں شریعت کو قائم کیا اور شریعت قائم کرکے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا سامان پیدا کیا، جو دنیا ومافیہا سے بڑھ کر ہے۔ اور اسی لئے اکبر الہ آبادی نے دیوبند کو دِل روشن کہہ کر پکارا ہے۔

علم

دارالعلوم نے علم کیونکر دیا اس کے متعلق نہایت تفصیل سے ہم ابتدائی سطور میں واضح کرچکے ہیں کہ اس گہوارۂ علم سے بہترین اہل علم وہنر پیدا ہوئے اور علم کے زیور سے آراستہ ہوکر دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچے، اور جہاں جہاں پہنچے انہوں نے اپنے علم کے چراغ سے اور سینکڑوں چراغ روشن کئے اور ہزاروں ارباب علم پیدا کئے اور یوں سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ دارالعلوم کی بہت سی شاخیں مثلاً مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ عربیہ قاسمیہ مرادآباد، امروہہ، میرٹھ، گلاؤٹھی، رُڑکی، مظفرنگر، دہلی، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، افغانستان، ڈابھیل،

کراچی، اشرف آباد سندھ، جامعہ اشرفیہ لاہور، غرض یہ کہ جہاں جہاں فضلائے دیوبند پہنچے وہاں وہاں انہوں نے مدارس دینیہ قائم کر ڈالے۔

اس طرح انہوں نے علوم وفنون کے ہر جگہ دریا بہائے پھر جامع مسجدوں میں خطابت کے ذریعہ علم وتبلیغ کے چشمے جاری کئے، پنڈالوں اور جلسوں میں اپنے وعظوں سے لوگوں میں علوم دینیہ پھیلائے، سرکاری اور دولتی یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں میں ہر جگہ آپ الحمدللہ دارالعلوم کے فاضل پائیں گے، جو اپنی اپنی جگہ علم وتبلیغ کی شمعیں روشن کئے رہے اور کئے ہوئے ہیں اور جہاں مغربی اثرات نے مسلمان طلبہ کے دلوں پر اپنے سکے جمائے ہوئے ہیں وہاں یہ حضرات دینی دفاع میں مصروف عمل ہیں۔

تصنیفات

دارالعلوم کے فضلا نے اب تک تصنیفات وتالیفات کا ایک زبردست ذخیرہ پیدا کیا ہے۔ علم شریعت، روحانیت وطریقت، زبان اور سیاست میں بہت سی کتابیں لکھیں اور اس طرح دینائے اسلام کی زبردست خدمات انجام دیں اور علوم دینیہ پھیلانے میں کوشش کی۔

۱...... حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی آب حیات، تقریر دلپذیر، حجۃ الاسلام، ہدیہ شیعہ وغیرہ۔

۲...... حضرت مولانا گنگوہی کی فتاویٰ رشیدیہ، کوکب دری، زبدۃ المناسک، سبیل الرشاد، تصفیۃ القلوب، امداد السلوک وغیرہ۔

۳...... شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا ترجمہ قرآن مجید، اردو زبان کا بڑا شاہ کار ہے اور سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کے تفسیری فوائد بہترین تفسیری فیضان ہے۔

۴...... حضرت مولانا سید محمد انور شاہؒ صاحب کی لاجواب کتاب فیض الباری شرح بخاری، العرف الشذی شرح ترمذی، اکفار الملحدین، عقیدۃ الاسلام، مشکلات القرآن، نیل الفرقدین، خاتم النبیین وغیرہا۔

۵.....حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی تصنیفات تقریباً ایک ہزار میں۔ ان میں سے صرف تفسیر بیان القرآن اور قرآن کریم کا نہایت سادہ اور بامحاورہ ترجمہ اور فوائد تفسریہ، بہشتی زیور، البوادر والنوادر، اصلاح الرسوم، نشر الطیب، الافاضات الیومیہ۔

۶.....حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی نقش حیات، مکتوبات وغیرہا (معلومات کا بہترین دفتر) ارشادات، اسیر مالٹا وغیرہ۔

علامہ شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم شرح مسلم دنیائے اسلام اور حنفیت کا بہترین عربی شاہکار، قرآن کریم کے بے نظیر پُر مغز اور ادیبانہ مقبول عوام وخواص تفسیر، العقل والنقل، اعجاز القرآن، الاسلام، الشہاب الروح فی القرآن اور شرح بخاری اردو وغیرہ مطبوعہ وغیرہا۔

۸.....فخر الاسلام مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی شہرۂ آفاق کتاب ''دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا'' اور تعلیمات اسلامیہ سہ حصص۔ القصیدۃ اللامیہ وغیرہا۔

۹.....فقیہ النفس مفتی عزیز الرحمٰنؒ صاحب کے فتاویٰ ضخیم اور مبسوط جلدوں میں۔

۱۰.....مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب کی مناظرے کی کتابیں۔

۱۱.....حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب کی تصنیفات میں مفید الوارثین، حیات شیخ الہند، فتاویٰ محمدی کامل، الجواب المتین، مولوی معنوی، حیات خضر وغیرہا۔

۱۲.....مولانا فخر الدین صاحب موجودہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی ایضاح البخاری ترجمہ وشرح بخاری بزبان اردو۔

۱۳.....مولانا اعزاز علی صاحب کے دیوان حماسہ، دیوان متنبی، نور الایضاح، کنز الدقائق کے حواشی اور نفحۃ العرب وغیرہا۔

۱۴.....مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی مشکوٰۃ کی بے نظیر شرح عربی زبان میں، سیرۃ المصطفیٰ سہ جلد، علم الکلام، عقائد اسلام وغیرہا۔

۱۵......مولانا محمد طیب صاحب کی اسلام کا اخلاقی نظام، انسانیت کا امتیاز، اجتہاد اور تقلید، حدیث رسول کا قرآنی معیار، شہید کربلا اور یزید، سوانح ابوذر غفاری، عقائد الاسلام قاسمی۔

۱۶......مولانا مناظر احسن گیلانی کی تدوین حدیث، سوانح قاسمی، مقالات احسانی، سوانح ابوذر غفاری، النبی الخاتم، اسلامی معاشیات، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔

۱۷......مفتی محمد شفیع صاحب کی فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، شہید کربلا، ختم نبوت ہر سہ حصص، الحیلۃ الناجزۃ وغیرہ۔

۱۸......مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب سیوہاروی کی قصص القرآن، اقتصادیات فی الاسلام، مکاتیب سید المرسلین۔

۱۹......مولانا محمد میاں دیوبندی کی علمائے ہند کا شاندار ماضی، علمائے حق وغیرہا۔

۲۰......مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدینہ کی ترجمان السنہ اور زاد الفقیر۔

۲۱......مولانا منظور احمد نعمانی کی معارف الحدیث اور دیگر مناظرے کی بے حد مفید کتابیں۔

۲۲...... پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی فاضل دیوبند۔ ایم۔ اے صدر شعبۂ اسلامیات علیگڑھ یونیورسٹی کی ''اسلام میں غلامی کی حقیقت'' غلامانِ اسلام، وحی الٰہی، صدیق اکبر وغیرہا۔

۲۳......مولانا حامد الانصاری غازی کی ''اسلام کا نظام حکومت''

۲۴......مولانا زین العابدین کی خلافت راشدہ، تاریخ امت وغیرہا۔

ہم نے مذکورہ بالا علماء وفضلائے دیوبند کی بعض بعض کتابوں کا محض تعارف کے طور پر سرسری حوالہ پیش کیا ہے تاکہ قاری کو قدرے اندازہ ہو جائے، ورنہ کتنے ہی اور علما وفضلا ہوں گے اور ہیں جن کا ہم اپنے اس خاکے میں ذکر کرنا بھول گئے یا اختصار کے باعث نہ کر سکے۔

ندوۃ المصنفین

اشاعت علوم وفنون میں فضلائے دیوبند کا تصنیفی ادارہ ندوۃ المصنفین دہلی جس کے موسس مفتی عتیق الرحمٰن صاحب فاضل دیوبند ہیں اپنی نوعیت کا پاک و ہند میں بے نظیر ادارہ ہے اس کے مصنفین تقریباً سب ہی دیوبند کے فاضل ہیں اور جواب تک بہت سی نہایت مہتم بالشان کتابیں شائع کر چکا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مجموعی طور فضلائے دیوبند نے ہر مضمون اور ہر فن پر کتابیں لکھ کر امت مسلمہ پر زبردست احسان کیا ہے۔

۲......عمل

ہم نے ابھی گذشتہ سطور میں آپ کے سامنے یہ اجمالی خاکہ پیش کیا ہے کہ دارالعلوم نے دنیائے اسلام کو علم دیا اور اس کی مختصر سی روئداد پیش کی ہے۔

دوسری اہم مقصود بالذات چیز جو دارالعلوم نے دنیائے اسلام کو بخشی وہ عمل ہے یعنی دارالعلوم اور اس کے سرپرست، اس کے مدرسین، اس کے فضلا دنیا کے گوشے گوشے میں علم کے ساتھ اپنا عمل لے کر پہنچے اور انہوں نے لوگوں کو اسلام کی دعوت کے ساتھ عمل کی دعوت دی اور بہت سے علماء نے رشد وہدایت کے مسند پر بیٹھ کر ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو اسلام کے احکام نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر عمل کرنے کا جذبہ بخشا اور ان کو روحانیت کے اعلیٰ مقام پر پہنچایا۔ اس سلسلے میں آپ خصوصی طور پر ہمارے اس بیان کو حقیقت کی نظروں سے پڑھئے کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اپنے مرکز تھانہ بھون اور مکہ معظمہ سے ہزاروں علماء اور خواص وعوام کو مخلص مومن بنا دیا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت مولانا رفیع الدین صاحب، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب، حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا حسین احمد صاحب، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا عبدالقادر صاحب، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب وہ مقدس حضرات ہیں جنہوں نے ظاہری علوم کے ساتھ باطنی اور

روحانی علوم کے مدارس کھول رکھے تھے اور جنہوں نے لاکھوں بندگان خدا کو عمل کی راہ پر گامزن کیا اور روحانیت کا درس دے کر صحیح معنی میں ان کو بندۂ عمل بنا دیا۔ گنگوہی، تھانوی اور رائپوری خانقاہیں ان فرشتہ نما انسانوں کی یادگاریں ہیں جن کے قدموں میں فرشتے اپنے پر بچھاتے تھے اور جن کی فہرستیں آپ آئندہ اوراق میں دیکھیں گے۔ بہر حال فضلائے دیوبند میں آپ عمل اور ان کے ذریعے عوام وخواص میں عمل کی قوت کا ایک جذبہ خاص آپ محسوس کریں گے جو دوسری جگہ مشکل سے آپ کو ملے گا۔ ان بزرگوں نے وہ کیا جو نبوت کا منشا یعنی تزکیہ نفوس اور تطہیر قلوب تھا۔

احسان، اخلاص اور تقویٰ

ایک تیسری چیز علم وعمل کے علاوہ جو دار العلوم اور اس کے اکابر نے دنیائے اسلام کو بخشی وہ اخلاص تھا، چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر اب تک دار العلوم میں ہر چھوٹے اور بڑے کا یہ جذبہ رہا ہے کہ تبلیغ دین کو انہوں نے خالص اللہ کے لئے اپنا مطمح نظر بنائے رکھا۔ ان کے ہر دینی عمل میں خلوص اور للّٰہیت رہی ہے۔ انہوں نے کبھی نمائش اور نمود کے لئے دین کی خدمات انجام نہیں دیں۔ وہ کم علم اور دنیا دار پیروں اور مولویوں کی طرح جُبّہ ودستار سے مزین ہو کر عوام کو محسور کرنے سے مجتنب اور متنفر رہے ہیں۔ انکساری اور تواضع، عاجزی اور فروتنی ان کی امتیازی شان رہی ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو کبھی مسجود خلائق نہیں بنایا، کبھی عوام سے سجدے نہیں کرائے نہ دست بوسی اور قدم بوسی کی عوام سے اُمید رکھی۔ نہ محراب ومنبر پر خفیف الحرکاتی ان کا شیوہ رہا۔ تقاریر میں اشعار بھی پڑھے تو تحت اللفظ

یہی اخلاص کا ثمرہ تھا کہ بانی دار العلوم نے وصیت میں فرمایا کہ دار العلوم کے لئے غربا اور عوام کی اعانت پر نظر رکھی جائے اور توکل کو پورے طور پر عمل میں لایا جائے چنانچہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ دار العلوم کے خزانے میں ایک پیسہ بھی نہ ہوتا لیکن فوراً ہی قدرت کوئی انتظام

کر دیتی تھی۔ اس کے مالی کام میں کبھی بھی رخنہ نہیں پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے دو حصے ہو گئے، ڈر تھا کہ اس نازک دور میں دارالعلوم کو مالی نقصان نہ پہنچ جائے لیکن بحمد اللہ اب پہلے سے زیادہ آمدنی ہے اور سالانہ بجٹ سات آٹھ لاکھ روپیہ ہے، مگر سب کام توکل پر چل رہا ہے۔ یہ اخلاص ہی کا ہی نتیجہ تھا اور ہے کہ اکابر دیوبند نے ہزاروں روپیہ ماہوار کی تنخواہوں کو ٹھکرا کر چالیس، پچاس اور ساٹھ روپیہ ماہوار پر دارالعلوم میں اپنی زندگیاں ختم کر دیں۔ طلبہ کو پرائیویٹ پڑھانے پر کوئی معاوضہ لینا سخت عیب سمجھا جاتا ہے۔

بہر حال دارالعلوم نے اپنے فرزندوں میں اللہ کے لئے کام کرنے کا جذبہ بخشا اور خلق اللہ کی خدمات انجام دیں، وہ اپنی نظروں میں مالک الملک ذوالجلال والاکرام کے سوا کسی کو جگہ نہ دیتے تھے اور جیسا کہ علامہ رشید رضا نے کہا کہ دارالعلوم کے علماء بہت زیادہ خوددار ہیں، بس اسی کا نام خلوص اور تقویٰ ہے۔ رسالہ مصطلحات صوفیائے کرام میں اخلاص کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> **آنکہ از غیر حق مبرا باشد و در سخن قطع نظر از خلق کند۔**
>
> (اخلاص) یہ ہے کہ غیر حق سے (صوفی) مبرا ہو جائے اور مخلوق سے ہر معاملے میں (اللہ کے سوا) بے پروائی برتے۔

یہی حقیقت تھی کہ دیوبند کے اکابر اور وہاں کے تعلیم یافتہ فضلا کبھی حکومت فرنگ کے سامنے نہیں جھکے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ جمعیۃ الانصار اور ریشمی رومال کی تحریک کے باعث لندن کی پارلیمنٹ میں دارالعلوم کو بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا، لیکن دارالعلوم نے اس کو چیلنج کیا اور بالآخر اس کو فتح نصیب ہوئی اور الحمد للہ کہ فرنگی کا راج کل ہند و پاک سے چلا گیا مگر دارالعلوم اپنی جگہ آج بھی اسی آب و تاب اور شان و شوکت سے قائم ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گا۔

دارالعلوم کے اکابر میں اگر خلوص کی بجائے حرص وطمع ہوتی تو وہ حکومت فرنگ کی گرانٹ قبول کر لیتے، لیکن انہوں نے سلطنت برطانیہ سے امداد کی خواہش تو کجا خود حکومت کی امداد دینے کی خواہش اور درخواست کو بھی ٹھکرا دیا اور ابھی تک برہمنی راج میں بھی وہ اپنے سرِ پُر وقار کو بلند کئے ہوئے ہیں اور بزبان حال اقبال کے اس شعر پر عمل پیرا ہیں۔

من کی دنیا میں نہ دیکھا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ وبرہمن

بلکہ اقبال کے دوسرے شعر پر دارالعلوم کی مصلحت آمیز نظر رہی۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا گر غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

لہٰذا دارالعلوم نے اپنے اخلاص کی خاطر اپنے من، تن، سر اور آنکھ کو غیروں کے سامنے کبھی نہیں جھکایا، بس اسی اخلاص اور تقویٰ پر دارالعلوم کاربند ہے اور یہی اخلاص اس نے اپنے فضلاء اور متقدمین کو بخشا ہے۔

تکمیل شریعت

گویا دارالعلوم نے علم، عمل اور اخلاص یعنی تقویٰ دے کر جو کہ مقام احسان ہے حضرت مجدد صاحب الف ثانی کے قول کے مطابق اپنے طلبہ، علماء اور معتقدین کی شریعت کو مکمل کر دیا اور جس کی شریعت مکمل ہوگئی اس سے خدا راضی ہوگیا وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ۔

دراصل عمل کے بغیر علم اور اخلاص کے بغیر عمل بے کار ہے۔ مانا کہ نماز کی فرضیت پر ایک شخص ایمان رکھتا ہے لیکن نماز پڑھے بغیر ایمان میں روشنی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ایمان کے بعد نماز پر عمل کیا تو اس کا افادی پہلو سامنے آ گیا۔ لیکن اگر نماز میں اخلاص پیدا نہ ہو تو عمل کی روح نکل کر عمل کو مردہ بنا دیتی ہے۔ غرضکہ ہر عبادت کے یہی تین پہلو ہیں اور

اسی کو حدیث جبریل میں احسان کہا گیا ہے۔ جبریل علیہ السلام نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: "وما الإحسان یا رسول اللّٰہ" یارسول اللہ احسان کا کیا مطلب ہے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (مشکوٰۃ)

تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو خدا کو دیکھ رہا ہے اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر یہ کہ خدا تجھے دیکھ رہا ہے۔

جب مؤمن کو عبادت میں یہ کیفیت حاصل ہو جائے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہو تو پھر اس کے عمل میں غایت درجے کا خلوص اور خشوع وخضوع پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ مقام حاصل نہ ہو سکے تو پھر دوسری صورت یہ ہو کہ وہ دل میں یہ یقین کرے کہ خدائے کریم اس کو دیکھ رہا ہے۔ بس جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو عمل میں یقیناً خلوص ہوگا اور اسی کا نام احسان ہے، جس کو ہم اخلاص اور تقویٰ سے تعبیر کر رہے ہیں، اور ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم کی بنیاد اخلاص اور تقویٰ پر رکھی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ مقبول ہوا اور یہی خلوص وراثت میں وہاں کے فضلا کو ملا۔

سیاسیات ملکی اور آزادی ہند میں علمائے دیوبند کا حصہ

اگرچہ علمائے دیوبند کی جماعت ہر میدان میں فعّال جماعت رہی ہے لیکن مذہب کے ساتھ سیاسیات جو مذہب کا جز ہے ان کا خصوصی میدان عمل رہا ہے۔ چنانچہ اس خصوص میں انہوں نے اپنے علمی خاندان شاہ ولی اللہی کی روایات کو برابر زندہ رکھا۔ جنگ بلقان وطرابلس میں لسانی اور مالی امداد کی، شیخ الہند اور وہاں کے تمام اساتذہ اور طلبہ ملک میں نکلے، دارالعلوم کو کچھ عرصہ کے لئے بند کیا اور درمے، قلمے اور قدمے مدد کی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد تحریک خلافت میں زبردست حصہ لیا اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک برابر ملکی اور دنیا کی سیاست میں برابر کے شریک رہے اور مسلمانوں کی رہنمائی کرتے رہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت مولانا رشید احمد

صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب نے جہاد بالسیف میں زبردست حصہ لیا تا آنکہ ان کے کئی رفقا نے جام شہادت پیا، مولانا رشید احمد صاحب نے چھ ماہ جیل کی کڑیاں جھیلیں، مولانا محمد قاسم صاحب کو خود گولی لگی لیکن جان بچ گئی۔ اور جہاد کے براتیوں میں ایک خاص مجاہد دولھا حافظ محمد ضامن حسن صاحب شہید ہوئے۔

ریشمی رومال کی تحریک اور مولانا محمود حسن

اسی دارالعلوم کے شیخ مولانا محمود حسن صاحب نے فرنگی راج کا تختہ الٹنے کے لئے ترکوں کے خلیفہ اور ایران وافغانستان کے بادشاہوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی، اور ان ممالک اسلامیہ کے سربراہوں اور قبائلی علاقے کے پٹھانوں میں جہاد کی تحریک کی اور متحد طور پر انگریزوں پر حملہ آور ہونے، ہندوستان کو آزاد کرانے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی تحریک چلائی۔ انہوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کو قبائلی علاقے میں اور پھر افغانستان بھیجا اور خود حجاز روانہ ہوئے، وہاں غالب پاشا، انور پاشا سے ملاقاتیں کیں اور تمام تحریک سے آگاہ کیا، لیکن عرب میں ترکوں کے خلاف بغاوت ہوئی۔ شریف مکہ نے غداری کی اور انگریزوں کے ساتھ مل گیا، جس کے باعث ترکوں کا اقتدار جاتا رہا اور حجاز میں انگریزوں کی طاقت دخیل ہوئی، اُدھر شیخ الہند کی تحریک کا پتہ گورنمنٹ برطانیہ کو چل گیا۔ چنانچہ آپ کو شریف مکہ کے ذریعہ گرفتار کیا گیا اور پھر پانچ چھ سال جزیرۂ مالٹا میں قید رکھا گیا۔ جب آپ کی رہائی ہوئی تو ہندوستان آکر آپ نے تحریک خلافت میں حصہ لیا اور چند ماہ کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ مولانا عبید اللہ صاحب جلاوطن قرار دیئے گئے اور پھر مدتوں کے بعد کانگریس حکومت کی سفارش پر ہندوستان آئے اور جلد ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مسلم لیگ اور کانگریس

متحدہ ہندوستان کی آزادی کے آخری نازک دور میں بھی دارالعلوم دیوبند کی دو مقتدر ہستیاں میدان سیاست میں اتری ہوئی تھیں، اور وہ دونوں اگرچہ سیاست میں ایک دوسرے

سے موافق نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک کے سر ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کا سہرا بندھا اور دوسرے کے گلے میں پاکستان کی قیادت کا ہار ڈالا گیا۔ ان میں سے ایک شیخ الاسلام ہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب شیخ الحدیث (پرنسپل) دار العلوم دیو بند تھے اور دوسرے شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی صدر مہتمم یا وائس چانسلر دار العلوم دیو بند تھے۔ دونوں ایک ہی مادر علمی کے فرزند اور ایک ہی مکتبہ فکر کے سر بلند عالم تھے۔ دونوں ایک ہی شیخ یعنی مولانا محمود حسن صاحب اسیر مالٹا کے شاگرد تھے، مگر ایک نے اپنے غور وفکر اور علمی اجتہاد سے کانگریس کا ساتھ دیا اور دوسرے نے مسلم لیگ کے ساتھ رہنا اپنے اجتہاد کا ثمرہ سمجھا۔

یہ حقیقت سمجھنا واضح ہے کہ کسی سیاسی یا علمی مسئلہ میں اختلاف اگر نیک نیتی سے ہو تو کسی کی بھی توہین کرنا خود غلط ہے۔ ہاں اپنے اپنے دلائل کی روشنی میں ہر شخص اپنے آپ کو صحیح راہ پر سمجھے یہ درست ہے۔ کئی مسائل میں صحابہ کا اختلاف، ائمہ ہدایت کا اختلاف، خود استادوں اور شاگردوں کا اختلاف اپنی اپنی جگہ درست سمجھا گیا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے دو جلیل القدر تلامذہ یعنی امام محمد اور امام ابو یوسف نے بہت سے مسائل میں اپنے استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ بس اسی طرح کا اختلاف ان دونوں حضرات میں تھا اور اس اختلاف سے ایک دوسرے کے متبعین کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے یاد کریں۔

ہمارا اصول یہ ہے کہ دونوں حضرات ہمارے اپنے تھے اور قدرت نے دونوں کو خاص خطوں کی قیادت کے لیئے چُن لیا۔ ایک کو پاکستان کے لئے اور دوسرے کو ہندوستان کے لئے۔ اگر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نظریۂ پاکستان کے حامی نہ ہوتے تو پاکستان میں علمائے دیو بند کو منہ دکھانے کو جگہ نہ ہوتی اور اسی طرح اگر مولانا حسین احمدؒ صاحب متحدہ ہندوستان کے نظریے کے مؤید نہ ہوتے تو ہندوستان کے مسلمانوں کی اس نازک دور میں حمایت نہ کرسکتے جبکہ ان کو تختۂ مشق ستم بنایا جارہا تھا۔ یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ جب بھارت میں

مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا اس وقت صرف دو ہی شخصیتیں ایسی تھیں جو گولیوں کی بوچھاڑ میں مسلمانوں کے دفاع میں سینہ سپر ہو کر بھاگی بھاگی پھرتی تھیں اور وہ تھے مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فاضل دیوبند۔ اسی طرح جو کانگریسی خیال کے مسلمان پاکستان پہنچے تو علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے ان کی ہر نوع اعانت فرمائی اور یہ خیال میں بھی نہ لائے کہ ان صاحبان کا سیاسی نظریہ کانگریس نوازی کا تھا۔

بہر حال دونوں ملکوں کی سیاسی قیادت ان فرزندان دارالعلوم کے مبارک ہاتھوں میں تھی متحدہ ہندوستان کی اور کوئی شخصیت ان حضرات سے اونچی نہ تھی جو ان سے آگے بڑھتی۔ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد ہونے اور پاکستان کے بننے تک اور اس کے بعد بھی علمائے دیوبند ہی سیاست ملکیہ پر چھائے رہے۔ علاّمہ شبیر احمد عثمانی پاکستان کی دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ پر ممبر ہونے کی حیثیت سے اپنا اثر رسوخ رکھتے تھے تا آنکہ انہوں نے پاکستان کے لئے اسلامی قانون پاس کرایا اور اُدھر ہندوستان کی پارلیمنٹ اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی بحیثیت رکن دندناتے رہے اور آخر کو یہ سب حضرات دنیا سے رخصت ہو گئے۔ خدائے کریم ان کی قبروں پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے اور ہمیں ان کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی سے بچائے۔

نظریۂ پاکستان اور علمائے دیوبند

اگرچہ کتاب کا یہ مقدمہ طوالت کی طرف جا رہا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ مدعائے ضروری الاظہار سامنے آ آ کر قلم کو بعض ضروری حقیقتوں کو واضح کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ علمائے دیوبند نے کانگریس کا ساتھ دے کر نظریۂ پاکستان کی مخالفت کی ہے اور اس کی تائید مولانا حسین احمد صاحبؒ کی کانگریس میں شرکت اور مسلم لیگ کی مخالفت کو پورے زور سے پیش کرتے ہیں، بات یہ ہے کہ دنیا میں عام طور پر کسی چیز کے منفی پہلو کو

دیکھا جاتا ہے۔ مثبت پہلو سے شاذ و نادر ہی کوئی بحث کرتا ہے۔ حالانکہ دوسرا پہلو یہ بھی تو تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب سرپرست دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد صاحب صدر مہتمم دارالعلوم اور مفتی محمد شفیع صاحب مدرس دارالعلوم یہ سب حضرات مسلم لیگ کے زبردست حامی تھے اور علامہ عثمانی نے تو نظریۂ پاکستان کی اس قدر حمایت کی کہ اگر وہ لیگ کی طرف نہ آتے تو مسلمانان ہندوستان کو شرعی حیثیت سے مطمئن کرنا دشوار ہو جاتا اور قائد اعظم اور پاکستان کے لئے سخت دشواریاں پیش آتیں، بلکہ کچھ عجب نہ تھا اگر قائد اعظم ہتھیار بھی ڈال دیتے۔ کیوں کہ دوسرے محاذ میں کانگریس، جمعیۃ العلماء، احرار، خاکسار اور جماعت اسلامی سب ہی نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے۔ یہاں یہ بات عام طور پر فراموش کردی جاتی ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث تو تھے لیکن جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر ہونے کی حیثیت سے وہ کانگریس میں شامل تھے نہ کہ دارالعلوم کی طرف سے نمائندگی فرمارہے تھے۔ بلکہ انہوں نے طلبہ دارالعلوم دیوبند کو نہ صرف کانگریس کی سیاسیات، میں بلکہ مطلقاً سیاست میں حصہ لینے سے بار بار روکا ہے۔ ہاں تو دارالعلوم کے متعدد مقتدر اصحاب قطعی طور پر نظریۂ پاکستان کے نہ صرف موید تھے بلکہ وہ دو قدم قائد اعظم سے بھی آگے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قائد اعظم کو دینی جذبات پر اُبھار کر ان کو دین کی راہ پر لایا جائے اور ان کی سیاست میں اسلامی شعور اور شریعت کا رنگ بھر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم مولانا شبیر علی صاحب یعنی حضرت تھانوی کے بھتیجے اور آپ کے خادم خاص کے وہ بیانات پیش کرنا چاہتے ہیں جو حضرت تھانوی کی قائد اعظم کو تبلیغ دین اور پاکستان کے بنیادی احساس سے متعلق ہیں۔ مولانا شبیر علی فرماتے ہیں:

> ''واقعہ مئی ۱۹۳۸ء کا ہے کہ ایک روز دوپہر کا کھانا کھا کر میں اپنے دفتر میں کام کررہا تھا جو حضرت حکیم الامت کی سہ دری کے سامنے تھا۔ حضرت حکیم الامت (مولانا اشرف علی صاحب تھانوی) دوپہر کا کھانا تناول فرما کر قیلولے (دوپہر

کے آرام) کے لئے خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنی سہ دری میں پہنچ کر مجھے آواز دی، میں فوراً حاضر ہوا اور سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت سر جھکائے ہوئے کچھ متفکر تشریف فرما تھے۔ اس زمانے تک پاکستان کا مشہور ریزولیوشن (۱) لاہور پاس نہیں ہوا تھا، مگر کانگریس اور ہندوؤں کی ذہنیت بہت کچھ بے نقاب ہو چکی تھی اور عوام و خواص کی زبان پر یہ آگیا تھا کہ ہندو کے ساتھ مسلمان کا نباہ ناممکن ہے، اس لئے علیحدہ سلطنت قائم کرنا ضروری ہے۔ غرض حضرت نے دو تین منٹ کے بعد سر اٹھایا اور جو ارشاد فرمایا اس کے الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور بحمد اللہ حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ نے فرمایا:

حضرت تھانوی اور پاکستان کی پیشینگوئی

''میاں شبیر علی! ہوا کا رُخ بتا رہا ہے کہ لیگ والے کامیاب ہو جائیں گے اور بھائی جو سلطنت ملے گی وہ ان ہی لوگوں کو ملے گی جن کو آج سب فاسق، فاجر کہتے ہیں، مولویوں کو تو ملنے سے رہی۔ لہٰذا ہم کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ یہی لوگ دیندار بن جائیں۔ اور بھائی آج کل کے حالات ایسے ہیں کہ اگر سلطنت مولویوں کو مل بھی جائے تو شاید مولوی چلا بھی نہ سکیں۔ یورپ والوں سے معاملات، ساری دنیا سے جوڑ توڑ ہمارے بس کا کام نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کرنا دنیاداروں ہی کا کام ہے، مولویوں کو یہ کرسیاں اور تخت زیب نہیں دیتے۔ اگر تمہاری کوشش سے یہ لوگ دیندار اور دیانت دار بن گئے اور پھر سلطنت انہی کے ہاتھ میں رہی تو چشم ما روشن دِلِ ما شاد کہ ہم سلطنت کے طالب ہی نہیں۔ ہم کو تو صرف یہ مقصود ہے کہ جو سلطنت قائم ہو وہ دیندار اور دیانتدار لوگوں کے ہاتھ میں ہو اور بس تاکہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو۔''

---

(۱) لاہور کا مشہور ریزولیوشن یعنی تجویز پاکستان ۱۹۴۰ء کی مسلم لیگ کانفرنس میں پاس ہوا تھا۔ انور

یہ سن کر مولوی شبیر علی صاحب نے عرض کیا کہ ''پھر تبلیغ نیچے کے طبقے یعنی عوام سے شروع ہو یا اوپر کے طبقے یعنی خواص سے۔ اس پر ارشاد فرمایا:

> ''اوپر کے طبقے سے، کیوں کہ وقت کم ہے اور الناس علی دین ملوکہم۔ اگر خواص دیندار اور دیانتدار بن گئے تو انشاء اللہ عوام کی بھی اصلاح ہو جائے گی۔ (روئیداد تبلیغ ص ۲۰۱)(بحوالہ تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص: ۶۹-۷)

آغازِ تبلیغ

حضرت حکیم الامت کی اس تبلیغی جدوجہد کا آغاز ہوا اور آپ نے مسٹر محمد علی جناح کو تبلیغ کے لئے وفد مرتب کیا جس کا امیر علامہ شبیر احمد عثمانی مرحوم کو بنایا۔ مولانا شبیر علی، مولانا عبدالکریم گم تھلوی اور ایک اور صاحب کو منتخب کیا، لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی والدہ کی سخت علالت کے باعث تشریف نہ لے جا سکے۔ حکیم الامت نے فرمایا تھا کہ:

> ''مولانا شبیر احمد ریل کے جس درجے (سیکنڈ یا فرسٹ) میں سفر کرنا چاہیں ان کے لئے اسی درجے کا ٹکٹ لیا جائے.........
>
> ''جناح صاحب سے جو باتیں کرنی ہیں وہ میں نے مولانا شبیر احمد کو خط میں لکھ دی ہیں۔ وہ امیر الوفد بھی ہیں اور گفتگو کا سلیقہ بھی ان کو بہتر آتا ہے.........
>
> (روئداد ص ۳)

وفد کی تیاری اور آمد کی اطلاع مولانا شوکت علی اور نواب محمد اسمٰعیل صاحبان کو بھی دی گئی مگر علامہ عثمانی اپنی والدہ کی سخت علالت کے باعث نہ جا سکے۔ تاہم ان کے لئے یہ شرف کافی ہے کہ اس قسم کی ہر نمائندگی میں خواہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی طرف سے ہو یا مولانا تھانوی کی طرف سے علامہ عثمانی پر سب کی نظر انتخاب پڑتی تھی۔

پہلی تبلیغی ملاقات

بہرحال وفد گیا ۲۴ ردسمبر ۱۹۳۸ء کو مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کی قیادت میں پٹنے پہنچا

جہاں لیگ کا اجلاس اسی دن ہونے والا تھا۔ وفد کی قائداعظم سے پہلی ملاقات ہوئی جس میں ان کو نماز کی تبلیغ کی گئی اور قائداعظم نے فرمایا:

> ''میں گنہگار ہوں، خطاوار ہوں، آپ کو حق ہے کہ مجھے کہیں، میرا فرض ہے کہ اس کو سنوں، میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ نماز پڑھا کروں گا۔''

دوسری تبلیغی ملاقات

قائداعظم کا خیال تھا کہ سیاست کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ انہوں نے بعض تقریروں میں کہا۔ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے پھر تبلیغی وفد بھیجا اور فرمایا:

> ''جناح صاحب کی تقریروں میں دیکھا گیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ سمجھتے ہیں اس کی بابت ان کو سمجھانا ہے۔ (روئداد تبلیغ ص ٦)

چنانچہ مولانا شبیر علی صاحب مفتی محمد شفیع صاحب اور مولانا ظفر احمد عثمانی ۱۲ر فروری ۱۹۳۹ء کو دہلی گئے، ملاقات ہوئی، اور سیاست و مذہب پر گفتگو ہوئی۔ بحث کے بعد قائد اعظم نے فرمایا:

> ''دنیا کے کسی مذہب میں سیاست مذہب سے الگ ہو یا نہ ہو۔ میری سمجھ میں اب خوب آ گیا ہے کہ اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہیں، بلکہ مذہب کے تابع ہے۔'' (روئداد تبلیغ: ص ۷)

تیسری تبلیغی ملاقات

تیسری مرتبہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب نے پھر مولانا شبیر علی صاحب کو دہلی بھیجا اس وقت اتفاق سے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بھی آ گئے تھے لیکن قائداعظم مولانا شبیر علی سے فرمانے لگے:

> ''حضرت تھانوی نے آپ کو ایک مرتبہ بھی کسی سیاسی امر میں گفتگو کے لئے نہیں بھیجا۔ مجھے آپ کے ذریعہ خاص مذہبی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو اور

> جگہ نصیب نہیں ہوتیں۔ اگر آپ کو کچھ اور کہنا ہو تو بیٹھ جائیے مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میں بڑے شوق سے سنوں گا۔" (روئداد تبلیغ ص ۸-۹)

قائداعظم کا حضرت تھانوی پر اعتماد

ان ملاقاتوں میں قائداعظم سے اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ایک روز مولانا شبیر علی صاحب نے فرمایا کہ جناح صاحب ہم انگریزی سیاست سے ناواقف ہیں اس لئے ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں ....اور جتنے ہم سیاست سے ناواقف ہیں شاید اس سے کچھ زیادہ یا اتنے ہی آپ مذہب سے ناواقف ہیں تو جس طرح ہم آپ کی تقلید کرتے ہیں، مذہبی معاملات میں آپ کو بھی ہماری تقلید کرنی چاہئے۔ اس پر قائداعظم (یہ سن کر) بہت ہنسے اور فرمایا کہ یہ صحیح ہے۔ پھر فرمایا کہ آپ ہر لیڈر کا کہا مانتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں، ایسی تقلید میں اعتماد شرط ہے، فرمایا:

> "بس اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کا بے چون وچرا کہنا مانوں تو میں تیار ہوں۔ آج تک تو میں آپ سے سمجھنے کے لئے بحث بھی کیا کرتا تھا لیکن آج کے بعد میں خاموش بیٹھ کر سنا کروں گا، اور مذہبی معاملات میں جو ہدایات آپ دیں گے ان کو تسلیم کروں گا، کیوں کہ مجھے حضرت تھانوی پر پورا پورا اعتماد ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے اور ان کی رائے درست ہوتی ہے۔ (روئداد ص ۹-۱۰)

خط وکتابت

حضرت حکیم الامت نے نہ صرف تبلیغی وفود بھیجے، بلکہ قائداعظم اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں کی مذہبی اصلاح خط وکتابت کے ذریعے بھی کرنے کی کوشش کی۔ "اعلام نافع" میں فرماتے ہیں:

> "میں خود اس (مسلم لیگ) کی اصلاح کا برابر سلسلہ جاری رکھتا ہوں۔ چنانچہ

عام رسائل بھی اور خاص ذمہ داروں کے نام خطوط بھی بھیجے جاتے ہیں ....اگر میرے ساتھ سب مسلمان خصوصاً علماء بھی مل کر ان پر زور دیتے اور ان کو نماز، روزہ، وضع اسلامی اور تمام دینی شعائر کی پابندی پر مجبور کرتے تو اب تک مسلم لیگ حقیقی معنوں میں مسلم لیگ ہو جاتی۔

(افادات اشرفیہ ومسائل سیاسیہ ص:۸۶)

حکیم الامت کا ایک خط بنام قائداعظم

حکیم الامت نے اپنے ایک ملفوظ میں فرمایا:

''جس زمانے میں کانگریس، مسلم لیگ سے مفاہمت کی گفتگو کر رہی تھی، میں نے ایک خط مسلم لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح کو اس مضمون کا لکھا تھا کہ مفاہمت میں چونکہ مسلمانوں کے امور دینیہ کی حفاظت نہایت اہم اور بہت ضروری ہے۔ اس لئے شرعیات میں آپ اپنی رائے کا بالکل دخل نہ دیں، بلکہ علمائے محققین سے پوچھ کر عمل فرمائیں۔'' (افادات اشرفیہ درمسائل ساسیہ ص:۹۶)

جوابِ قائداعظم

مولانا اشرف علی صاحب کے خط کے جواب میں قائداعظم نے لکھا:

''آپ کا والا نامہ ملا۔ بڑی مسرت ہوئی۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں، میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ آئندہ بھی آپ مجھے ہدایت فرماتے رہیں۔''

یہ خط وکتابت حضرت تھانوی کی طرف سے اردو میں ہوئی تھی لیکن اردو کا ترجمہ خواجہ عزیزالحسن مجذوب حضرت کے اخص اور غایت درجہ مقرب خلیفہ کرتے تھے اور اردو نیز انگریزی دونوں تحریریں قائم اعظم کے پاس جاتیں۔ قائداعظم انگریزی میں خط بھیجتے۔ اس خط وکتابت کا ریکارڈ مولانا شبیر علی صاحب اور اُدھر قائداعظم کے پاس موجود تھا۔

قائد اعظم کی حکیم الامت سے عقیدت

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کی ان تبلیغی سرگرمیوں سے قائد اعظم نے زبردست تاثر لیا اور ان کی عقیدت کا جو رنگ قائد کے دل پر چڑھا اس کا اندازہ بمبئی کے ان تاجروں کے بیان سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے ''بمبئی جمعیۃ العلمائے اسلام'' کی کانفرنس کے موقع پر علامہ شبیر احمد عثمانی مولانا محمد طاہر مرحوم اور مولانا ظفر احمد عثمانی کے سامنے دیا۔ انہوں نے کہا کہ قائد اعظم نے حضرت تھانویؒ کا ذکر کرتے ہوئے علمائے کانگریس کے مقابلہ میں فرمایا:

> ''مسلم لیگ کے ساتھ ایک بہت بڑا عالم ہے جس کا علم وتقدس وتقویٰ اگر ایک پلڑے میں رکھا جائے اور تمام علماء کا علم وتقدس وتقویٰ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اس کا پلڑا بھاری ہوگا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی ہیں..........
>
> (تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی ص ۹۶)

غرض یہ کہ علمائے دیوبند میں سب سے پہلے مولانا اشرف علی ہیں جو مسلم لیگ کے زبردست مؤید تھے آپ ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے بعد تحریک خلافت ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں واحد شخص ہیں جو اس اتحاد کو بے معنی سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ مسلمانوں کے لئے اس میں بھلائی ہے کہ وہ اپنے لئے علیحدہ حکومت حاصل کریں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر عالم اور ہر لیڈر ہندو مسلم اتحاد کا زبردست مؤید تھا، اس معنی میں مولانا اشرف علی صاحب پہلے شخص ہیں جو نظریۂ پاکستان کے حامی تھے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی اور مُسلم لیگ

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب کے بعد سب سے زیادہ مؤثر اور فعال شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی سابق وائس چانسلر دارالعلوم دیوبند کی تھی، جنہوں نے مسلم لیگ میں شرکت کر کے نظریۂ پاکستان کی زبردست حمایت کی اور مسلم لیگ کو ہندوستان میں آسمان تک

پہنچادیا۔ اگر ایک طرف قائداعظم مسٹر محمد علی جناح نے لیگ میں شرکت کو سیاسی طور پر مسلمانوں کے لئے ضروری قرار دیا تو علاّمہ عثمانی نے مذہب اور سیاست دونوں کی روشنی میں متحدہ ہند کے مسلمانوں کی رہبری کی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مشرق سے لے کر مغرب تک مسلمانوں میں لیگ اور پاکستان کی تائید میں ایک لہر دوڑ گئی۔ ان کے سب سے پہلے پیغام کلکتہ نے “کل ہند جمعیۃ علمائے اسلام” کی کانفرنس میں وہ صور پھونکا کہ مسلمانوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی، ان کو کل ہند جمعیۃ العلمائے اسلام کا صدر بنایا گیا۔ پھر انہوں نے مسلم لیگ کانفرنس میرٹھ میں خطبہ صدارت دیا جس میں لیگ کو کامیاب بنانے کی زبردست اپیل کی گئی جس کا نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ بعد ازاں علامہ نے بمبئی کی کانفرنس میں اور پھر لاہور جمعیۃ العلمائے اسلام کی کانفرنس میں زبردست خطبے دیئے۔ ملک کا دورہ کیا، تقریریں کیں، صوبہ سرحد میں ریفرنڈم (استصواب رائے) کے لئے دورہ کیا اور بے پناہ کامیابی حاصل کی، جس کا سہرا علاّمہ عثمانی کے سر رہا۔ بالآخر پاکستان وجود میں آگیا اور آپ کا مشن شروع ہی سے لیگ میں شرکت سے اسلامی حکومت کا قیام اور اسلامی شریعت کا نفاذ تھا۔ چنانچہ آپ نے پاکستان میں دستور ساز اسمبلی کے ایک رکن رکین کی حیثیت سے قرارداد مقاصد کے نام سے ریزولیوشن پاس کرایا۔

غرض یہ ہے کہ ملکی سیاسیات میں فضلائے دیوبند کے ہی ہاتھوں میں اقتدار کی باگ رہی۔

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور کانگریس

دوسری جانب ہندوستان کی ملکی سیاست میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے تمام عمر آزادئ ہند کی خاطر اپنی جانی اور مالی قربانیاں پیش کیں اور کانگریس میں شریک ہو کر ملکی آزادی کے لئے سیاسی جدوجہد میں سردھڑ کی بازی لگادی، جیلوں کی کڑی سختیاں جھیلیں اور فرنگی تشدد ان کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش میں نہ لا سکا۔ وہ افرنگی حکومت کو ہمیشہ

پائے استحقار سے ٹھکراتے رہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ پہلے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور پھر مسلمان ممالک کو ہندوستان کو زیرنگیں لانے کی دعوت دیں۔

ان کے کارناموں میں زبردست کارنامہ وہ ہے جو ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اس وقت انجام دیا جب بھارت میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا اور چاروں طرف ہندو اور سکھوں کے سفاک ہاتھوں نے مسلمانوں کے قتل سے ہاتھ رنگین کر کے سرزمین ہند کو لالہ زار بنا دیا تھا، اس وقت دیوبند کے فضلاء میں مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی گولیوں کی بوچھاڑ میں جان ہتھیلی پر رکھ کر مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر دہلی، سہارنپور، مرادآباد میرٹھ کے گلی کوچوں میں پھر رہے تھے۔ انہی میں دیوبند کی ایک اور تعلیم یافتہ ہستی مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی بھی تھے جنہوں نے ملکی سیاسیات میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اب بھی سب جگہ دونوں ملکوں میں دارالعلوم کے فرزند ملکی سیاسیات میں بالادستی رکھتے ہیں۔

مفکر اسلام مولانا عبیداللہ سندھی

مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کے نام نامی سے کون واقف نہیں، وہ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور شیخ الہند کے نامور شاگرد تھے۔ انہوں نے ”ریشمی رومال کی تحریک“ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل کا سفر کیا، وہاں وہ حکومت افغانستان سے اپنے استاد کی تحریک کے نشیب و فراز اور قبائلی علاقے میں حکومت برطانیہ کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے۔ جیسا کہ ہم شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں لکھ چکے ہیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کو اس تمام تحریک کا پتہ چل گیا اور مولانا عبیداللہ صاحب کو ہندوستان سے جلاوطن ہونے کا حکم ملا، چنانچہ اپنے استاد کے حکم اور ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے بقیہ عمر کا حصہ جلاوطنی میں گذارا، بالآخر کانگریس اور مسلمانان ہندوستان کی زبردست کوششوں سے پھر ہندوستان تشریف لائے اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

ہم نے علمائے دیوبند میں سے صرف چند اکابر کا ملکی سیاست کے بارے میں ذکر کیا ہے ورنہ ہزاروں فضلائے دیوبند سیاسیات ملکی میں حصہ لیتے رہے ہیں اور ان کی زبردست خدمات ملک کے لئے وقف رہی ہیں۔

علمائے دیوبند کا اعتقادی پہلو

علمائے دیوبند اپنے مذہبی عقائد کے اعتبار سے وہی مسلک رکھتے ہیں جو شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان کا مسلک تھا، اور وہ اہلسنت والجماعت کے طریقے پر تھے۔ اس مسلک کو صحابہ کی جماعت اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کے باعث اہلسنت والجماعت کہا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے بعض علمائے ہند نے ان کے بعض اقوال کو لے کر ان کے خلاف وہ زہر اُگلا کہ اس کی سمیت ابھی تک بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، حالانکہ بات کچھ بھی نہیں۔ اگر تعصب اور تنگ نظری کی عینک کو اتار کر دیکھا جائے تو ان جملوں کے صحیح معنی اور حقیقی مفہوم کو لیا جائے تو یہ بات آگے نہیں بڑھتی۔

علمائے دیوبند اپنے عقائد و اعمال میں اعتدال اور میانہ روی کا رنگ رکھتے ہیں۔ وہ توحید و رسالت، احکام قرآن و سنت پر سختی سے عامل نظر آتے ہیں۔ البتہ شرک و بدعت کا استیصال اپنا فریضۂ اولیں سمجھتے ہیں وہ امام اعظم ابوحنیفہ کے مقلد ہیں۔ اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی عظمت بلکہ کرامت کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں رشد و ہدایت اور روحانی تعلیم دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ ہے۔ وہ اگر اپنے ظاہری علوم کے اعتبار سے خاندان ولی اللہی کے شاگرد ہیں تو روحانی طور پر وہ حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانوی مہاجر مکی کے مرید ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما دونوں نے حاجی صاحب کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حاجی صاحب کے مریدین میں اہل حدیث، بریلوی مکتب خیال اور دیوبندی مسلک کے ہر قسم کے اصحاب شامل تھے لیکن انہوں نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم [illegible] کے بارے میں اپنا جانشین

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ہی منتخب کیا اور ضیاء القلوب کے آخر میں تحریر فرمایا:

> مولوی رشید احمد سلمہ و مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ را کہ جامع جمیع کمالات ظاہری و باطنی اند بجائی من فقیر راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از من شمارند…… وطریق سلوک کہ دریں رسالہ (ضیاء القلوب) نوشتہ شد در نظر شاں تحصیل نمایند۔" (صفحہ ٦٠)
>
> مولانا رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ کو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے خزانہ ہیں، مجھ راقم الحروف (حاجی امداد اللہ صاحب) کی جگہ بلکہ مجھ سے بھی زیادہ بلند خیال کریں اور سلوک کا طریقہ جو اس رسالے میں لکھا گیا ان دونوں کی زیر ہدایت حاصل کریں۔"

اس عبارت سے صاف طور پر واضح ہے کہ ان دونوں حضرات کو حضرت حاجی صاحب نے تمام ظاہری اور روحانی علوم کا سرچشمہ فرمایا ہے اور سلوک کی راہوں کو طے کرنے کے لئے ان دونوں کو اپنا قائم مقام بنایا ہے، لہٰذا حق انہیں حضرات کے ساتھ ہے ورنہ پھر حضرت حاجی صاحب کی رائے پر زبردست اعتراض لازم آتا ہے اور ان کے خیال کی تردید بلاشبہ ہو جاتی ہے۔

اپنے ایک خط مورخہ ۲۵/ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ میں حاجی صاحب مکہ معظمہ سے تحریر فرماتے ہیں:

> "فقیر نے جو کچھ ان کی ثنا میں ضیاء القلوب میں تحریر کیا ہے وہ حق ہے اور اب فقیر کا حسن ظن اور محبت بہ نسبت پہلے کے ان کے ساتھ بہت زیادہ ہے۔ فقیر اُن کو اپنے واسطے ذریعہ نجات سمجھتا ہے، میں صاف کہتا ہوں کہ جو شخص مولوی صاحب کو برا کہتا ہے وہ میرا دل دکھاتا ہے۔ میرے دو بازو ہیں ایک مولوی محمد

> قاسم صاحب مرحوم دوسرے مولوی رشید احمد صاحب ایک جو باقی ہے اس کو بھی نظر لگاتے ہیں۔ میرا اور مولوی صاحب کا ایک عقیدہ ہے۔ میں بھی بدعات کو برا سمجھتا ہوں۔ جو مولوی صاحب کا امور دینیہ میں مخالف ہے وہ میرا مخالف ہے اور خدا اور رسول کا مخالف ہے۔'' (الشہاب الثاقب)

اس تحریر کے بعد ان لوگوں کو جو حاجی صاحب سے بیعت رکھتے ہیں علمائے دیوبند کے متعلق لب کشائی کی ذرہ برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ گویا شریعت اور طریقت دونوں میں حاجی صاحب کے نزدیک علمائے دیوبند کا مسلک درست اور قابل قبول ہے۔ وہ مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا محمد قاسم صاحب کو نہ صرف اپنا صحیح جانشین ٹھہراتے ہیں، بلکہ ان کو آخرت میں ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آخری فیصلہ یہ فرماتے ہیں کہ امورِ دینیہ میں جو ان کا مخالف ہے وہ میرا مخالف اور خدا اور رسول کا مخالف ہے۔

علمائے دیوبند کے متعلق سنجیدہ اور فہمیدہ طبقے کی بھی یہی رائے ہے کہ علمائے دیوبند کا مسلک درست ہے جیسا کہ آپ علامہ رشید رضا کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محل بھی ان کے مسلک کو حق جانتے ہیں، مولانا محمد قاسم صاحب کی تحذیر الناس پر جہاں اور علمائے ہند کے دستخط وہاں اس پر ان کے بھی تائیدی دستخط موجود ہیں۔

حضرت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے مفتی مولانا غلام محمد صاحب کی رائے

گولڑہ شریف کے حضرت مہر علی صاحب اپنے زمانے میں روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں، اُن کے مفتی صاحب سے جب علمائے دیوبند کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے تحریر فرمایا:

> ''واضح ہو کہ علمائے مسئول عنہم شکر اللہ سعیہم ان کی نیات منی برخیر تھیں اعنی یہ لوگ نیک نیت تھے اور اغراض ان کے حسنہ اور افعال ان کے حسنہ تھے۔ اور چند مسائل کی وجہ سے جو ان کی نسبت زبان درازیاں ہیں ہمیں ان سے

> خداوند کریم نے محفوظ رکھا ہے اور آئندہ بھی اس کی درگاہ عالی سے ان کے لئے خیر خواہ ہیں۔“

دیوبند میں چار نوری وجود بقول میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت صوفی محمد ابراہیم صاحب قصوری جو کہ حضرت میاں شیر محمد صاحب کے خلیفہ تھے انہوں نے خزینۂ معرفت میں میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت میاں صاحب نے فرمایا:

> ”دیوبند میں چار نوری وجود ہیں ان میں سے ایک شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ہیں۔“

اب نہ تو حضرت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے مفتی اور نہ حضرت میاں شیر محمد صاحب علیہ الرحمۃ دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ ان سے روحانیت ہی میں وابستہ ہیں، لیکن ان حضرات کا تقویٰ علمائے دیوبند کے متعلق صحیح خیال پیش کرنے کا باعث ہوا ہے۔ لہٰذا ان چار حضرات کے نوری ہونے کا معاملہ ان کے عقائد کی صحت کا سرٹیفکیٹ ہے۔

الغرض دنیائے اسلام کے تمام غیر جانبدار لیڈر، علماء، مفکر، صوفیاء، سُفراء اور سنجیدہ حضرات دارالعلوم اور اس کے مکتبۂ فکر کے حامی نظر آتے ہیں۔

علمائے دیوبند کا رنگِ اعتدال

کسی خاص اہل علم کے جلسے میں ایک دفعہ علاّمہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ تقریر فرما رہے تھے۔ کسی نے اثنائے تقریر میں کہا کہ آپ کی جماعت کو بھی تو ”گلابی وہابی“ کہا جاتا ہے۔ علاّمہ نے برجستہ جواب دیتے ہوئے فرمایا:

> ”الحمد للہ کہ آپ ہماری جماعت کو گلابی وہابی کہہ کر اس کی برائی نہیں بلکہ اس کی اچھائی بیان کر رہے ہیں، کیوں کہ گلابی رنگ نہ تو شدید گہرا ہوتا ہے اور نہ بالکل پھیکا، بلکہ دونوں کے درمیان اعتدال کی شان رکھتا ہے۔ علمائے دیوبند بھی نہ

> احکام شریعت میں بعض جماعتوں کی طرح سخت ہیں کہ دین کو دشوار اور بوجھل بنادیں اور نہ بعض جماعتوں کی طرح بالکل نرم ہی ہیں کہ دین کو قبر پرستی، اوہام پرستی اور جنوں اور بھوتوں کی کہانی بنادیں۔ ہاں ان کا ایک معتدل رنگ ہے کہ وہ توحید، رسالت، ولایت کو اپنے اپنے مقام پر رکھ کر تجاوز سے پرہیز کرتے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنی گلابیت پر الحمد للہ فخر ہے۔''

یہ ہے علاّمہ عثمانی کا برجستہ حقیقت افروز جواب جس میں انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر کے رکھدیا ہے۔

گلابی وہابیت

دیوبندی حضرات کو گلابی وہابی کا خطاب ستم ظریفی اور نادانی کا بہترین شاہکار ہے، دراصل وہابی کی نسبت عبدالوہاب نجدی کی طرف ہے جو ایک سخت قسم کا موحد شخص تھا اور بدعات، شرک کا سخت دشمن۔ اس کے معتقدات کے خلاف دنیائے اسلام میں عجیب طرح کا پروپیگنڈا کیا گیا، بالخصوص حکومت برطانیہ کے زمانے میں ہر اس عالم کے خلاف جو توحید میں راسخ، بدعات وشرک اور کافرانہ رسم ورواج کا سخت دشمن اور مجاہدانہ روحانیت رکھتا ہو، اس کو انگریز اپنی سیاست کے ماتحت بعض ہندوستانی مسلمانوں سے وہابی کہلا کر زبردست پروپیگنڈا کراتا تھا۔ چنانچہ حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیلؒ صاحب شہید جیسے مجاہدین کے خلاف وہابیت کا ڈھنڈورا پیٹا گیا، پھر یہی القاب وآداب ایک خاص گروہ کی طرف سے علمائے دیوبند کو دیئے گئے۔ البتہ ان کے ساتھ گلابی کا لفظ بڑھا کر اس سختی کا ازالہ کردیا گیا جو عبدالوہاب میں تھی۔ جب صورت یہ ہو تو بقول علاّمہ شبیر احمد عثمانی گلابیت ان کے معتدل مسلک کی غمازی کرتی ہے۔ بہر حال علمائے دیوبند کو عبدالوہاب نجدی سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے، بلکہ اس کے کتنے ہی عقائد سے علمائے دیوبند کو اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو شہاب ثاقب مصنفہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ۔

علمائے دیوبند کے عقائد

علمائے دیوبند کے عقائد کے سلسلے میں ہم مختصر عقائد آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند اپنے ایک فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ۱...... ''جملہ سلاسل کے بزرگانِ دین ہمارے مقتدر پیشوا، ان کی محبت ذریعہ نجات، ان کی کرامت ثابت، ان سے بغض وعداوت، شقاوت ومحرومی کی علامت یہ ہمارا اعتقاد ہے۔ ہاں بزرگوں کو نبی نہیں سمجھتے۔ ان کو خدا یا خدائی کا مالک نہیں سمجھتے۔ ان کو دربار خداوندی میں شفیع اور وسیلہ جانتے ہیں۔ کارخانۂ عالم ان کے قبضۂ قدرت میں نہیں سمجھتے کہ وہ جو چاہیں کریں، جس کو چاہیں دیں یا نہ دیں، ہاں جس سے خداوند عالم جس کام کو چاہے لے لے۔ یہ امر ثابت ہے ہم ان کی قبروں کو سجدہ نہیں کرتے۔ خانۂ کعبہ کی طرح ان کے مزارات کا طواف نہیں کرتے۔ تعزیوں میں اولاد کے لئے عرضیاں لکھ کر نہیں لگاتے۔ خدائے ذوالجلال کی صفات مختصہ میں کوئی نبی شریک نہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے کمالات مختصہ میں کوئی مخلوق شریک نہیں۔ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کوئی ولی افضل نہیں۔ ان کے بعد تابعین کا مرتبہ ہے پھر اولیائے امت کا۔ خیار امت (امت کے نیک لوگ) خلاصہ اسلام ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ممتاز فرمایا ہے، ان کی محبت ذریعہ نجات اور عداوت، شقاوت وحرمان کی علامت۔ جس سے سوء خاتمہ کا خوف ہے۔ یہ ہمارے وہ عقائد ہیں جن پر اپنی موت وحیات چاہتے ہیں اور یہ کہ ہمارا اسی پر خاتمہ ہو۔ ہم بالکل سچے پکے حنفی (امام ابوحنیفہؒ کے مقلد) اور سلاسل حضرات اولیاء نقشبندیہ، چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ کے حلقہ بگوش ہیں۔ ہاں انہی حضرات کی برکت سے بدعات سے متنفر تام (پوری نفرت) ہے (ماخوذ از فتویٰ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مندرجہ النجم ص ۱۵)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت درود عین ثواب ہے

مولانا خلیل احمد صاحب اپنی کتاب مہند میں لکھتے ہیں:

> ”ہمارے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف کی کثرت مستحب اور نہایت موجب اجر وثواب ہے...... لیکن افضل ہمارے نزدیک وہ درود ہے جس کے لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ گو غیر منقول کا پڑھنا بھی فضیلت سے خالی نہیں۔“ (مہند ص ۱۸)

> ”ہمارا اور ہمارے مشائخ کا عقیدہ ہے کہ سیدنا ومولانا وحبیبنا وشفیعنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوق سے افضل اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرب ومنزلت میں کوئی شخص آپ کے برابر تو کیا قریب بھی نہیں ہوسکتا۔“ (مہند ص ۲۰)

ختم نبوت اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی کتاب تحذیر الناس میں ختم نبوت کی بحیثیت مرتبہ وبحیثیت زمانہ تائید کی گئی ہے لیکن ان کی عبارت کو پورے طور پر پیش نہ کرکے زہر پھیلایا گیا ہے۔ کسی مولوی صاحب نے مولانا کے زمانے ہی میں آپ سے آپ کی عبارت کا مطلب معلوم کیا تو آپ نے مناظرۂ عجیبہ کے نام سے ایک مضمون چھاپ کر شائع کیا۔ چنانچہ مناظرۂ عجیبہ میں لکھتے ہیں:

> ”مولانا حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت زمانی تو سب کے نزدیک مسلم ہے۔“ (ص ۳)

آگے چل کر مولانا محمد قاسم صاحب لکھتے ہیں:

> ”مولانا خاتمیت زمانی کی تو میں نے توجیہ اور تائید کی ہے، تغلیط نہیں کی، مگر ہاں آپ گوشۂ توجہ اور عنایت سے دیکھتے ہی نہیں تو میں کیا کروں۔ (ص ۳۷)

پھر مولانا لکھتے ہیں:

”حاصل مطلب یہ ہے کہ خاتمیت زمانی سے مجھ کو انکار نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ منکروں کے لئے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ افضلیت کا اقرار ہے بلکہ اقرار کرنے والوں کے پاؤں جما دیئے۔“ (مناظرہ عجیبہ ص ۵۰)

مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر میں ختم نبوت کا مخالف کافر ہے

اور آخر میں چل کر تو مولانا محمد قاسم صاحب نے صاف لکھدیا:

”بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں۔ جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں۔“ (مناظرہ عجیبہ ص ۱۰۳)

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اُس کا کلام جملہ عیوب سے پاک ہے (مولانا رشید احمدؒ)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اپنے فتوے میں تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ نقائص اور عیبوں سے پاک ہے۔ اس کے کلام میں ہرگز ہرگز کذب کا شائبہ نہیں ہے۔ یعنی جھوٹ کے کروڑویں کے کروڑویں حصے کا بھی احتمال نہیں نکل سکتا۔ آیۂ کریمہ ﴿وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيلًا﴾ (اللہ تعالیٰ سے زیادہ کون سچا ہو سکتا ہے) پر ہمارا ایمان ہے۔ جو شخص ایسا نہ مانے وہ قطعاً کافر اور ملعون ہے اور مخالف قرآن وحدیث اور اجماع امت کا ہے۔ وہ ہرگز مومن نہیں (بحوالہ شہاب ثاقب مولانا حسین احمد صاحب ص ۱۰۰)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف بڑے بھائی کی طرح فضیلت دینا کفر ہے

علمائے دیوبند کے مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری مہند میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارے نزدیک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم افضل البشر، تمام مخلوقات سے اشرف، جمیع پیغمبروں کے سردار، سارے نبیوں کے امام ہیں اور جو اس بات کا قائل ہو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم پر بس اتنی ہی فضیلت ہے جتنی بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی پر ہوتی ہے تو وہ ہمارے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج

ہے۔ ایسی واہیات باتوں کی ہمارے یا ہمارے بزرگوں کی طرف نسبت کرنا بہتانِ عظیم اور کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ (مہند: ص ۲۳-۲۴)

میلاد شریف اور علمائے دیوبند

مولانا خلیل احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"ذکر ولادت شریفہ صحیح روایات کے ساتھ صدق نیت اور اخلاص سے جب کہ وہ محفل میلاد خلاف شرع باتوں سے خالی ہو باعث خیر و برکت ہے ہم پر یہ افتراء ہے کہ ہم نفس مولود مبارک کو ناجائز یا بدعت کہتے ہیں۔ (از مہند: ص ۳۲)

علم غیب اور علمائے دیوبند

علم غیب کے متعلق علمائے دیوبند کا مسلک قرآنی آیات کے ماتحت نہایت واضح ہے۔ وہ غیب کا علم کلی خدا ہی کے لئے مانتے ہیں، البتہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم تمام مخلوق سے بڑھ کر تھا، تمام اولیاء اور تمام انبیاء سے آپ زیادہ علوم کے جاننے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے برابر کسی کا علم نہیں۔

دراصل اللہ کے لئے تو کوئی غیب ہے ہی نہیں۔ اس کے سامنے تو تمام کائنات حاضر ہے۔ ہماری آنکھوں سے جو چیزیں اوجھل اور غائب ہیں اور ہماری معلومات سے جو چیزیں پوشیدہ ہیں وہ سب اللہ کے سامنے ہیں۔ اولیاء اور پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ نے کشف، الہام اور وحی کے ذریعہ جو بتادیا ہے وہ ان کو معلوم ہے۔ ﴿لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ یعنی اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں غیب کوئی نہیں جانتا۔ اس پر صاف دلیل ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہلوایا: ﴿لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ﴾ یعنی اگر میں غیب جانتا ہوتا تو میں بہت سی بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھے کوئی بھی برائی نہ پہنچتی۔ اور ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ اور اللہ کے پاس ہی غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی

نہیں جانتا۔ مذکورہ بالا آیات کے ضمن میں علاّمہ شبیر احمد عثمانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں...... ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر باختیار خود مطلع کر دیتا ہے...... شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہئے اور تکوینیات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر دینا مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا شمار کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔
>
> (پارہ نمبر ۹، سورۂ اعراف، رکوع نمبر ۱۳)

علاّمہ عثمانی نے قرآن کریم کی مذکورہ آیات میں غیب کے متعلق جو لکھا ہے وہی متقدمین علماء اور اہل عقائد کا مسلک ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے بڑھ کر ان کے زمانے میں علوم شرعیہ کا جاننے والا کوئی نہ تھا، لیکن دُنیا کے جزئی علوم کا علم جن کو تکوینیات کا علم کہا جاتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ خضر علیہ السلام کو زیادہ تھا، چنانچہ کشتی کے توڑنے، ایک بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو سیدھا کرنے کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام لاعلمی کی وجہ سے سخت حیران ہو کر رہ گئے ہیں۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عظمت ایمان ہے

کسی مسلمان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا آپ سے محبت نہیں کرتا عقل و علم کا دیوالیہ پن ہے۔ علاّمہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ ﴾ کی تفسیر لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ”حضور کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہو جاتے ہیں۔ اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے۔ (سورۂ حجرات)

یارسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے

علمائے دیوبند کے نزدیک یارسول اللہ اور یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہنا جائز ہے لیکن یہ اعتقاد نہیں رکھنا چاہئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر پکارنے والے کی ندا کو خود سنتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرح ہر ایک بات کو سُنتے ہیں۔ اگر کوئی عاشق رسول غلبۂ عشق ومحبت میں فنا فی الرسول ہوکر اتنا غرق تصوّر رہے کہ گویا حضور کے وہ سامنے حاضر ہے تو یارسول اللہ کہنا اس کو پھبتا ہے۔ دراصل یہ ایک لفظی نزاع ہے ورنہ اہل حال اور خصوصی عشاق کے لئے یہ مقام حاصل ہے۔ ہر بوالہوس کا یہ مقام نہیں۔ مذکورہ بالا شرط کے ساتھ کہ حضور پکارنے والے کی پکار کو خدا کی طرح نہیں سنتے الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کہنے میں بھی مضائقہ نہیں۔

(شہاب: ص۵۰-۷۹)

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے امداد مانگنا

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امداد طلب کرنے کا یہ مطلب ہے کہ بزرگوں کو حاجت روا سمجھ کر ان سے درخواست کی جائے کہ آپ ہمیں اولاد، روزی، شفا عطا فرمائیں وہ امور جو مستقل طور پر خدائے تعالیٰ کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں مثلاً مینہ برسانا، رزق دینا اور غلہ اُگانا، اولاد دینا ان میں سے کسی مخلوق سے اس نیت کے ساتھ دُعا کرنا یا مدد مانگنا کہ آپ ہمیں یہ چیزیں عنایت فرمائیں کفر اور شرک ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے فتوے میں اسی طرح لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ (۵۴)۔ یہ بات عقل سلیم کے نزدیک مسلّم ہے کہ نفع ونقصان، صحت وبیماری، رزق اور فراخی، موت وحیات سب اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں کسی انسان کے نہیں، البتہ اولیاء اور انبیاء کی دُعائیں اور ان کی برکتیں اللہ تعالیٰ سے دُعاؤں کے ذریعہ مرادوں کے حصول میں اثر رکھتی ہیں اور بزرگانِ دین کی ارواح طیبہ اور ان کے باطنی فیوض اور برکات سے فائدہ پہنچتا ہے، مگر اس طریقے سے جو اس کے اہل اور خواص کو معلوم ہے نہ کہ اس طریقے سے جیسا کہ عوام کے عقائد میں ہے۔ دُنیا اور دین کے وہ

معاملات جو عام طور پر ایک دوسرے کے تعاون اور مدد سے چلتے ہیں ان میں ایک دوسرے کی مدد طلب کرنے اور تعاون حاصل کرنے کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ ہماری بحث سے خارج ہیں۔

الحاصل

ہم علمائے دیوبند کے عقائد کے بیان کرنے میں کہاں سے کہاں نکل گئے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ ان کے مذہبی عقائد کا ایک مختصر خاکہ اہل انصاف کے سامنے پیش کردیں اور بتادیں کہ وہ اپنے عقائد میں متقدمین ائمہ اہل عقائد یعنی امام ابوالحسن اشعری کے مقلد ہیں۔ وہ مُردوں کو ہی نہیں بلکہ زندوں کو ثواب پہنچانے کے لئے بھی قائل ہیں۔ غربا اور مساکین کو کپڑا پہنا کر، کھانا کھلا کر، اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے جن مُردوں کی رُوح کو ثواب پہنچایا جائے وہ اس کے مؤید ہیں، لیکن ثواب کے لئے کسی دِن یا وقت کی قید سے وہ اپنے آپ کو آزاد رکھتے ہیں کہ اس میں توسع ہے۔

اسلام ایک ٹھوس اور متین مذہب ہے

ان عقائد پر قارئین کرام غور کریں اور دِل میں انصاف سے فیصلہ فرمائیں کہ علمائے دیوبند کا مسلک اور ان کے عقائد کس قدر صاف اور واضح ہیں۔ وہ اسلام کو ٹھوس، متین اور سادہ مذہب سمجھتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں، وہ نہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جنہوں نے مذہب کو بے لچک سمجھا ہے اور نہ ان لوگوں کے حامی ہیں جنہوں نے مذہب کو اوہام پرستی، لہو ولعب اور کھیل تماشہ بنادیا ہے۔

تکفیر سے تابمقدور احتیاط

اور اسلامی فرقوں سے رواداری

علمائے دیوبند نے حتی الامکان کسی اسلامی فرقے اور کسی مسلمان پر کفر کا فتویٰ لگانے اور کافر کہنے سے اجتناب اور پوری احتیاط کی ہے۔ ان کا مقصد دائرۂ اسلام کو تنگ کرنے کی

بجائے اس کو وسعت دیتا رہا ہے، صرف ایک فرقہ قادیانی ہی ایسا فرقہ ہے جو اصولی طور پر اختلاف کے باعث ان کی نظروں میں اسلام سے خارج ٹھہرا، ورنہ وہ کسی جماعت سے ایسا سلوک روا نہیں رکھتے۔ وہ اہل حدیث اور بریلوی عقائد والوں کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔ مفتی محمد حسن صاحب امرتسری خلیفہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کا بیان ہے کہ حضرت تھانوی نے فرمایا:

> ''اگر مجھے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ملتا تو میں پڑھ لیتا۔'' (بروایت مولوی بہاؤالحق قاسمی)

خواجہ عزیز الحسن مجذوب ''اشرف السوانح'' میں حضرت تھانوی کی وسعت قلبی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا:

> ''میں علماء کے وجود کو دین کی بقا کے لئے اس درجہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر سارے علماء ایسے مسلک کے بھی ہو جائیں جو مجھ کو کافر کہتے ہیں (یعنی بریلوی صاحبان) تو میں پھر بھی ان کی بقا کے لئے دُعائیں مانگتا رہوں، کیونکہ وہ بعض مسائل میں غلو کریں اور مجھ کو بُرا کہیں لیکن وہ تعلیم تو قرآن وحدیث کی کرتے ہیں۔ (اشرف السوانح: ص۱۸۹)

مولانا محمد قاسم صاحب نے اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر فرمایا:

> ''فی زمانہ کفار کا غلبہ ہے، وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں میں تفریق کو ہوا دی جائے جس سے انکا کلمہ متفرق ہو کر مزید ضعف پیدا ہو، بلکہ توڑنے کی بجائے جوڑنے کی فکر کی جائے۔'' (سوانح قاسمی، جلد اوّل: ص۴۸۰)

ایک اور جگہ کسی شخص کے علمِ غیب کے مسئلے پر پوچھنے کے بارے میں مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا:

> درمسلمانان کیست که قرآن، دین وایمان او نباشد بناءً علیه
> تامقدور کسی را کافر نباید دانست (فیوض قاسمیہ: ص۴۸)

مسلمانوں میں کون ایسا ہے کہ قرآن کریم پر اس کا دین وایمان نہ ہو۔ اس لئے جہاں تک گنجائش ہو کسی کو کافر نہ جاننا چاہئے۔

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فتاویٰ رشیدیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اور یہ بندہ تو شیعوں کو بھی مسلمان سمجھتا ہے۔ اور کما قال''

جس زمانے میں بہاولپور میں ایک قادیانی مرد اور مسلمان عورت سے نکاح کے سلسلے میں طلاق کا معاملہ عدالت میں پیش تھا اور حضرت مولانا سید محمد انور شاہ دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کی طرف سے وکالت فرما رہے تھے تو قادیانی وکیل نے کہا کہ دیوبندی بریلویوں کو اور بریلوی دیوبندیوں کو کافر کہتے ہیں لہٰذا قادیانیوں کے خلاف کفر کا فتویٰ بھی قابل رد ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا:

> ''میں بطور وکیل تمام جماعت دیوبند کی طرف سے گذارش کرتا ہوں کہ حضرات دیوبند بریلوی حضرات کی تکفیر نہیں کرتے۔ اہلسنت و جماعت اور مرزائی مذہب میں قانون کا اختلاف ہے اور علمائے دیوبند اور بریلوی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا نہیں۔ چنانچہ فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بنا پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔''

(حیاتِ انور: ص ۳۳۲، مقالہ مولانا محمد لائل پوری)

علامہ شبیر احمد عثمانی ''الشہاب'' میں محمد علی صاحب لاہوری قادیانی پارٹی کے لیڈر کو خطاب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ یقین کیجئے کہ ہم کو مرزا صاحب یا کسی ایک کلمہ گو کے کافر اور مرتد ثابت کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہے۔ ہماری حالت تو یہ ہے کہ نہ ہم غیر مقلدین کو کافر کہتے ہیں نہ تمام شیعوں کو، نہ سارے نیچریوں کو حتیٰ کہ ان بریلویوں کو بھی کافر نہیں کہتے جو ہم کو کافر بتلاتے ہیں۔ اور ہماری تمنا تھی کہ کوئی صورت ایسی نکل آتی کہ مرزائیوں کی تکفیر سے بھی ہم کو زبان آلودہ نہ کرنی پڑتی۔ لیکن ان

کہ اسلام کو باہمی افتراق سے بچانے کی بے حد سعی کی ضرورت ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ اختلافی مسائل کو قطعاً چھیڑا ہی نہ جائے اور باہمی کشمکش پر وقت صرف کرنے کی بجائے تبلیغ اسلام پر قوتوں کو صرف کیا جائے۔ اور علمی اختلافی مسائل کو عوام میں نہ لاتے ہوئے آپس میں افہام وتفہیم سے طے کرلیا جائے اور اگر وہ اختلافی ہی رہیں تو تعلقات میں رواداری اور بیانات میں اسلام شعاری کو اپنائیں۔ یہی شعار علمائے دیوبند کا رہا ہے اور رہنا چاہئے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہے اور یہی طریقہ مثلاً حسبِ ذیل حضرات کے عمل اور زبان سے رہا ہے۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق جب جناب پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے کسی شخص نے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

مولانا محمد قاسم صاحبؒ پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں

> تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل۔ نے عرض کیا جی ہاں ان ہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحب نے فرمایا: ''وہ حضرت حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔'' (بروایت مولانا محمد سعید خطیب مسجد کوہ مری)

اسی طرح کے الفاظ مہر علی شاہ صاحب نے بروایت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی مُرید خاص پیر سید مہر علی شاہ صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق فرمائے جو حسب ذیل ہیں۔

''مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سُنا ہے اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانیین اور اولیاء امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے مگر میرا

کہ اسلام کو باہمی افتراق سے بچانے کی بے حد سعی کی ضرورت ہے اور اس کی یہی شکل ہے کہ اختلافی مسائل کو قطعاً چھیڑا ہی نہ جائے اور باہمی کشمکش پر وقت صرف کرنے کی بجائے تبلیغ اسلام پر قوتوں کو صرف کیا جائے۔ اور علمی اختلافی مسائل کو عوام میں نہ لاتے ہوئے آپس میں افہام وتفہیم سے طے کر لیا جائے اور اگر وہ اختلافی ہی رہیں تو تعلقات میں رواداری اور بیانات میں اسلام شعاری کو اپنائیں۔ یہی شعار علمائے دیوبند کا رہا ہے اور رہنا چاہئے۔ چنانچہ مذکورہ بالا بیانات سے واضح ہے اور یہی طریقہ مثلاً حسبِ ذیل حضرات کے عمل اور زبان سے رہا ہے۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق جب جناب پیر سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی سے کسی شخص نے پوچھا تو آپ نے فرمایا:

مولانا محمد قاسم صاحبؒ پیر سید مہر علی شاہ کی نظر میں

> تم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ کے متعلق پوچھتے ہو؟ سائل نے عرض کیا جی ہاں ان ہی کے متعلق۔ حضرت پیر صاحب نے فرمایا: ”وہ حضرت حق کی صفت علم کے مظہر اتم تھے۔“ (بروایت مولانا محمد سعید خطیب مسجد کوہ مری)

اسی طرح کے الفاظ مہر علی شاہ صاحب نے بروایت مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی مُرید خاص پیر سید مہر علی شاہ صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا اشرف علی صاحب کے متعلق فرمائے جو حسب ذیل ہیں۔

”مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کا زمانہ میں نے نہیں پایا، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی کی زیارت ایک دفعہ کی ہے مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ایک دفعہ زیارت کی ہے اور ایک دفعہ وعظ بھی سُنا ہے اس سے زیادہ ان حضرات کے ساتھ مصاحبت کا اتفاق نہیں ہوا مگر میرا اعتقاد ان بزرگوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ سب حضرات علمائے ربانیین اور اولیاء امت محمدیہ میں سے تھے۔ احقر کو بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی ہے مگر میرا

اعتقاد یہی ہے اور اس اعتقاد کے اختیار کرنے کا سبب ان کی تصنیفات کا مطالعہ اور استفادہ اور قبول عام ہے۔

مولانا اشرف علی مجدد تھے

بالخصوص مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم کی خدمات طریقت پر نظر کر کے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں۔

(چراغِ سنت: ص: ۲۷۰، مصنفہ مولانا سید فردوس علی شاہ صاحب)

علمائے دیوبند اور ادبی خدمات

ہم نے اپنے اس مقدمے میں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما کے کارناموں، ان کی تصنیفات، تبلیغ شریعت اسلام اور دینی خدمات، علم و عمل، سیاسیات و عقائد کے متعلق جس تفصیل سے بیان کیا ہے ان کو پڑھ کر کوئی بھی انصاف پسند اہل علم دارالعلوم اور اس کے فضلا کی تحسین و تعریف اور حق پسندی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ واقعی دارالعلوم دیوبند تنہا وہ ادارہ ہے جس کے سر دُنیائے اسلام کی دینی خدمات کا سہرا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے عربی، فارسی اور اردو زبان کی اپنی تصنیفات کے ذریعے ہندوستان کے علما میں سب سے زیادہ خدمات انجام دی ہیں اور مختلف علوم و فنون پر عربی، فارسی اور اردو میں کتابیں لکھیں۔

عربی زبان کی خدمات

دارالعلوم نے علم حدیث وغیرہ کی عربی زبان کے ذریعہ جو بیش بہا خدمات انجام دیں، ان میں مولانا سید انور شاہ صاحب کی فیض الباری شرح بخاری، العرف الشذی شرح ترمذی، حاشیہ ابن ماجہ، اکفار الملحدین، مرقات الطارم، نیل الفرقدین، بسط الیدین اور عربی قصائد۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے عربی میں حواشی اور بعض عربی خطوط۔ مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی البذل المجہود شرح ابی داؤد عربی

میں۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے عربی قصائد اور معجزات لامیہ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم شرح مسلم تین جلدوں میں۔ مولانا اعزاز علی صاحب شیخ الادب دارالعلوم کے دیوانِ متنبی، دیوانِ حماسہ، کنز الدقائق، شرح نقایہ، اور نور الایضاح کے عربی حواشی اور عربی لٹریچر میں نفحۃ العرب۔ مولانا محمد ابراہیم صاحب شیخ الفلسفہ بلیاوی کا حاشیہ مسلم مولانا محمد عماد الدین انصاری کا حاشیہ مرقات عربی میں۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کی شرح مشکوٰۃ پانچ جلدوں میں۔ حاشیہ مقاماتِ حریری اور بعض عربی قصائد۔ مفتی محمد شفیع صاحب کی خاتم النبیین۔ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری کی شرح ترمذی زیر طبع، نفحۃ العنبر سوانح علامہ سید محمد انور شاہ اور عربی قصائد۔ مولانا عبدالرشید کی شرح ابن ماجہ۔

فارسی زبان

جس دور میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی وہ اگرچہ فارسی کے زوال کا دور تھا تاہم فارسی زبان اچھی خاصی مروّج تھی لیکن زیادہ تر اب اردو زبان میں کتابیں لکھی جارہی تھیں۔ تاہم آغاز دارالعلوم سے اب تک وہاں فارسی کی اعلیٰ کتابوں کی تعلیم بھی ہوتی ہے، البتہ تصنیفات کا ذخیرہ فارسی میں زیادہ نہیں ہے، اگر ہے تو مختصر مثلاً حاجی امداد اللہ صاحب کی کتابوں میں ضیاء القلوب اور بعض دیگر رسالے نیز فارسی کلام حاشیہ مثنوی مولانا جلال الدین رومی اور ان کے فارسی مکتوبات، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی امداد السلوک، مولانا محمد قاسم صاحب کے بعض رسائل، فارسی خطوط اور قدرے فارسی کلام، مولانا اشرف علی صاحب کی فارسی میں مثنوی زیر و بم، مولانا اعزاز علی صاحب کا فارسی میں نور الایضاح کا حاشیہ، حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی معرکہ آراء کتاب خاتم النبیین اور ان کے بعض فارسی نعتیہ اور غیر نعتیہ قصائد۔

اردو زبان اور علمائے دیوبند

اگر اردو زبان کی خدمات پر غور کیا جائے تو علمائے دیوبند نے اس سلسلے میں بھی بیش بہا

خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ علمائے دیوبند میں بہترین نثر نگار، بہترین شعرا بہترین ایڈیٹر اور نامور ادیب گذرے ہیں اور ہر دور میں اہل قلم مصنفین نے تصنیفات، مقالات مضامین سے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔

دورِ اوّل

اگر ہم دورِ اوّل سے اس ادارے کے اہل ادب کا جائزہ لیں تو ہمیں حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس دور کی ابتداء کرنا برکت کے طور پر مناسب ہوگا۔ اس دور میں حاجی صاحب کی اردو شاعری اور اردو خطوط، مولانا محمد قاسم صاحبؒ کی اردو شاعری اور اردو مکتوبات، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ شیخ الحدیث اوّل دارالعلوم کی اردو شاعری اور ان کے اردو خطوط کا مجموعہ بنام منشی محمد قاسم صاحب، مولانا ذوالفقار علی صاحب والد مرحوم شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اردو شاعری اور دیوانِ حماسہ، دیوانِ متنبی، قصیدہ بردہ، قصیدہ بانت سعاد، سبعہ معلقات کے اردو ترجمے اور شرحیں، مولانا فضل الرحمٰن والد مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک اور اس کے آخری سرپرست کی اردو شاعری ان حضرات پر پیش نظر کتاب میں ان کی زندگی کی پوری تصویر آپ کے سامنے آرہی ہے۔

دورِ دوم

دوسرے دور میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اردو شاعری، مولانا اشرف علی صاحبؒ، مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا حافظ محمد احمدؒ صاحب کا شعری ذوق بھی قابل داد ہے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم صاحب کی یاد میں لکھتے ہیں۔

قبر سے اُٹھ کے پکاروں جو رشید و قاسم بوسہ دیں لب کو مرے مالک و رضواں دونوں
بحر امواج طریقت کے ہیں دو چشمۂ فیض گلبن شرع کے ہیں سنبل و ریحاں دونوں

بحر ذخار ہیں، لیکن نہیں ساحل کا پتہ   ابر رحمت ہیں مگر ہیں گہر افشاں دونوں

مولانا حافظ محمد احمدؒ صاحب سابق مہتمم مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔

صد حیف کہ روشن دِلِ دانا ز جہاں رفت   ہیہات کہ سرمایۂ دانش زمیاں رفت
از بانی واسلاف دریں مدرسہ باقی   بودست ہمیں فضل، افسوس ہماں رفت

اور پھر حافظ صاحب مرحوم اردو مرثیے میں اس طرح خامہ طراز ہیں۔

خراب حیف ہوا، بوستان فضل وکمال   وہ نخلبند معانی کدھر گیا ہے ہے
بقیۃ السلف الصالحین واویلا   بس ایک دم تھا وہ بھی کدھر گیا ہے ہے

جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا عبدالباقر رئیس حیدر آباد دکن محسن دارالعلوم کی وفات پر لکھتے ہیں۔

عبد باقر آں کہ از علم وورع   داشت حظے وافرے مالا کلام
بغتۃً زیں دارِ فانی در گذشت   داغِ فرقت داد بہر خاص وعام
من علیہا فان ویبقیٰ وجہہ   قد کفی بالموت وعظا یا ھمام

اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اٹھارہ سال کی عمر میں فارسی میں مثنوی زیر و بم لکھی جس کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں۔

عشق نورے ہست ز انوارِ خدا   عشق سرے ہست ز اسرار خدا
عشق گرداند ازیں وآں غنی   روح وقالب را بخشد روشنی
عشق می سازد زمال وجاں جدا   عاشقاں رانیست مطلب جز خدا

دورِ سوم

تیسرے دور میں دارالعلوم کا ادبی ذوق اور بھی زیادہ بلند نظر آتا ہے۔ اس دور کے ممتاز اردو انشاء پرداز جس نے اہل ادب سے بہترین اردو نثر نگاری کا تمغہ حاصل کیا علامہ شبیر احمد

عثمانی ہیں۔ انہوں نے دورِ قدیم کی روایات کو شگفتہ اردو میں پیش کر کے اور اسلامی ادب کا نمایاں کردار ادا کر کے اپنی مادرِ علمی کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے ہیں، وہ کبھی کبھی شعر و سخن کی طرف بھی آتے تھے مگر جھجکتے جھجکتے مولانا اشرف علی صاحب کا مرثیہ لکھتے ہوئے فرمایا ۔

قلب و جگر فگار ہیں فریاد کیا کریں　　ہمدم بیان گلشن برباد کیا کریں
غم ہی وہ غم پڑا ہے کہ اللہ کی پناہ　　درمان راحت دِل ناشاد کیا کریں

اسی دور میں بعض بعض ہستیوں کی طرف ہم نے ادبی حیثیت سے نہیں دیکھا ورنہ میاں صاحب مولانا سیّد اصغر حسینؒ جیسے فرشتہ سیرت ابوداؤد کے معلم جب ”مصیبت نامہ“ جیسی ٹریجڈی (المیہ) لکھتے ہیں اور اس میں جابجا اپنے عبرت ناک اور درد انگیز اشعار موقع بموقع درج کرتے جاتے ہیں تو اردو زبان چٹخارے لینے لگتی ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی اسارت مالٹا سے پانچ سال کے بعد دیوبند واپسی پر لکھتے ہیں ۔

آیئے تشریف لانا ہے تو جلد آجایئے　　ورنہ حضرت اب تو اپنا خاتمہ ہونے کو ہے
آرہے ہیں، دیکھ کر جن کو خدا آتا ہے یاد　　دیکھنا ہر گھر میں اب ذکرِ خدا ہونے کو ہے
ہو چکی ظلمت، نظر آئے گا اب آبِ حیات　　اب مرا خضرِ طریقت رہنما ہونے کو ہے
کہتے ہیں آئیں گے حضرت کلبۂ احزان میں　　رشکِ قالیں آج میرا بوریا ہونے کو ہے۔

میاں صاحب کا پہلا شعر ہائے کتنا درد انگیز اور سہلِ ممتنع ہے کہ نظم کی نظم اور نثر کی نثر ہے۔

شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب مرحوم اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں ذوق سخن کے مالک ہیں، اردو نثر میں جب کوئی مضمون لکھتے ہیں تو سادہ اور خشک عبارت کے ساتھ ساتھ تحریروں میں کہیں رنگ بھی بھرتے جاتے ہیں۔ غیر معمولی متانت اور ثقاہت کے نیچے ان کی شعری طبیعت دب کر رہ گئی ہے ورنہ اگر ان کے جذبات شعری کو کرید کر دیکھا جائے تو اس میں چنگاریاں چمکتی نظر آئیں گی۔ متنبی کے اشعار کی شرح کرتے کرتے وہ اردو کے ہم معنی شعر لکھتے ہیں اور مثلاً یوں کہتے ہیں ۔

درد دِل سے عجب اک لطف ہے حاصل ہوتا
سر سے لے پاؤں تلک کاش کہ میں دِل ہوتا

تو ان چنگاریوں کے چمکارے صاف نظر آتے ہیں۔ یا دیوبند کی تعریف کے متعلق اپنے ایک مسدس میں لکھتے ہیں۔

مخزنِ علم نبی آنکھوں کا تارا دیوبند   معدن فضل وہدیٰ، ہم سب کا پیارا دیوبند
پنجۂ شیطاں سے چھٹنے کا سہارا دیوبند   دیوبندی ہم ہیں اب اور ہے ہمارا دیوبند
ہم کو کیا گر میرو مرزا پر کسیکو ناز ہے
نسبت دین ہمیں تو مایۂ اعزاز ہے

مولانا سراج احمد صاحب مرحوم مشکوٰۃ شریف کے مخصوص استاذ اور ادبی مذاق کے دلدادہ اردو اور فارسی شاعری کا ذوق سلیم رکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں کہتے تھے، اور خوب کہتے تھے۔ مثلاً جب شیخ الہند مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند آنے والے ہیں تو موصوف یوں دِل کے پھپھولے پھوڑتے ہیں۔

مالٹا سے اب نسیم جانفزا آنے کو ہے   دِل میں جاں آنے کو ہے عیسیٰ وا آنے کو ہے
کیوں کلی کو بے کلی پیدا ہوئی ہے آجکل   چاک ہر ایک گل نے کس کے رنج میں کی ہے قبا
کس کا صدمہ ہے کہ سنبل کھا رہا ہے پیچ وتاب   کس کے غم سے ہوگیا ہے زرد رنگ اب کہربا
لیتے لیتے ہچکیاں سوکھی ہے سوسن کی زباں
روتے روتے چشم نرگس میں ہے اُترا موتیا

کیا اشعار کہے ہیں۔ بالکل اُستاد ذوق کا وہ رنگ ہے جو ظفر کی صحت پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے۔

واہ وا کیا معتدل ہے باغ عالم کی ہوا   مثل نبض صاحب صحت ہے ہر موج صبا

اسی دورِ سوم میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ احقر فارسی اور عربی کے زبردست

شاعر ہیں۔ عربی وفارسی نظم میں مولانا محمد قاسم صاحب کی طرح تقریر کرنے پر قادر ہیں۔ نعت کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے آں کہ ہمہ رحمت مُہداۃ قدیری   باراں صفت وبحر ہمّت ابر مطیری
معراج تو کرسی شدۂ وسبع سماوات   فرش قدمت عرش بریں سدرہ سریری
برفرق جہاں پایۂ پائی تو شدہ ثبت   ہم صدر کبیری وہمہ بدر منیری
ختم رسل ونجم سُبُل صبح ہدایت   حقا کہ بشیری تو والحق نذیری
آدم بصف محشر وذریت آدم   درظل لوایت کہ امامی وامیری
یکتا کہ بود مرکز ہر دائرہ یکتا   تامرکز عالم توئی بے مثل ونظیری

کس نیست ازیں امت تو آنکہ چو احقر
باروی سیہ آمدۂ وموی زریری

دورِ چہارم وپنجم

تیسرے دور کے بعد چوتھا اور پانچواں دور ہے۔ اس دور میں دیوبند کے علما میں امتیازی طور پر انشا نگاری اور شعروسخن سے ذوق رکھنے والوں میں مولانا محمد طیب صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا بدر عالم صاحب، مولانا احسان اللہ خاں تاجور مرحوم، مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مولانا محمد طاہر مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا منظور احمد نعمانی، پروفیسر سعید احمد، مولانا عبدالوحید صدیقی، مولانا محمد میاں، مولانا حامد الانصاری اور پروفیسر محمد انوار الحسن شیرکوٹی وغیرہم ہیں۔

مولانا محمد طیب صاحب اردو فارسی میں کہتے ہیں۔ مولانا عبدالباقر کے مرثئے میں لکھتے ہیں۔

خوگر عیش وطرب آج آہ اپنا دِل نہیں   دور ہوائے شادمانی میں تیرے قابل نہیں
ہوں وہ بحرِ غم کہیں جس کا کوئی ساحل نہیں   دِل میں ہے اِک دردِ شوقِ شرکتِ محفل نہیں

کیا نقاب رُخ نہیں ہے موت محو دید کی
نا امیدی اِک سزا ہے کشتۂ امید کی

مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی مفتی اعظم پاکستان اور سابق مدرس دیو بند لکھتے ہیں۔

قیامت کیا ہے یارب اب قیامت کیوں نہیں آتی   گہن میں تو بیک دم آگئے شمس و قمر دونوں
کسے تھاموں کہ ٹکڑے ہوگئے قلب و جگر دونوں
بجائے اشک خوں برسا رہی ہیں چشم تر دونوں

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم ''نغمۂ ہمت'' کے عنوان پر لکھتے ہیں۔

چاہتا ہوں تجھے افلاک سے اونچا کردوں   چرخ والوں سے بھی رتبہ ترا بالا کردوں
بحر گیتی کا بنادوں تجھے یکتا موتی   چشم عالم کا تری ذات کو تارا کردوں
زخم جو دِل پہ ترے ہے وہ ذرا اوچھا ہے   آرزو ہے کہ اسے اور بھی گہرا کردوں
غلغلہ لے کے بڑھوں نعرۂ توحید کا میں
کرۂ ارض پہ ایک زلزلہ برپا کردوں

پروفیسر دیال سنگھ کالج مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی مرحوم فاضل دیو بند لکھتے ہیں۔

نئی طرز ستم ایجاد کرکے
ہوئے چمپت مجھے برباد کرکے
سدھارے وہ تو بولی دِل کی حسرت
پیارے پھر بھی آنا یاد کرکے

مولانا محمد طاہر مرحوم برادر خُرد مولانا محمد طیب صاحب شیخ الہند کی یاد میں لکھتے ہیں۔

انتظار دید میں کیا جانے کیا ہونے کو ہے
حسرتوں میں دِل کی اب محشر بپا ہونے کو ہے

آپ کی صورت پہ صدقے آپ کے رُخ پر فدا
اپنا اور بیگانہ، چھوٹا اور بڑا ہونے کو ہے

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب شاہ عبدالرحیم صاحب کے مرثیے میں لکھتے ہیں۔

یہ وہ صدمہ ہے کہ جو دِل سے نکل سکتا نہیں
یہ وہ غم ہے جو دلِ بے تاب کی جاں ہو گیا
میں ہی کچھ تنہا نہیں ہوں بیقرارِ دردِ ہجر
ایک عالم ہے جو اس غم سے پریشاں ہو گیا

پروفیسر محمد انوار الحسن انور شیرکوٹی اسلامیہ کالج لائل پور لکھتے ہیں۔

زندگی کے ساز کی اقبال تو آواز ہے   کس بلندی پر تخیل کی ترے پرواز ہے
تیرے نالوں نے دِیا ہم کو سراغِ زندگی   تیری آہوں نے کیا روشن چراغِ زندگی
تیرے نغموں نے کیا شاداب باغِ زندگی   تو نے پہنچایا بلندی پر دماغِ زندگی
تو نے گرمایا فغاں سے مردِ مومن کا لہو
تیرے نغموں نے کیا پیدا جہانِ رنگ و بو

غرض یہ کہ علمائے دیوبند نے اردو فارسی اور عربی زبان کی بھی بے حد خدمت کی ہے لیکن ان کا میدان چونکہ تبلیغ شریعت اور اعلائے دین اسلام تھا اس لئے وہ بزم ادبا میں بیٹھے نظر نہیں آتے اور نہ ہی ان کی ان خدمات کے لئے کوئی تذکرہ ترتیب دیا گیا جو ان کے ان کارناموں کی یاد دلاتا اور وہ خود بھی گمنامی کو اپنے لئے فخر سمجھتے رہے۔

وجہ تصنیف مشاہیر دیوبند

انہی امور کے پیش نظر میں نے علمائے دیوبند کے مشہور بزرگوں کا تذکرہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی پہلی جلد آپ کے پیش نظر ہے۔ اس میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند،

مولانا محمد یعقوبؒ صاحب اولین شیخ الحدیث، مولانا ذوالفقار علی صاحب رفیق بنائے دارالعلوم اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب یکی از بانیان دارالعلوم کا ذکر اور ان کے حالات زندگی، علمی و عملی، روحانی و تصنیفی، ادبی، نثری اور شعری خدمات غرض کہ کسی شخصیت کے متعلق پوری زندگی کو گھیرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی طرح دوسری جلد حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا اشرف علی، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب وغیرہم پر مشتمل ہوگی تیسری جلد میں حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمدؒ صاحب، مولانا حسینؒ احمد صاحب، مولانا اعزاز علی صاحب وغیرہم کا ذکر ہوگا۔ چوتھی جلد میں چوتھے دور کے علماء مولانا محمد طیب صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب، مولانا مناظر احسن گیلانی وغیرہم کا تذکرہ ہوگا اور پانچویں جلد میں اب تک کے پانچویں دور کے مشاہیر ہوں گے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ تذکرے میں صرف انہی حضرات کو لیا ہے جو دارالعلوم کے سرپرست، بانی، مدرس یا طلبہ رہے ہیں اور جن کا دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق رہا ہے، اور وہ کسی رنگ میں عمومی یا خصوصی شہرت کے مالک ہیں۔

آغازِ تصنیف

جنوری ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ کی بات ہے جب راقم الحروف نے اپنے محترم مولانا ازہر شاہ صاحب (ابن شیخ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب) ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم کی فرمائش پر ''تذکرہ ادبائے دیوبند'' کے نام سے تقریباً ۱۵-۱۶ مضامین لکھے اور جو ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے رسالوں میں شائع ہوئے لیکن ان مضامین کو میں نے اس عرصے میں وقتاً فوقتاً بڑھا کر کتابی شکل میں سیر حاصل تبصروں کے ساتھ لکھا اور اس پہلی جلد کو غالباً ۱۹۵۶ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان ختم کر لیا اور کوشش یہ کی کہ صرف ادب پر ہی ان حضرات کے متعلق کچھ لکھنا بے ادبی ہے اس لئے ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ اصل اسلامی اور دینی، روحانی و اخلاقی خدمات پر بھی ادب کے ضمن میں ان حضرات کے متعلق حتی

المقدور تفصیل سے لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب کے چھپنے میں نامساعد حالات کے باعث دیر ہوتی چلی گئی بعض دوستوں نے میرے شائع شدہ مضامین سے فائدہ اٹھایا اور ایک صاحب نے ”علمائے دیوبند اور ادب“ کے نام سے کتابچہ لکھ مارا۔ کاش وہ جلدی نہ کرتے اور مجھے کتاب شائع کرنے کا موقع دیتے۔ دوسری کتاب ”مشائخ دیوبند“ کے نام سے شائع ہوئی، مگر اس کتاب کا موضوع میرے نقطۂ خیال اور وسعت خیال سے مختلف ہے۔ تاہم میرے مضامین کے بعض حصوں سے اس میں بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے ہماری یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔

شکریہ

میں اس مقام پر پہنچ کر استاد محترم حکیم الاسلام مولانا محمد طیب صاحب کا بے حد شکر گذار ہوں کہ ان کی مساعی جمیلہ سے یہ کتاب منصۂ شہود پر آرہی ہے اور ساتھ یہ حاجی محمد شفیع صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی طباعت کی طرف توجہ کی۔

والحمد للہ رب العٰلمین۔ والسلام علی رسولہ النبی الکریم۔

محمد انوار الحسن شیرکوٹی

پروفیسر اسلامیہ کالج لائلپور

۱۱ر ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ، ۶ر اپریل ۱۹۶۳ء بروز ہفتہ ۱۲½ بجے دوپہر

مشاہیر دیوبند

(جلد اوّل)

حیاتِ امدادؒ

حاجی امداد اللہ صاحب تھانوی، مکی، رحمۃ اللہ علیہ کے تاریخی، علمی، ادبی روحانی اور مجاہدانہ حالات کا دلچسپ اور معلومات افزا مرقع اور ان کی تصنیفات، اردو فارسی انشا نگاری اور فن شعر وسخن پر فنکارانہ تبصرے۔

محمد انوار الحسن پروفیسر

نذرِ عقیدت

میں سید الطائفہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات سے متعلق مشاہیر دیوبند کا یہ گلدستہ عقیدت ان کی بارگاہِ اقدس میں پیش کر کے شرفِ سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں جن کے انوار کے چمکارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور پھر مرشدی مولانا عبدالقادرؒ صاحب رائے پوری سے مجھ تک پہنچے ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر ان سب حضرات کی قبروں کو نور سے بھر دے اور قیامت میں ان اولیاء کا ساتھ نصیب فرمائے اور میری اس ناچیز کوشش کو ذخیرۂ آخرت فرمائے۔ (آمین)

محمد انوار الحسن قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

مشاہیر دیوبند

بابِ اوّل

پہلا دور

حاجی امداد اللہ صاحب امداد تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۲۲/صفر ۱۲۳۳ھ تا وفات ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۸۱۴ء تا ۱۸۹۶ء

حمد

اے مرے معبود اے میرے الٰہ   ہے تو ہی مقصودِ دِل بے اشتباہ
اے مرے محبوب، اے میرے حبیب   ہوں غمِ دوری سے مرنے کے قریب
ہجر سے زیادہ مصیبت کچھ نہیں   اس سے بہتر ہے کہ مرجاؤں کہیں
یاالٰہی مجھکو مجھ سے دُور کر   تا کہ دیکھوں تجھ سے تجھ کو، اک نظر
یاالٰہی تو ہے خلّاقِ جہاں   مالکِ دارین وشاہِ انس و جاں
گرچہ دو عالم سے تو ہے بے نیاز   لیک بے چاروں کا تو ہے چارہ ساز
دستگیرِ بے کساں ہے تیری ذات
مستغیثِ عاجزاں ہے تیری ذات
آسرا بے آسروں کا ہے تو ہی   بے سہاروں کا سہارا ہے تو ہی
اس سے زیادہ اب تمنا کچھ نہیں   آستاں تیرا ہو اور میری جبیں
تجھ کو ہی تجھ سے طلب کرتا ہوں میں   اور کی خواہش نہ اب کرتا ہوں میں
فکر باطل، دِل سے میرے دور کر   عشق کے انوار سے پُر نور کر
دو جہاں سے کرکے مجھ کو بے نیاز   دولتِ دیدار سے اپنی نواز
کر عطا ایسی تپش دِل کو مرے   ماسوا جاناں کے سب کو پھونک دے
ختم کرکے یہ مناجات نو
کر وسیلہ ذاتِ پیغمبر کو تو

نعت

حامد ومحمود وممدوحِ خدا   احمد مرسل محمد مصطفیٰ
زینت تاجِ رسالت ہے وہ ذات   رونقِ تختِ نبوت ہے وہ ذات
عزتِ شاہی وفخرِ سروری   شان بخشِ مسند پیغمبری
روشنی عرش ونورِ لامکاں   شمع بزمِ عالم کون ومکاں
راحت وروح وروانِ کائنات   زندگانی پرور وجانِ حیات
پڑھ تو امداد اس پہ صلوات وسلام
آل اور اصحاب پر اس کی تمام

آغازِ کتاب

ہم نے اس کتاب کا آغاز، حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر اوّل میں ان ہی کی نوشتہ حمد ونعت خدا اور رسول سے کیا ہے۔ حاجیؒ صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے پیر طریقت اور مرشد ہدایت تھے۔ اس کتاب کا مقصد دارالعلوم دیوبند کے علماء وفضلاء اور متعلقین کے سیاسی، علمی، مذہبی اور اصلاحی کارناموں اور بالخصوص ادب کو اجاگر کرنا ہے جو گمنامی کے گوشوں میں پڑے ہوئے اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ آپ کے تذکرہ کا دارالعلوم اور اس کی بنیاد سے ایک گہرا اور ابتدائی تعلق ہے جس کا پتہ مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم کے سابق اور دوسرے مہتمم اور حاجی صاحب کے درمیان تبادلۂ الفاظ سے چلتا ہے۔ علمائے حق کے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

> ’’قیامِ دارالعلوم کے بعد اسی جماعت کے ایک بزرگ (مولانا رفیع الدین صاحبؒ) جب حج بیت اللہ کے لئے مکہ معظمہ میں حاضر ہوئے تو وہاں سیّدنا حضرت حاجی امداد اللہ سے عرض کیا۔ ’’ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا

ہے اس کے لئے دُعا فرمائے''۔

حضرت حاجی صاحب نے دلچسپ انداز میں فرمایا:

> ''سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ اسلام کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دُعاؤں کا ثمرہ ہے یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولت گرانقدر کو یہ سرزمین لے اڑی''۔ (علمائے حق ص:اے جلد اوّل)

اس لئے دارالعلوم کا وجود دوسرے صاحبدلوں کی رگڑی ہوئی پیشانیوں کے علاوہ خاص طور پر چونکہ حاجی صاحب کی جبہ سائی کا نور ہے لہٰذا ہم نے بھی اس تذکرہ کو حاجی صاحب کے ذکر سے زینت دینا باعث سعادت سمجھا ہے۔

حاجی صاحب کا نام، لقب اور تاریخی اسم

آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم نے امداد حسین رکھا تھا۔ لیکن حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب نے امداد اللہ کے لقب سے ملقب فرمایا۔ شاید ان کو امداد حسین نام پسند نہ آیا۔ کہ اس میں شرک کی بو آتی ہے، چنانچہ اس نام کو حاجی صاحب نے بھی ترک کر دیا اور کتابوں نیز خطوط میں ہمیشہ امداد اللہ ہی لکھا کئے۔

راقم الحروف کو ''گلزارِ معرفت'' سے جو آپ کی غزلیات وغیرہ کا ایک مختصر سا مجموعہ ہے ایک اور نام کا بھی پتہ چلا ہے اور وہ نام خدا بخش ہے۔ یہ نام کس نے رکھا معلوم نہ ہو سکا۔ لکھتے ہیں۔

ہم نہ شاعر ہیں، نہ ملا ہیں، نہ عالم ہیں ولے رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم
اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو تا کہ جانیں شعر گوئی میں تجھے اُستاد ہم

لیکن اسی قافیئے اور ردیف میں دوسری غزل لکھنے کا مذکورہ بالا شعر میں جو پتہ دیا ہے اس

میں آپ لکھتے ہیں۔

ہے نہ یہ شعر و غزل، ہے اپنی مجذوبانہ بڑ بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم
ڈر ہے کیا فوج گنہ سے، ہے خدا بخش اپنا نام اور تسپر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

ان اشعار میں بھی خدا بخش اور امداد اللہ دونوں ناموں کا اظہار صاف ہے۔ آپ نے اپنے مختلف خطوط میں اپنا ایک اور نام عبدالکریم بھی ظاہر فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھتے ہیں:

> ''از فقیر عبدالکریم عزیز القدر، عالی مرتبت مولوی محمد قاسم زاد شوقہ وذوقہ باللہ تعالیٰ۔'' (امداد المشاق کا حصہ مرقومات امدادیہ: ص ۲۱۷)

ایک اور خط میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھا ہے تحریر فرماتے ہیں:

> ''از فقیر حقیر عبدالکریم عفی عنہ۔'' (مرقومات امدادیہ ص: ۲۲۱)

معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام حاجی صاحب نے کسی مصلحت کی وجہ سے رکھا تھا۔ آپ کا تاریخی نام ظفر احمد تھا اور والد صاحب کا نام حافظ محمد امین بن شیخ بڈھا بن حافظ شیخ بلاقی تھا۔

(شمائم امدادیہ ص: ۶)

پیدائش، وطن اور نسب نامہ

آپ کی پیدائش ۲۲ر صفر ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء پیر کے روز قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور (یو۔پی) میں ہوئی جو آپ کی نانہال تھی۔ لیکن آبائی وطن تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو۔پی) ہے۔ سلسلہ نسب کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل سے تھے۔ اپنی کتاب ضیاء القلوب کے دیباچے میں نسب نامہ، وطن اور سلسلۂ بیعت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

> ''احقر ناچیز سراپا گناہ امداد اللہ فاروقی، چشتی، تھانوی۔''

اس جملے میں نام، وطن، نسب اور سلسلہ چشتیہ تمام امور کا ذکر کر کے طالبین کے لئے

تحقیق کا سامان پیدا کر دیا ہے۔

بھائی بہن

مولانا اشرف علی صاحب اپنی کتاب امداد المشتاق میں شمائم امدادیہ سے حسب ذیل عبارت لے کر تحریر فرماتے ہیں:

> ”حضرت (حاجی) صاحب ...... کے دو بڑے بھائی اور ایک بھائی اور ہمشیرہ چھوٹے تھے۔ بڑے بھائی ذوالفقار علی، منجھلے بھائی فدا حسین۔ تیسرے خود حضرت اور چھوٹے بھائی بہادر علی اور ہمشیرہ بی بی وزیر النسا تھیں۔“ (ص:۷)

والدہ کی وفات

ابھی آپ سات سال کے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ بی بی حسینی بنت شیخ علی محمد صدیقی نانوتوی کا انتقال ہو گیا اور آپ والدہ کے سائے سے محروم ہو گئے۔

تعلیم

ابتدائے طفلی میں تعلیم شروع کی۔ قرآن شریف حفظ کرنا شروع کیا۔ کئی حافظوں کو استاد بنایا لیکن ہندوستان سے ہجرت کے بعد ۱۲۵۸ھ میں چند دن مکہ معظمہ میں پورا ہو گیا۔

سولہ سال کی عمر میں تقریباً ۱۲۴۹ھ میں مولانا مملوک علی صاحب مشہور استاد صدر شعبۂ علوم مشرقیہ دہلی کالج کے ہمراہ دہلی کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں فارسی کی مختصر کتابیں پڑھیں اور کچھ علم صرف ونحو حاصل کیا۔ مولانا رحمت علی صاحب تھانوی سے تکمیل الایمان، شیخ عبد الحق دہلوی کی قرأت اخذ فرمائی۔ (شمائم امدادیہ ص:۹)

تعلیم مشکوٰۃ شریف

”بعد ازاں بالہام غیبی وبجذبۂ لذت کلام نبوی مشکوٰۃ شریف کا ایک رُبع قراءۃ عاشق زار رسول انور حضرت مولانا محمد قلندر محدث جلال آبادی پر گذرانا، حصن حصین اور فقہ اکبر،

امام الائمہ سراج الائمہ امام اعظم ابی حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ قراءۃ حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم نانوتوی سے اخذ کیا'' (امداد المشتاق از حضرت مولانا اشرف علی ص:۷)

اگرچہ حاجی صاحبؒ کا علم ظاہری قلیل تھا لیکن باطنی علوم کی وجہ سے کہ آپ کو علم لدنی دیا گیا تھا بڑے بڑے عظیم الشان مسائل حل فرمادیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ کیا حاجی صاحبؒ عالم بھی تھی تو آپ نے فرمایا ''عالم ہونا کیا معنی، اللہ کی ذات پاک نے آپ کو عالم گر فرمایا ہے۔ (امداد المشاق ص:۱۰)

ایک اور جگہ مولانا اشرف علی صاحبؒ تھانوی امداد المشاق ص: ۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں جس سے آپ کے علم لدنی کا بخوبی پتہ چلتا ہے لکھتے ہیں:

> ''گو ظاہری علم شریعت میں علاّمہ دوراں اور مشہور زماں مولوی نہ تھے مگر علم لدنی کے جامۂ عنبر شامہ سے آراستہ اور نور عرفان وایقان کے زیورات سے سرتاپا پیراستہ تھے۔''

ارواحِ ثلاثہ میں حضرت مولانا اشرف علی کا ایک قول یہ بھی درج ہے۔ فرماتے ہیں؛

> ''حضرت حاجی صاحب نے صرف کافیہ تک پڑھا تھا اور ہم نے اتنا پڑھا ہے کہ ایک اور کافیہ لکھ دیں مگر حضرت کے علوم ایسے تھے کہ آپ کے سامنے علما کی کوئی حقیقت نہ تھی ہاں اصطلاحات تو ضرور نہیں بولتے تھے۔'' (ص:۱۸۶)

مولانا محمد قاسم صاحب حاجی صاحب کی زبان تھے

حاجی صاحب کے علوم کا اندازہ اگر کسی کو کرنا ہو تو آپ کے ملفوظات، مکتوبات، شرح مثنوی مولانا روم از حاجی صاحب، مطالعہ کیجئے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ظاہری تعلیم اگرچہ قلیل تھی لیکن علم لدنی (اللہ کے دیئے ہوئے علم) کے باعث آپ پر شریعت اور تصوف کے راز فاش کردیئے گئے تھے۔ آپ کے علوم کی حقیقت کا اظہار آپ کے اس ملفوظ سے بھی واضح ہوتا ہے جو مولانا اشرف علی صاحبؒ اور دوسروں کی روایات میں ہے۔ مولانا

تھانوی کے ملفوظات میں ہے:

> ”حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقائق کو مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بکثرت ظاہر فرمایا ہے حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ ہر ایک بزرگ کو ایک خاص لسان دی جاتی ہے میری لسان مولوی محمد قاسم صاحب ہیں۔ (النور ۲۴ر شعبان ۵۲ھ، ملفوظ نمبر ۳۵۷)

لیکن امدادالمشتاق میں مولانا تھانوی کے الفاظ یہ ہیں:

> ”(مؤلف (یعنی مولانا اشرف علی صاحبؒ) نے اکثر زبان حق ترجمان حضرت (حاجی امداداللہ صاحب) سے سنا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا کہ مولوی محمد قاسم مرحوم کو میری زبان بنایا تھا جیسے مولانا روم کو حضرت شمس تبریز قدس سرہٗ کی زبان بنایا تھا۔“ (امداد ص:۱۱)

ان ملفوظات سے واضح ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت حاجی صاحب کی زبان تھے اور یہ مسلّم ہے کہ مولانا محمد قاسم کا علمی مقام اتنا بلند تھا کہ ان سے بڑھ کر اس زمانے میں شاید ہی کسی کا مقام اتنا بلند ہو۔ ذرا غور کیجئے کہ گلستان مثنوی اور تھوڑی سی صرف ونحو اور کچھ مشکوٰۃ شریف پڑھنے والا شخص معرفت آگاہ کیسے بن گیا؟ دراصل یہ علم سینہ بسینہ چلتا ہے آخر سب سے پہلی وحی پر جب جبریل علیہ السلام نے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو کہا کہ ”اِقْرَاْ“ پڑھیے تو آپ نے فرمایا ”ما انا بقاریٔ“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں تو جبریل علیہ السلام نے تین مرتبہ سینے سے بھیچا اور علوم الٰہی کے خزانوں سے سینہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم لبریز ہو گیا۔ یہی حال حاجی صاحب اور دوسرے بے پڑھے لکھے اولیاء کا ہوتا ہے۔

حاجی صاحب کے ظاہری علمی مقامات کی مثالیں

مولانا اشرف علی صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب نے فرمایا:

”اَلْوِلَایَةُ اَفْضَلُ مِنَ النُّبُوَّةِ (ولایت نبوت سے افضل ہے) حق ہے۔ لیکن مراد

> (نماز دِل کی حاضری کے بغیر نہیں ہوتی) وارد ہوا ہے۔ اور دوسرا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کرتا تھا کہ اِنِّیْ اُجَھِّزُ الْجَیْشَ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ (میں نماز پڑھنے کے دوران میں لشکر کا انتظام کرتا ہوں) اس سے زیادہ کون امر منافی نماز ہوسکتا ہے آخر الامر آپ (حضرت حاجی صاحب) سے محاکمہ (فیصلہ) چاہا۔ ارشاد ہوا کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض نہیں ہے۔ مقربوں کو جب بادشاہوں کی حضوری ہوتی ہے امور لاحقہ عرض کرتے ہیں اور استمزاج چاہتے ہیں اور بجا آوری خدمت کی کوشش کرتے ہیں پس یہ عین حضوری ہے نہ منافی حضوری۔" (امداد ص: ۵۱-۵۲)

کسی اہل علم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں بظاہر تعارض کو ایسے طریقے سے بیان کرتا ہے کہ تعارض نہیں رہتا اور ہر آیت وحدیث اپنی اپنی جگہ فٹ اور صحیح ہوجاتی ہے۔ دیکھئے ان دونوں حدیثوں کے معنیٰ حاجی صاحب نے کس خوبی سے بیان کئے ہیں کہ کوئی تعارض باقی نہیں رہتا۔

فیضان کی قسمیں

ایک اور موقع پر حاجی صاحب نے فرمایا:

"فیضان کی تین قسمیں ہیں۔ فیضان حالی جیسا کہ عبداللہ نومسلم حلقۂ حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ میں آیا اور گریہ (رونا) شروع کردیا۔ حافظ صاحب نے اس کے آنسو اپنی انگلیوں میں لے کر اپنی آنکھوں کے نیچے لگائے بمجرد اس کے ایک کیفیت ساری محفل پر طاری ہوگئی اور سب وجد میں آگئے۔ یہ فیضان حالی ہے۔

"قسم دوم فیضان قولی کہ کوئی عارف کچھ کہے اور اس سے وہ فائدہ مرتب ہو جو سالہا سال کی عبادت میں ممکن نہ ہو۔"

''قسم سوم فیضان فعلی کہ شیخ کی ریا کاری مرید کے اخلاص سے بہتر ہے جیسے کہ شیخ کوئی عمل اس نیت سے کرے کہ مرید بھی اس پر عمل کریں۔'' (امداد المشتاق ص:۶۹)

خدا کا دُنیا میں دیکھنا

ایک ملفوظ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سوال کے جواب میں آیا خدا کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھنا ممکن ہے یا نہیں فرمایا:

''ممکن ہے۔ معنی آیہ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ کے یہ ہیں کہ اس بصارت ظاہری سے رویت حق تعالیٰ کی ممکن نہیں ہے اور جب نظر بصیرت (باطنہ) حاصل ہو جاتی ہے بصارت (ظاہری) پر غالب آتی ہے، پس عارف حقیقت میں نظر بصیرت سے دیکھتا ہے اور اگر یہ سمجھے کہ آنکھوں سے دیکھتا ہے تو اس کی غلطی ہے، دلیل اس بات کی کہ اس نظر سے نہیں دیکھتا یہ ہے کہ آنکھ بند کرلے رویت بدستور ہے۔ دوسرے یہ کہ دید آنکھوں کی عارضی نور آفتاب کی محتاج ہے بخلاف اس دید کے کہ محتاج نور بصیرت ہے بدون پرتو اس نور کے غیر ممکن و محال ہے۔ پھر مولانا (اشرف علی صاحبؒ) نے استفسار فرمایا کہ خطاب ﴿لَنْ تَرَانِيْ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیوں کیا گیا (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ اس میں نفی رویت ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور یہ درست ہے کہ عارف (خدا کا پہچاننے والا) اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا ہے بلکہ دیدۂ حق سے دیکھتا ہے اور نیز اس میں نفی رویت ذات ہے کیوں کہ فنائے عبد اس کو لازم ہے اور جب فنا ہوا پھر رویت کجا۔'' (امداد ص:۵۱)

ایک موقع پر فرمایا:

''دُعا کی چار قسمیں ہیں اوّل دُعائے فرض مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے واسطے بلا کی دُعا کرے پس اس پر یہ دُعا کرنا فرض ہے۔ دوم دُعائے واجب جیسے قنوت (وتروں میں) سوم دُعائے سنت جیسے بعد تشہد (التحیات پڑھنے کے بعد اور ادعیہ ماثورہ، چہارم دُعائے

عبادت جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے کیوں کہ دُعا میں تذلل ہے اور تذلل (عاجزی) حق تعالیٰ کو محبوب ہے، لہٰذا اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ (دُعا عبادت کا مغز ہے) وارد ہوا ہے۔” (امداد ص ۵۰۔۵۱)

ہم نے یہ چند نمونے حضرت حاجی صاحب کے علم وعرفان کے پیش کئے ہیں تا کہ ان کے تذکرے سے انکا علمی مقام متعین ہو سکے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہم اللہ علیہم بھی جب کسی مسئلہ میں ان حضرات کو شبہ ہوتا تو حضرت حاجی صاحب سے دریافت فرمایا کرتے تھے۔ بس ان کے ظاہری علوم کے متعلق اسی قدر لکھنا کافی ہے۔

مولانا نصیر الدینؒ صاحب سے بیعت

یہ تو ظاہری علوم وتسلیم کا حال تھا لیکن روحانیت کے مقام کی تاریخ یہ ہے کہ آپ ابھی ظاہری تعلیم میں مصروف تھے کہ خدا کی تلاش کا جوش دِل میں اٹھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا نصیر الدین صاحب نقشبندی مجددی دہلوی سے جو شاہ محمد آفاق صاحبؒ کے خلیفہ اور مرید اور شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کے داماد اور شاگرد تھے طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی اور چند دِن ان سے فیض حاصل کر کے اجازت اور خرقہ سے مشرف ہوئے۔ (امداد ص: ۷)

میانجی نور محمد صاحب جھنجھانویؒ سے بیعت

مولانا نصیر الدین صاحب کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے جو اپنے زمانے کے بلند پایہ صاحب طریقت تھے بیعت کی۔ میانجی صاحب کی خدمت میں آپ ایک عرصہ تک قیام پذیر رہے اور چاروں سلسلوں یعنی نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ کے سلسلوں کی تکمیل کر کے اجازت حاصل کی۔ پھر میانجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ۱۲۵۹ھ میں انتقال ہو گیا۔

مقام روحانیت

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا روحانی مقام بھی اس بات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے تقریباً بڑے بڑے بلند پایہ علما اور صلحا آپ کے مرید تھے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب، شیخ الحدیث و مدرس اوّل دار العلوم دیوبند، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری مشہور ادیب و استاد شبلی، مولانا ذوالفقار علی صاحب شارح حماسہ، متنبّی وغیرہ، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری، نواب حاجی مولوی محی الدین خاں مراد آبادی، علاّمہ عصر مولانا عبد الرحمٰن کاندھلوی، مولانا الحاج محی الدین خاں خاطر میسوری مصنف کتب کثیرہ مولانا صفات احمد غازیپوری وغیرہم۔

اتباعِ شریعت

تصوف کے اعلیٰ مقامات طے کرنے کے باوجود جاہل صوفیوں کے علی الرغم (برخلاف) شریعت کے سخت متبع اور پابند تھے، ہر بات میں سنت کا خیال رہتا تھا، اس کے باوجود کہ آپ صاحب کرامت تھے لیکن کرامت کو تصوف اور دوراندیشی کی دلیل نہ سمجھتے تھے، بلکہ اس کے اظہار کو صاحب کرامت صوفیاء کی کم حوصلگی جانتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں بہت سے مہمان آ گئے، کھانا کم تھا، حضرت حاجی صاحب نے اپنا رومال بھیج دیا کہ اس کو ڈھانک دو۔ کھانے میں ایسی برکت ہوئی کہ یہ سب نے کھا لیا اور کھانا بچ گیا۔ حضرت حافظ ضامن صاحبؒ کو خبر ہوئی تو عرض کیا کہ حضرت آپ کا رومال سلامت چاہئے اب تو قحط کیوں پڑے گا۔ حضرت شرمندہ ہو گئے اور فرمایا کہ واقعی خطا ہو گئی توبہ کرتا ہوں پھر ایسا نہ ہوگا۔ (امداد بحوالہ امثال عبرت ص: ۱۸۲)

آپ کی کراموں میں سے ایک مشہور اور زبردست کرامت جو تذکرۃ الرشید اور دیگر کتابوں میں موجود ہے یہ ہے کہ جب حاجی صاحب راؤ عبد اللہ صاحب رئیس پنجلاسہ ضلع

انبالہ کے یہاں مقیم تھے اور ۱۸۵۷ء و ۱۲۷۳ھ کے ہنگامۂ آزادی کے عاشقوں اور مجاہدوں کی تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی تو کسی نے ضلع کے کلکٹر کو اطلاع دی کہ حاجی صاحب جو شاملی ضلع مظفر نگر کے جہاد میں امیر جہاد تھے اپنے مرید یا عقیدت مند راؤ عبداللہ صاحب کے یہاں اصطبل میں مقیم ہیں۔ ضلع کا کلکٹر خود سوار ہو کر اصطبل پر آ موجود ہوا اور کہنے لگا ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس بہت اچھے اچھے گھوڑے ہیں ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اصطبل کا دروازہ کھول دیا گیا۔ معتقدین سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ انگریز کلکٹر جب اندر داخل ہوا بستر لگا ہوا تھا، مصلّیٰ بچھا ہوا تھا اور وضو کا لوٹا بھی موجود تھا۔ اس کے پانی سے زمین تر تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر حاجی صاحب غائب تھے۔ لیکن جب وہ چلا گیا تھا حاجی صاحب کو مصلے پر دیکھا گیا۔ دراصل سلوک اور تصوّف کی منزلوں میں ایک مقام فنا سالک پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ کثافت سے علیحدہ ہو کر لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

غرض کہ حاجی صاحب کی کرامتوں، فضیلتوں اور بزرگیوں کو تمام اہل ہند اور اہل عرب نے تسلیم کیا ہے اور آپ عرب وعجم کے مسلمہ شیخ مانے گئے ہیں۔

نفحات مکیہ کے مترجم، شمائم امداد میں لکھتے ہیں:

> ”اولیائے عصر آپ کی ولایت پر اجماع رکھتے ہیں اور علمائے زمان آپ کے علوم منزل کا اعتراف کرتے ہیں۔ حضرت حق سبحانہ نے علوم اسماء وصفات سے آپ کو مخصوص فرمایا ہے اور معارف خاص وخصوصیات علوم اعلیٰ سے مقامات مرحمت فرمائے ہیں۔“ (شمائم ص: ۳۷)

آگے چل کر یہی مترجم حاجی صاحب کے مقام روحانیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”قطبوں کا ایک گروہ مامور بسکوت کلیہ نہیں ہوتا بلکہ اسرار معارف ودقائق تصوّف ونکات حروف واسماء وغیرہا سے کہ بظاہر حقیقت شریعت سے مخاطب معلوم ہوتے ہیں ممنوع ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ تعلیم وارشاد میں مشغول رہتے ہیں اور بندگانِ خدا کو منافع پہنچاتے رہتے ہیں اور داعی الخلق الی الحق رہتے

ہیں اور حقیقت میں قطب ارشاد یہی ہیں۔ حضرت (حاجی صاحب) اسی جماعت سے ہیں۔'' (شمائم امدادیہ ص: ۴۳)

شاملی ضلع مظفر نگر میں ۱۲۷۴ھ کی جنگ آزادی

اور حاجی صاحب اور اُن کے رفقاء کا جہاد

ابھی گذشتہ سطور میں آپ نے حاجی صاحبؒ کی جنگ آزادی کے سلسلے میں جہاد کرنے کے بعد بمقام پنجلاسہ راؤ عبداللہ کے یہاں قیام اور ضلع کے کلکٹر کا اصطبل میں پہنچ کر ان کی تفتیش اور حاجی صاحب کا دکھائی نہ دئے جانے کا اجمالی حال پڑھا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے بغیر حضرت والا کے سوانح زندگی نامکمل سے رہ جائیں گے۔ اس لئے ہم آپ کی کتاب زندگی کے اس ورق کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں مئی ۱۸۵۷ء کا دور بھی عجیب ہنگامہ خیز دور اپنی نوعیت کا نہایت ہی طلاطم خیز اور فتنہ آشوب دور تھا۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کو سنبھالا دینے کے لئے، جنکی سلطنت اب قلعے میں رہ گئی تھی یا دہلی شہر میں، میرٹھ .... سے جنگ آزادی کا ایک طوفان اٹھا اور وہاں کی فوج نے علم حُریت بلند کیا اور پھر یہ شعلہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا..... سلسلے میں خواجہ حسن نظامی کے ''غدر دہلی کے افسانے'' معلومات افزا ہیں۔ بہر حال ہر جگہ بدامنی تھی، مسلمانوں کا منصوبہ یہ تھا کہ انگریزوں کے ہندوستان میں پاؤں نہ جمنے دیئے جائیں اور جہاں جہاں جم گئے ہیں ان کے قدم وہاں سے اکھاڑ دیے جائیں۔ کسی حکومت کے ختم ہونے اور دوسری حکومت کے آنے پر جس عبوری دور سے دُنیا گذرتی ہے وہ دور نہایت ہی نازک دور ہوا کرتا ہے۔ اسی صورت حال سے ہندوستان دوچار تھا۔ خصوصاً مسلمانوں کے لئے یہ وقت نہایت ہی خطرناک تھا۔ انگریزوں کو جس کے متعلق شبہ ہوتا یا جس کسی کے متعلق رپورٹ ملتی کہ وہ بھی اس ہنگامے میں شریک تھا تو اس کو سولی پر چڑھا دیا

جاتا۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم آخری تاجدار دہلی نے اپنے حسب ذیل اشعار میں اس وقت کی حالت کا نقشہ خوب کھینچا ہے لکھتے ہیں۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دِل کو میرے قرار ہے   کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں اس پہ کیا یہ جفا ہوئی   جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے

یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ اس وقت شرفا کا کیا حال ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ کتنوں کو پھانسی ہوئی، کتنے قید کئے گئے، کتنوں کو کالے پانی پہنچا دیا گیا۔ کتنے چھپتے چھپاتے ہجرت کر گئے انہی میں حاجی صاحب اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی اور شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی مولانا محمد قاسم صاحب کے شیخ الحدیث تھے۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہو گیا اور مئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۸۵۷ء تک پہنچا، دہلی مسلمانوں سے خالی ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا وہ اور اُن کی بیگم زینت محل رنگون میں نظر بند کر دئے گئے اور وہیں دُنیا سے گذر گئے شہزادوں کو قتل کر کے ان کے سر طشت میں رکھ کر بہادر شاہ ظفر کے سامنے پیش کئے گئے۔ یہ انتقام تھا ان انگریز مردوں و عورتوں اور بچوں کے قتل کا جو باغیوں نے لال قلعے میں پناہ گزیں انگریزوں کو قتل کیا تھا۔ جس میں بہادر شاہ کا ہاتھ بالکل نہ تھا۔ مرزا غالب اپنے ایک خط مورخہ ۵/دسمبر ۱۸۵۷ء بنام ہرگوپال تفتہ میں دہلی کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:

> ”(غدر سے پہلے) پہلے جنم میں میں بھی دلی کے محلے بلی ماروں میں رہا کرتا تھا لیکن اس دوسرے جنم میں نہ اس دور کا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی ملنے جلنے والا۔ امیر، غریب اور پیشہ ور کوئی بھی اس دور کا موجود نہیں۔ کچھ لوگ ہیں تو وہ باہر کے مسلمانوں کا تو کہیں نام و نشان نہیں۔ ہاں کچھ ہندو آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ میں اپنے پرانے گھر میں کس طرح محفوظ رہا اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں حکیم حسن محمد خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے بحیثیت کرایہ دار کے رہ

رہا ہوں اور ان حکیموں کے خاندان کے لوگ نریندر سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے نوکر ہیں۔ پٹیالے کے راجہ نے انگریزوں سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ دلی پر فتح پانے کے بعد اس خاندان کے لوگوں پر کوئی ظلم نہ ڈھایا جائے، چنانچہ ہنگامے کے دوران مہاراجہ کے سپاہی یہاں آبیٹھے اس طرح یہ گلی فساد سے محفوظ رہی۔ ورنہ میرا بھی اس شہر میں رہنا ناممکن تھا۔ تم یقین کرو کہ امیر وغریب سبھی شہر سے باہر نکل گئے اور جو لوگ رہ گئے تھے وہ زبردستی نکالے گئے، کسی طبقے کا کوئی آدمی یہاں موجود نہیں۔ زیادہ تفصیل سے لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں، وہ نوکر جو اس ہنگامے کے دوران ملازم ہوئے ان کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے اور ان سے سوال وجواب کیا جارہا ہے۔ میرا قلعے سے صرف اتنا تعلق تھا کہ تاریخ لکھنے اور بادشاہ کے شعر کہنے کی اصلاح کا کام میرے سپرد تھا۔ اب اسے نوکری سمجھو یا مزدوری، ہنگامے اور فساد میں، میں شامل نہ تھا۔ لہٰذا اپنے کو بے گناہ سمجھتے ہوئے میں نے شہر نہ چھوڑا۔ شہر میں موجودگی کا علم حکام کو ہے لیکن بادشاہ کے دفتر یا جاسوسوں کے ذریعے میرے خلاف کوئی بات نہیں پائی گئی۔ اس لئے میری پیشی کی نوبت نہ آئی ورنہ بڑے بڑے راجے اور مہاراجے پکڑ کر لائے گئے، ہاں صورت یہ ہے کہ دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا ہوں کہیں باہر نکلنے کی نوبت نہیں آتی۔ اور نہ کوئی میرے پاس آتا ہے اور آئے بھی کون جب شہر میں کوئی موجود ہی نہ ہو مجرم سزا پارہے ہیں۔ فوجی انتظام گیارہ مئی سے آج (۵؍دسمبر ۱۸۵۷ء بروز ہفتہ تک بدستور ہے دیکھئے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہاں باہر سے کوئی بغیر ٹکٹ نہیں آسکتا، تم یہاں آنے کا ارادہ ہرگز نہ کرنا۔ دیکھو مسلمانوں کو آباد ہونے کی اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ منشی صاحب کو میرا اسلام کہنا۔ تمہارا خط ملتے ہی میں نے جواب لکھ کر ڈاکئے کے حوالے کر دیا۔ شنبہ ۵؍دسمبر ۱۸۵۷ء۔ غالب

اس خط سے دہلی کا حال زار، مسلمانوں کا دہلی سے اخراج، مقدمات کا چلنا، صاف معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال چونکہ ملک میں ہر طرف انتشار تھا، اس لئے غنڈوں نے بھی سر نکالا اور لوٹ کا بازار گرم رکھا۔ ایک جماعت کہ جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی میں سرگرم تھی اور دوسری طرف ایسے پُر آشوب دور سے فائدہ اٹھانے کے لئے ملک کا ناشائستہ اور ناپسندیدہ طبقہ فتنہ وفساد کے شعلوں پر مٹی کا تیل چھڑک رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گھروں میں اپنی عزت کی حفاظت کی خاطر چھپے بیٹھے تھے۔ ہندو راجاؤں میں کچھ ایسے تھے جو بہادر شاہ کا ساتھ دے رہے تھے اور کچھ مخالف تھے۔ ہندو پبلک اور سکھوں کے بھی کتنے عناصر انگریز کا ساتھ دے رہے تھے اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔

ضلع مظفر نگر کا قصبہ تھانہ بھون بھی اس جنگ آزادی میں ایک خاص پارٹ ادا کر رہا تھا، یہ قصبہ ہندو پاک کے مرشد کامل حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وطن تھا اور اسی مقام پر حضرت محمد ضامنؒ صاحب اور حضرت مولانا شیخ محمد تھانویؒ، حاجی صاحب کے پیر بھائی بھی سکونت رکھتے تھے۔ اور پھر حاجی صاحب کی وجہ سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دار العلوم دیوبند اس نازک دور میں اکثر تھانہ بھون میں اپنے پیر و مرشد حاجی صاحب کے پاس آمد و رفت رکھتے تھے۔

یہ صوفیاء اور علمائے ربانی کی جماعت کب یہ چاہ سکتی تھی کہ مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہو جائے اس لئے انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا اور اپنے قصبے میں متوازی حکومت قائم کر کے مقدمات کے فیصلے شروع کر دیئے۔ جہاد کی تحریک حضرت حافظ محمد ضامن صاحب نے کی، لیکن مولانا گنگوہی نے فقہی نکتہ پیش کیا کہ امیر کے بغیر جہاد کی صورت جواز کیونکر ممکن ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے امارت کے لئے حاجی صاحب کو تجویز فرمایا اور اُن کو امیرِ جہاد بنا کر بیعت کر لی، حافظ محمد ضامن صاحب جو حاجی صاحب کے پیر بھائی تھے انہوں نے بھی اور حضرت گنگوہی نے اور سب جماعت نے جہاد کے لئے عہد کیا۔

حضرت مولانا محمد صاحب بھی جہاد کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے کہ ہمارے پاس جہاد کے

لئے ہتھیار نہیں ہیں۔ مولانا محمد قاسم صاحب نے فرمایا کہ کیا ہمارے پاس اتنے بھی ہتھیار نہیں ہیں جتنے جنگ بدر میں کفار مکہ کے مقابلے میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پاس تھے۔ یہ سن کر مولانا محمد صاحب خاموش ہو گئے اور بہر حال جہاد کرنے پر متفقہ فیصلہ ہو گیا۔

تذکرۃ الرشید میں جو واقعات درج ہیں چونکہ یہ کتاب انگریزوں کے عہد حکومت میں لکھی گئی اس لئے اس میں کچھ مصلحت کو پیش نظر رکھ کر ان واقعات کا سبب یہ لکھا ہے:

> ''تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خاں کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خاں چند ہاتھی خریدنے سہارنپور گیا۔ وہاں اس آفت رسیدہ کا کوئی بنیا قدیمی دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمیندارانہ تخمصات میں عبدالرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا کر رپورٹ کی کہ فلاں رئیس بھی باغی و مفسد ہے، چنانچہ دہلی میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا اسی وقت دوڑ گئی اور رئیس گرفتار ہو گیا نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی۔''
>
> (تذکرۃ الرشید جلد اوّل ص:۷۴)

اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرحیم خاں کی پھانسی تھانہ بھون میں شورش اور شاملی کی تحصیل پر حملے کا باعث ہوئی جس کے محرک ان کے بڑے بھائی عنایت علی تھے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کی خریداری کا مقصد دہلی کمک پہنچانا تھا ورنہ کئی ہاتھی خریدنے کے کیا معنی لہٰذا بنیئے نے جو رپورٹ دی تھی وہ صحیح تھی۔ تذکرۃ الرشید کے مصنف آگے چل کر تھانہ بھون کے لوگوں کے متعلق عبدالرحیم خاں صاحب کے پھانسی پا جانے کے بعد لکھتے ہیں:

> یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گذران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی

> بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہئے اس لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دُنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المؤمنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی وفوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے۔ اس قصے نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا...... ادھر اعلیٰ حضرت (حاجی صاحب) کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضا میں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا رہے اس لئے آپ (مولانا رشید احمد صاحب) اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔'' (تذکرۃ الرشید ج ۱، ص: ۷۴)

یہ عبارت بتاتی ہے کہ ان علمائے ربانی نے قصبے میں جنگ آزادی کے زمانے میں اپنی متوازن حکومت قائم کر لی تھی، امیر المؤمنین جو حاجی صاحب بنائے گئے اس لفظ کے معنی بہت ہی دوررس اور اس کی حقیقت بہت ہی نتیجہ خیز ہے، صاف پتہ چلتا ہے کہ حاجی صاحب کو امیر المؤمنین بنایا گیا اور مومنین نے جہاد کیا، ورنہ جب انگریز کمپنی کی حکومت تھی تو اس میں امیر المؤمنین بننے کے کیا معنی؟ حکومت نے پبلک کو امن خود قائم کرنے کا اعلان کیا تھا نہ کہ حکومت سے استعفا دے دیا تھا۔ بہر حال مجاہدین کی اس جماعت نے شاملی کی تحصیل پر حملہ کیا اور چونکہ وہاں کمپنی کی حکومت کا خزانہ اور توپ خانہ تھا اس لئے اس کو حاصل کرنا ضروری تھا تاکہ جہاد کا سامان مہیا کیا جا سکے اور حکومت کی قوت کو کم کیا جا سکے۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> ''اعلان کر دیا گیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت

> مولانا محمد قاسم صاحب کو سپہ سالارِ افواج قرار دیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو میمنہ اور میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔“ (نقش حیات ص:۴۲)

چونکہ مذکورہ بالا حضرات نے جہاد کا فیصلہ کرلیا اور یہ صاحبان اپنی بزرگی، پرہیز گاری اور شخصیت کے اعتبار سے با اثر تھے اس لئے چاروں طرف سے لوگ جہاد کے لیے آ کر تھانہ بھون میں جمع ہو گئے۔ یہ اجتماع ان ہی امیر المؤمنین حاجی صاحب کے گرد جمع ہو گیا تھا چنانچہ ان حضرات نے تھانہ بھون اور اطراف وجوانب میں اپنی حکومت قائم کرلی اور انگریزی حاکموں کو نکال باہر کیا۔ پھر معلوم ہوا کہ شاملی ضلع مظفر نگر میں جو تھانہ بھون کے قریب ہے اور سہارنپور سے تھانہ بھون کو چھوٹی لائن پر واقع ہے جو ان دنوں انگریزوں کا فوجی مرکزی مقام بھی تھا انگریز اپنا توپ خانہ بھیج رہے ہیں۔ اس خبر سے مجاہدین کو تشویش لاحق ہوئی اور ان کے استیصال کے لئے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو مقرر کیا گیا۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں:

> ”سڑک ایک باغ کے کنارے سے گذرتی تھی۔ جب مولانا رشید احمدؒ صاحب کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی صاحبؒ نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے اور سب کو حکم کیا پہلے سے تیار رہو جب میں حکم کروں سب کے سب ایک دم فیر کرنا، چنانچہ جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گذری تو سب نے یکدم فیر کیا، پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کتنے آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔“ (نقش ص:۴۴)

بعد ازاں ان حضرات نے سوچا کہ شاملی پر حملہ کرنا چاہئے، چنانچہ وہاں حضرت مولانا

محمد قاسم صاحب اور حضرحافظ محمد ضامن صاحب نے سخت حملے کیے اور تحصیل کے دروازے کو آگ لگادی ناگاہ ایسا پاسا پلٹا کہ حضرت حافظ محمد ضامن صاحب کی ناف کے نیچے گولی لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ اب انگریزوں کی فوج کا پلا بھاری ہوا اور مجاہدین کو پسپائی ہوئی، کمپنی کی قوت زیادہ تھی، رفتہ رفتہ تمام ہندوستان پر ان کے پاؤں جم گئے۔ شاملی کے بعد تھانہ بھون پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور جو بھی ہاتھ لگا اس کو قتل کرادیا اور ان کے گھروں کو آگ لگادی گئی، خانقاہ امدادیہ جہاں بزرگوں کا مجمع رہتا اس کو بھی آگ لگادی گئی، مجاہدین کے وارنٹ جاری ہوئے۔ حاجی صاحب تین دن گنگوہ پھر انبالہ، تگری پنجلاسہ میں مقیم رہے یہیں (راؤ عبداللہ صاحب کے اصطبل میں آپ کو تلاش کیا گیا لیکن آپ کرامت سے پکڑے نہ گئے پھر وہاں سندکو ہوتے ہوئے کراچی پہنچے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحب تین دن تو گھر میں چھپے رہے پھر باہر نکلے لیکن حکومت کے ہاتھ نہ آئے۔ مولانا گنگوہی حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری منہاران ضلع سہارنپور کے مکان سے گرفتار ہوئے اور چھ مہینے جیل میں رہے، آخر ثبوت نہ ملنے کے باعث چھ ماہ کے بعد رہا ہوئے۔ آخر جب وکٹوریہ تخت نشین ہوئی اور ہندوستان کے مجاہدین کی عام معافی کا اعلان ہوا تو یہ ڈرامہ ڈراپ سین ہوا اور سب نے آزادی کا سانس لیا۔

ناحق شناسی اور بے ادبی ہوگی اگر ہم یہاں حافظ محمد ضامن حسن صاحب شہید جہاد شاملی کا ذکر خیر نہ کریں۔

ذکرِ خیر حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ

حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر دارالعلوم دیوبند اور اس کے متعلقین میں تواتر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ہم زمانہ اور رفیقوں میں سے تھے۔ عام طور پر یہ تینوں حضرات جن میں تیسرے شیخ محمد تھانویؒ تھے تھانہ بھون کی

خانقاہ جو مسجد پیر محمد میں واقع ہے اس میں جمع رہتے۔ جیسا کہ حاجی صاحب کی پیدائش ۱۲۳۳ھ میں ہوئی اسی کے لگ بھگ حافظ صاحب ان سے پیدائش میں پہلے ہیں۔

ہم مولانا نسیم احمد فریدی کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے ایک خزانہ مدرسہ صولتیہ کے کتب خانے سے معلوم کیا یعنی حکیم ضیاء الدین صاحب کے ایک رسالہ بنام ''مونس مہجوراں'' کا پتہ دیا جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعات میں حافظ صاحب کی شہادت اور ان کا جہاد حریت بیان کیا ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے کسی طرح حاجی صاحب کے پاس مکہ معظمہ بھیجا تھا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب رام پور منہاران ضلع سہارنپور کے رئیس اور مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت گنگوہی کے دوستوں میں سے ہیں۔ مولانا نانوتوی کے بعض خطوط حکیم صاحب کے نام مکتوبات قاسمی میں موجود ہیں۔ بہر حال حکیم صاحب، حافظ صاحب کے مرید اور جاں نثار تھے۔ حافظ صاحب نے بمشکل حاجی صاحب کی سفارش پر حکیم صاحب کو بیعت کیا تھا ورنہ مولانا نانوتوی کی طرح کسی کو مرید نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی بیعت ہونے آتا تو فرماتے:

> ''بھائی اگر بیعت ہونا ہے تو حاجی صاحب کے پاس جاؤ، وہ خانقاہ میں اندر بیٹھے ہیں۔ اور اگر کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہے تو مولانا محدث کے پاس جاکر پوچھو اور حقہ پینا ہے تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

اسی رسالے میں جو ''مونس مہجوراں'' کے نام سے موسوم ہے حکیم صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کے اشعار جو سو سے زیادہ ہیں نقل کئے ہیں۔ مولانا نسیم احمد فریدی نے ان کو انتخاب کیا ہے اور مضمون کے ضمن میں رسالہ ''تذکرۃ'' نومبر ۱۹۶۱ء دیوبند میں شائع کیا ہے۔ ان اشعار میں مولانا نے حافظ صاحب کا سراپا لکھا ہے ہم سراپا کے اشعار کا اردو میں مفہوم پیش کرتے ہیں، البتہ سراپا کے اشعار مولانا محمد یعقوب صاحب کے بیان میں سوانح یعقوبی میں پڑھیں گے۔ جو حیاتِ امداد سے علیحدہ انشاء اللہ چھاپی جائے گی۔

حافظ صاحب کا سراپا یعنی حلیہ

آپ کا رنگ گورا سفید تھا، چیچک کے کچھ داغ چہرے پر تھے لیکن خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ قد درمیانہ درجے کا تھا اور نہایت متناسب، خوبصورت اور چہرے سے رعب نمایاں، آنکھوں میں سُرخی چمکتی تھی، سینے پر سیاہ بال تھے، بھویں آپس میں ملی ہوئی نہ تھیں بلکہ کشادہ تھیں، سر منڈاتے رہتے تھے، گردن بلند تھی اور چہرے پر تبسم رہتا تھا، بے تکلف، سیدھے سادھے بزرگ اور ظریفانہ طبیعت کے مالک تھے۔

عادات واخلاق

حکیم صاحب آپ کے اخلاق وعادات کے متعلق ''مونس مہجوراں'' میں لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے اس ذات عالی کو کیا بے نظیر پیدا کیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔ اور بایں صورت وشان باکمال...... ایسے بے ساختہ ارو بے تکلف تھے کہ تصنع کا گمان بھی نہ آتا تھا۔ اور ظاہر وباطن وہ صاف معاملہ تھا کہ ریا کی بو پاس نہ تھی۔ اور ہر ایک یہ جانتا تھا کہ مجھ سے نہایت محبت رکھتے ہیں، ہیبتِ حق، چہرۂ پرنور سے ایسی عیاں تھی کہ ہر ایک فعتۃً آنکھ نہ ملا سکتا تھا۔ اور مردم شناسی کا یہ ملکہ تھا کہ کبھی خطا نہ ہوتی تھی اور جیسا جس کو دیکھتے ویسے اس سے کلام فرمایا کرتے تھے۔ غرض کسی حال میں افراط وتفریط نہ تھی اور باوصف خانہ داری اور اہل وعیال کے نہایت آزاد اور مستغنی رہتے تھے۔ گویا فکر دُنیا پاس بھی نہ آیا تھا۔ دانائے عصر اور علمائے زمانہ ہر ایک مخلص ومنقاد تھا۔ نادان ومنافق سے کچھ باک نہ تھا۔ ہر وقت عشق الٰہی میں مست وسرشار رہتے تھے۔ دِل کی کیفیت چہرۂ مبارک پر معلوم ہوا کرتی تھی۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ محبت الٰہی کا صورت شریف پر ہر آن ظہور تھا۔''

(مونسِ مہجوراں رسالہ تذکرہ دیو بند نومبر ۱۹۶۱ء ص:۱۱)

تعلیم وتربیت

حضرت حافظ صاحب شہید کی تعلیم وتربیت اُس زمانے کے مطابق معمولی سی تعلیم ہوگی، کیوں کہ آپ کوئی مستند تعلیم یافتہ نہ تھے۔ تھانہ بھون میں آپ کے زمانے میں جس مستند عالم کا نشان ملتا ہے وہ مولانا شیخ محمد تھانوی تھے۔ حاجی صاحب بھی جیسا کہ پیشتر ذکر کیا گیا منتہی عالم نہ تھے۔ اسی طرح کی تعلیم بہر حال حافظ صاحب کی معلوم ہوتی ہے حافظ بھی آپ البتہ ضرور تھے۔

حالات بیعت

اُس زمانے میں لوگوں میں روحانیت کا شغل خوب خوب تھا۔ حاجی صاحب کی طرح حافظ صاحب نے حضرت میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت کی، حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ”وقت عصر حضرت میاں جی قبلہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ تم آیۂ کریمہ ایک لاکھ پچیس ہزار مرتبہ ختم کرلو۔ حضرت حافظ صاحب نے بعد عصر آیت کریمہ شروع فرمائی اور اگلی عصر تک ختم فرما کر اُسی جگہ سے اٹھے۔ اور اس ایک رات دِن میں بجز حاجت ضروری یا نماز وغیرہ ضروریات کے کوئی بات نہ کی۔ جب میانجی (صاحب) نے ذکر واشغال تلقین فرمائے اُسی ہمت اور استقامت کے ساتھ انجام کو پہنچائے۔ سوائے اور اشغال کے چند روز میں حبس دَم کی یہ مشق حاصل فرمائی تھی کہ ایک دَم میں ذکر نفی واثبات بعد شرائط پانسو مرتبہ تلک پہنچا کر چھوڑ دیا، زیادہ حاجت نہ ہوئی ورنہ خدا جانے کہاں تک کثرت فرماتے اور کئی سال تک فقط آدھ پاؤ کے بقدر کھانا نوش جاں فرمایا کرتے تھے۔ اور ربط قلب شیخ کے ساتھ اس قدر پیدا کیا تھا کہ بالکل محو اور فنافی الشیخ ہوگئے تھے۔ ۱۵ رشعبان (شب براءت) سے آخر رمضان شریف تک ڈیڑھ مہینے تمام شب

> مشغول رہتے تھے۔ شب کو لیٹنا، سونا بالکل موقوف کر دیتے تھے۔ چند روز میں کمال جذب کے ساتھ سلوک طے فرمایا اور اس قدر کمال توحید اور وسعت حال حاصل ہوئی کہ خارج از بیان ہے۔ اس وقت تمام درویش اہل حال فن تصوف میں پیشوا سمجھتے اور خاص و عام دریافت حال و مقام میں حیران تھے۔"
>
> (مونس یاراں بحوالہ مضمون تذکرہ نومبر ۱۹۶۱ء ص ۱۰۔۱۱)

حصولِ سلوک کی ابتدائی منزلوں میں حافظ صاحب کا مقام

"مشائخ دیوبند" کے مصنف (نور محمدی) کے حوالے سے حضرت حافظ صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

> "حضرت میانجیو علوی جھنجھانوی کے ایک دوست دہلی میں رہتے تھے یہ دونوں حضرات سال بھر میں ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ یعنی کبھی میانجیو صاحب ان سے ملنے جاتے تھے کبھی وہ خود میانجیو صاحب سے ملنے آتے تھے۔ ایک بار حضرت (میانجیو صاحب) ان سے ملنے دہلی تشریف لے گئے۔ آپ کے ساتھ حافظ ضامن صاحب بھی تھے۔ ملاقات کے بعد ان دوست صاحب نے حضرت سے دریافت کیا کہ امسال کتنے تیار کیے۔ فرمایا یہاں تو یہی ایک ہیں۔ انہوں نے کہا جا میرے یار مدرسے میں بھی تعلیم میں پھسڈی تھا اور اب بھی ہے۔ دیکھو یہاں تو اس سال بیس تیار کیے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب کو اپنے مرشد کے متعلق یہ توہین آمیز الفاظ ناگوار گذرے اور آپ جامع مسجد کی حوض پر وضو کرنے بیٹھ گئے۔ ابھی داہنا پاؤں ہی دھو رہے تھے کہ حضرت کے ان دوست کو گھبراہٹ محسوس ہوئی تو حضرت میانجیو صاحب نے فرمایا" گھبراؤ نہیں ہم اپنے باولے کو خود سنبھال لیں گے۔ اور بایاں پاؤں بغیر دھوئے ہوئے حضرت میانجیو صاحب نے حضرت حافظ کو بلایا۔ حافظ صاحب امتثال حکم کے طور پر وضو نا تمام چھوڑ کر حاضر ہوئے اور ان بیس والے صاحب سے

> فرمایا کہ آپ کے بیسوں تو کورے ہیں۔ کیوں کہ حافظ صاحب نے ان بیسوں کی نسبت سلب کر لی تھی۔'' (مشائخ دیو بند ص:۸۲،۸۳)

نسبت کا سلب کرنا تو ولیوں کی باتیں ہیں وہی ان رموز کو خوب پہچانتے ہیں۔ تاہم کسی سے اس کا منصب چھین لینا جب کہ اس پر کوئی اور بالا دست حاکم ہو عقلاً مسلم ہے۔ یہی کچھ روحانی طاقت حافظ محمد ضامن صاحب میں پیدا ہو گئی تھی جو ان کی منزل سلوک کا پتہ دیتی ہے۔

سلوک میں ترقی

آپ کی روحانی حالت نے بعد ازاں بہت ترقی کی حتیٰ کہ جب آپ کے پیر و مرشد میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی کا انتقال ہو گیا تو حاجی امداد اللہ صاحب جو آپ کے پیر بھائی تھے ان کی روحانی تربیت کو حافظ محمد ضامن صاحب نے معراج کمال پر پہنچایا۔

مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا حافظ صاحب سے کسب روحانیت

مولانا شیخ محمد ث تھانوی جو اپنے زمانے کے جید عالم اور زبردست صاحب نسبت تھے انہوں نے تعلیم کے بعد سب سے پہلے حافظ محمد ضامن صاحب شہید جو مولانا کے رشتے کے ماموں ہوتے تھے اور ہم عمر تھے، روحانی فیض حاصل کیا اور بعد ازاں میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت کی۔

اخفائے حال

تصوّف اور طریقت کی منزل میں جو کیفیتیں حاصل ہوتی ہیں ان کا چھپانا صوفی اور عارف خدا کے لئے ظرف کی بلندی کی دلیل ہے۔ حافظ صاحب میں اپنے حالات معرفت کو چھپانا خوب آتا تھا جس سے ان کے بلند مقامات کا پتہ چلتا ہے۔ حکیم ضیاء الدین صاحب مونس یاراں میں لکھتے ہیں:

> ''ابتدائے حال میں حضرت حافظ صاحب کو قمریوں سے شوق تھا۔ ایک روز بعد کھانا کھانے کے ایک روٹی قمریوں کے لئے لائے۔ جس وقت قریب پنجرے کے پہنچے (تو) ایک قمری نے صدائے حق سرہ سنائی، اس صدا کو سُنتے ہی بیہوش ہوکر گر پڑے، ناگاہ ایک شخص آ گیا (اس وقت ہوش آ گیا تھا) گھبرا کر کھڑے ہوگئے اور یوں فرمایا کہ:
>
> ''دیکھو اکثر آدمی راہ میں پانی گرا دیتے ہیں لوگ رپٹ کر گر جاتے ہیں'' سبحان اللہ کتنا اخفائے حال تھا کہ حتی المقدور اپنے حال کو باتوں سے چھپا دیا۔ اسی وجہ سے آپ کے اکثر حال اور خرق عادات ظاہر نہ ہوئے۔
>
> (مونس یاراں تذکرہ نومبر ۱۹۶۱ء)

حکیم صاحب کی اس عبارت سے حافظ صاحب کے اخفائے حال، وجد و ذوق، عشق و معرفت خداوندی اور قمریوں کے پالنے کا پتہ چلتا ہے۔

چشتی اور فاروقی

چونکہ آپ سلوک کے خاندان چشتیہ میں بیعت تھے اس لئے سوز عشق اور بھی زیادہ تھا اس پر ضبط حیرانی سے کم نہیں ورنہ چشتیوں کو وجد و حال بے تاب رکھتا ہے۔ اس کے برعکس نقشبندیہ خاندان والوں کے لب پر مہر خاموشی ہوتی ہے۔ الحاصل حافظ صاحب سلسلہ سلوک میں چشتیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن نسب کے اعتبار سے آپ کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا اس لئے طبیعت میں جراَت، دِل میں حوصلہ، دین میں پختگی اور شدت حضرت عمرؓ کی سی تھی۔

اتباعِ شریعت اور زہد و تقویٰ

صوفی اور عارفِ خدا کی سب سے بڑی پہچان شریعت کی پیروی، سُنت کا اتباع اور بدعت سے نفرت ہے۔ حافظ صاحب اتباع سُنت اور استیصال بدعت میں بہت آگے

تھے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> ''اور اتباعِ شریعت یہ کچھ تھا کہ ادنیٰ بدعت بھی جڑ سے اکھاڑ دیا کرتے تھے اور خود مسئلہ مختلف فیہا میں احتیاط پر عمل فرمایا کرتے تھے، اور اوامر ونواہی میں شانِ فاروقیت کا عروج ہوتا تھا۔ زہد وتقویٰ پر ایسی کمر چست باندھی تھی کہ جان تک سے دریغ نہ فرمایا۔ اللہ اللہ کیا اوصاف بیان کروں مختصر یہ کہ ایک دریائے نور تھا، نورِ محمدی کا ظہور تھا۔'' (مونس یاراں)

شہادت اور کشف شہادت ۲۴ محرم ۱۲۷۴ھ بروز پیر بوقت ظہر بمقام شاملی

جب ہندوستان میں جنگ آزادی کا ولولہ مسلمانوں میں آگ کی طرح پھیل گیا اور اُدھر ضلع مظفر نگر اور سہارنپور بھی اس کی لپیٹ میں آگئے تو حافظ محمد ضامن صاحب اور حاجی امداد اللہ صاحب کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے۔ فقہی طور پر جب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے مسئلے کی صورت حال اور جہاد کی فرضیت طے کردی اور حاجی صاحب کو امیر جہاد بنالیا گیا، کیوں کہ امیر کے بغیر جہاد جائز نہیں تو شاملی ضلع مظفر نگر میں جہاں کی تحصیل میں حکومت کا خزانہ تھا اور یہیں پر توپ خانہ اور اسلحہ بھی موجود تھا اس لئے ان حضرات نے جہاد کیا اور انگریزی فوجوں سے سخت لڑائی کی۔ کئی گھنٹے تک میدان کارزار گرم رہا، بالآخر حافظ محمد ضامن صاحب کی ناف کے نیچے گولی لگی اور شہید ہوگئے اور ع

شہید ہو کے مرے عمر جاوداں کے لئے

حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں

شہادت سے پہلے آپ کو شہادت کا کشف ہو چکا تھا۔ حکیم ضیاء الدین صاحب نے ''مونس یاراں'' میں لکھا ہے کہ شہادت کے سال حافظ صاحب اس طرح فرمایا کرتے تھے:

> ''دیکھو حوریں پیالے لئے ہوئے مکانوں کی منڈیروں پر کھڑی ہیں جس کا جی چاہے لے لیوے۔''

ان ایام میں میں حضرت پیر مرشد (حافظ صاحب) ولولۂ محبت الٰہی میں ایسے مست ومخمور ہوئے تھے (کہ) اکثر ذکر شہادت برزبان تھا اور بہت باتیں اسرار کی کہ اٹھتے تھے۔ ستر حال (اخفائے حال) کا چنداں لحاظ نہ رہا تھا اور جو کوئی مستدعی بیعت ہوتا تھا برخلاف عادت فوراً بیعت کر لیتے تھے۔

حالانکہ اُس سے پہلے حافظ صاحب اخفائے حال اور مرید نہ کرنے پر مستقل مزاج نظر آتے ہیں۔ حکیم ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''ستر حال کا بہت خیال تھا۔ آزادانہ وضع رکھتے تھے۔ بوسیلہ سفارش حضرت حاجی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ میں مشرف بہ بیعت ہوا تھا۔''

شہادت سے پہلے

شہادت سے آٹھ دس روز پہلے ایک خط فارسی زبان میں حافظ صاحب نے اپنے مرید حکیم صاحب کو لکھا، جس کا ترجمہ حکیم صاحب نے محسن یاراں میں حسب ذیل لکھا ہے:

''برادر دینی حکیم محمد ضیاء الدین سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام واضح رائے ہو کہ تمہاری تحریر کے موافق دِل میرا متمنی ملاقات ہے۔ لازم کہ بطور مطالعہ اس خط کے اپنے تئیں یہاں پہنچاؤ، ایسا نہ ہو کہ کہیں توقف میں حسرتِ ملاقات کی دِل میں رہ جائے۔ عاقل کو اشارہ کافی ہے۔ باقی حال بروقتِ ملاقات بیان کیا جائیگا۔ فقط والسلام

شہادت کا دولھا

میدانِ شہادت میں جانے سے پہلے آپ نے جو زیب و زینت کی اس کا نقشہ حکیم صاحب نے اس طرح کھینچا ہے۔

جس وقت ارادۂ معرکہ کیا، غسل فرما کر سب لباس نیا زیب بدن شریف فرمایا اور یہ لباس بہت روز بیشتر رکھ چھوڑا تھا، حالانکہ اس کے بعد کے کپڑے بنائے ہوئے استعمال فرمائے۔ اور وہ لباس اس دن کام آیا۔ نعلین شریف کچھ بوسیدہ نہ تھی مگر وہ بھی نئی منگا کر زیب

پا کیں، اور یہاں تلک سامان لباس وغیرہ کا اہتمام کیا تھا کہ خوشبو ملی اور سرمہ لگایا، دستار پیچدار سپاہیانہ وضع، شمشیر لے کر شربتِ دیدار کی تمنا میں علم جوانمردی اٹھا کر مردانہ اور مشتاقانہ برسرِ معرکہ جاں بحق تسلیم فرمائی جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

در کوئے تو عاشقان چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نہ گنجد ہرگز

(محسن یاراں)

اللہ اللہ حافظ کو شوق شہادت کا جذبہ کس شان سے ان کو مقتل کی طرف کھینچ رہا تھا اور آپ کو یقین تھا کہ مجھے آج شہادت کا جام پینا ہے، اس لئے عید کی طرح خوشیاں مناتے ہوئے یہ دولھا شہید ہوا۔ حکیم صاحب نے اوپر کی عبارت میں افسوس کہ کپڑوں کی نوعیت نہ لکھی حالانکہ جائے شہادت میں جانے سے پہلے حکیم صاحب نے ان کو خوب دیکھا تھا۔

مولانا رشید احمدؒ صاحب گنگوہی کے زانو پر

حافظ صاحب نے مولانا گنگوہیؒ کو وصیت فرمائی تھی کہ بوقت شہادت یعنی نزع کے وقت میرے پاس رہنا، چنانچہ مولانا گنگوہی ہی آپ کو گولی لگنے کے بعد قریب کی مسجد میں لے گئے اور اپنے زانو پر حافظ صاحب کا سر رکھا اور اسی عالم میں یہ شہید الفت اپنے حقیقی محبوب سے جاملا، جس سے ملنے کے لئے بے حد بے چین تھا۔

سنہ پیدائش اور عمر بوقت شہادت

آپ کی پیدائش کی تاریخ اگرچہ کہیں درج نہیں لیکن حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے معاصر ہونے کے سبب اندازہ یہ ہے کہ ۱۲۳۳ھ سے غالباً چند سال پہلے پیدا ہوئے ہوں، کیوں کہ آپ حاجی صاحب سے کچھ عمر میں بڑے تھے۔ اور حاجی صاحب کا سن پیدائش ۱۲۳۳ھ یعنی ۱۸۱۴ء ہے۔ اُدھر آپ کے دوسرے معاصر مولانا شیخ محمد محدث تھانوی ۱۲۳۰ھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن حافظ صاحب ان سے بھی یقیناً عمر میں بڑے تھے۔ قیاس اور درایت سے

معلوم ہوتا ہے کہ حافظ صاحب ۱۲۲۵ھ اور ۱۲۳۰ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے شہادت کے وقت آپ کی عمر تقریباً پینتالیس سال تھی۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شہادت کے وقت جو سراپا لکھا ہے اس کے دو شعر یہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ڈاڑھی اور سینہ کے بال اس وقت بالکل سیاہ تھے۔ لکھتے ہیں۔

ان کے محاسن میں وہ چمکے غدار   شعلے کی جوں دودسیہ میں بہار
سینے پہ کچھ بال سیہ ہیں نمود   ہیں یہ اسی آتش سوزاں کے دود

یعنی حافظ صاحب کے رخسار، محاسن، (ڈاڑھی) میں اس طرح چمکتے تھے جس طرح سیاہ دھوئیں میں شعلہ چمکتا ہے اور سینے پر کچھ بال تھے اور وہ بھی سیاہ تھے جو سوزِ عشقِ الٰہی کے باعث دھوئیں کی بجائے بال بن گئے تھے۔

تاریخِ شہادت

حکیم ضیاء الدین صاحب کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے ''محسن یاراں'' جیسا رسالہ لکھ کر ہمارے ہاتھوں تک تاریخی سند پہنچائی۔ تاریخ شہادت کے متعلق لکھتے ہیں:

> آپ نے ۲۴ر محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو پیر کے دن ظہر کے وقت شربت شہادت نوش جاں فرمایا۔ آپ کی وفات وشہادت پر جو تاریخیں کہی گئیں وہ یہ ہیں۔
>
> ۱...... مؤلف رسالہ (حکیم ضیاء الدین) کے بھائی محمد علاء الدین صاحب رام پوری نے ''شہادت (۱۲۷۴) مرشد ہادی'' تاریخ شہادت نکالی۔
>
> ۲...... مرزا غالب کے شاگرد مولوی عبدالسمیع صاحب بیدل رام پوری (منہاران) نے یہ قطعہ لکھا جس سے معرکہ جہاد پر بھی تھوڑی سی روشنی پڑتی ہے:

شہید ہوگئے ضامن علی پاک نہاد   جواب جن کا نہ تھا کوئی نسلِ آدم میں

ہوئے شہید مگر اِک تماشا دِکھلا کر لہولہان کیا دشمنوں کو اِک دم میں
نہ چھوڑی نام کو گردن کہیں نصاریٰ کی گلو بریدہ ہے سکھ بھی ان کا درہم میں
جو مارے تیر، تو لگتے ہی جا لیا گوشہ ہزاروں کافرِ بدکیش نے جہنم میں
خدا کو پیارے ہوئے آخرش شہید ہوئے نہ دل میں تاب ہے باقی نہ کچھ تواں ہم میں
جو پوچھا سنِ شہادت کہا فلک نے کہ ہائے ہوئے شہید وہ شاہ جری محرم میں

دوسری تاریخ بیدل صاحب نے یوں نکالی۔

بیدل آنوقت کہ حافظ ضامن رفت وآراست بجنت مسند
شاہ رضواں شد وگفت ایں تاریخ حافظ مصحف ایزد آمد

میانجی عبدالغفور کوئی بزرگ اس وقت ہوں گے انہوں نے یہ تاریخ نکالی۔

حوریں سب مل کر کے بولیں واہ واہ پیر کے دن خُلد میں پیر آ گئے
۱۲۷۴

ان میں ایک یہ ہے:

شہ بہشت بریں بود نیز از پے سال بفال طرفہ برآمد شہ بہشت بریں
(محسن یاراں)

مذکورہ بالا تاریخوں سے اور بالخصوص مولوی عبدالسمیع بیدلؔ مصنف حمد باری کے اشعار سے حافظ صاحب کے جہاد سے متعلق کچھ اور تاریخی اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ حافظ صاحب اگرچہ شہید ہوئے لیکن ہزاروں کافروں کو مار کر شہید ہوئے۔ یہ ہزاروں کافر انگریزوں کی فوج کے تھے جن میں سکھ بھی تھے۔ موصوف کے تاریخی اشعار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جہاد میں کسی انگریز کو حافظ صاحب نے نہیں چھوڑا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے تیروں سے دشمنوں کو خوب لہولہان کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد صبح سے شروع ہوا اور دوپہر تک جاری رہا اور ظہر تک حافظ صاحب نے بہت سے دشمنوں کو جہنم میں پہنچایا اور پھر بالآخر آپ کی ناف کے نیچے گولی لگی اور شہید ہو گئے۔

جو نیک بندے تھے حق کے انہوں نے دُنیا میں   شہید ہو کے مرے عمر جاوداں کے لئے

جہاد سے پہلے

جہاد سے پہلے حافظ صاحب، حاجی صاحب اور مولانا محمد صاحب کی باہم مجلسوں اور ملاقاتوں کا نقشہ حکیم ضیاء الدین صاحب نے اس طرح کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

> غرض اس طور طریق خیر و برکت کا یہ مجمع تھانہ بھون مسجد پیر محمد مرحوم میں جمع ہوا تھا کہ کچھ بیان نہیں کیا جاتا۔ اس آخری وقت میں یہ حضرات نمونہ متقدمین کے پیدا ہوئے تھے اور تھوڑے عرصے میں اس قدر تعلیم و تلقین راہِ خدا جاری ہوئی کہ عالم میں شہرہ ہو گیا۔ ہر طرف سے طالب خدا اور درویش وقت رجوع ہونے لگے اور سب اپنے اپنے حوصلے کے موافق فیضیاب ہوتے تھے، عجیب وہ زمانہ تھا اور عجائب کیفیت وہاں رہتی تھی کہ نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی اور ہر چند غور کیا مگر بہرحال اس مجمع کو رنج و راحت دُنیا سے بے فکر پایا۔ بجز یادِ خدا کسی شے کا فکر و اہتمام کرتے نہ دیکھا۔ سبحان اللہ کیا وقت سُرور و حضور تھا اور وہ کیسی برکات عام تھیں کہ جو اخلاص سے چند روز بھی اس صحبت میں رہ گیا ایک حال پیدا کر لے گیا۔ یہ بات اس زمانے میں کہیں نہ تھی۔ سالہا سال کے عابد و زاہد دیکھے جو کچھ ان کے قلب میں اثر ذکر پایا، ان حضرات موصوفین ادام اللہ فیوضہم کی خدمت میں چند روز کے طالبوں کو اس سے بہتر پایا غرض کہ وہاں اوّل ہی ایک نسبت کا اثر ہو جاتا تھا اور جس کسی طالب نے وساوس نفس و شیطانی کو دفع کیا اور جس عقیدت سے وہاں حاضر ہو کر ہمت کر کے زہد و تقویٰ میں قدم چست رکھا اور جی لگا کر ان بزرگوں کی خدمت میں کچھ تربیت پائی مقام عالی پایا، چنانچہ ایسے کتنے خادم ان حضرات کے موجود ہیں کہ ہر طرح کی نعمت دینی سے مالا مال ہیں اور روز و شب اسی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ (محسن یاراں)

جہاد کے بعد مسجد پیر محمد، تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر کی حالت

اب حکیم ضیاء الدین صاحب کے قلم سے جہاد کے بعد ان اصحاب ثلاثہ کی جدائی، تھانہ بھون اور حافظ صاحب کے گھر اور مسجد پیر والی کی ویرانی کا حال سنئے، لکھتے ہیں:

"واحسرتا! کدھر گیا اور کیا ہوا وہ مجمع خیر اور جماعت محبت آمیز اور وہ صحبت عشق انگیز اور وہ مکانِ دِل آویز یعنی مسکن حضرت اقدس کہ اب ویران ہے۔ باوصف اس خستہ حال کے دیکھو وہاں کیا جلوۂ حق ہے اور اس اُجڑے مکان میں کیا دِل کشادگی ہے؟ خس وخاشاک سے بوئے گل اور نغمۂ بلبل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اکثر اہل دِل وہاں جا کر مسرور ہوتے ہیں اور فیض اٹھاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

بزمینیکہ نشاں کف پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

حافظ صاحب مرشد کی جدائی میں مرید ضیاء الدین کا حال

حکیم صاحب کی حالت زار خود انہی کی زبانی سنئے۔ لکھتے ہیں:

"آتش مفارقت جی جلائے دیتی ہے۔ دِل مجبور گھبراتا ہے۔ سوزش درونی کو بیان کیا چاہتا ہے۔ اور کوئی ذکر خوش نہیں آتا۔ حاصل کلام اس ہنگامے میں جلالِ کبریائی کو جوش وخروش تھا۔ اور مدہوشان شیون الٰہی کو بھی ایک ولولہ اور ذوق وشوق تھا۔ چنانچہ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ ونور اللہ مرقدہ وقدس سرہ نے بھی ضررِ دُنیائے دنیہ کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ کمر ہمت چست باندھ کر امر حق پر جان ومال کو قربان کیا اور ذوق وشوق دیدارِ الٰہی میں ایسے مست ہوئے کہ کسی طرح کا تردد نہ ہوا۔ اور تمنائے شربت شہادت وجام کوثر میں ہماری بے کسی کا بھی کچھ خیال نہ فرمایا، سبحان اللہ! کیا ہمتِ مرداں مددِ خدا کا تماشہ دکھلا کر مردانہ اور مشتاقانہ چوبیس محرم الحرام ۱۲۷۴ھ کو برسر معرکہ ہو کر جام شہادت نوش

فرمایا۔ واہ کیا خوب داد ہمت لے گئے اور داغ حسرت دے گئے (دوہرہ)

ساجن دُکھیا کر گئے اور سکھ کو لے گئے ساتھ   جنم بچھو ہاوے گئے اور پھر نہ پوچھی بات
رفتی و مرا خبر نکردی   بر بے کسیم نظر نکردی

اسی رسالے میں حکیم صاحب لکھتے ہیں:

”آہ جس وقت وہ صحبت یاد آتی ہے اور وہ صورت شریف رحمۃ اللہ علیہ نظر میں پھر جاتی ہے، اس دِل ناشاد پر جو کچھ گذرتا ہے بیان نہیں ہوسکتا۔ ہر چند تڑپ تڑپ کر جی چاہتا ہے کہ مر جاؤں، اس ہر دم کی جان کنی سے چھٹ جاؤں مگر کچھ بس نہیں چلتا۔ اور از خود مرا نہیں جاتا۔ ناچار کلیجہ پکڑ کر بے اختیار اپنی زندگانی پر رو دیتا ہوں۔ جب کہیں صورت مراد کی نہ بندھی اور کچھ بس نہ چلا، بجز عرض حاجت کوئی چارہ نہ دیکھا، اب اکثر یہ دُعا ورد زبان اور مونس جاں ہے۔

یہ غلام آپ کا اے شاہ محمد ضامن
کب تلک حسرت دیدار میں کاٹے گا دِن

ہم حافظ صاحب کے حالات شہادت، تھانہ بھون کی ویرانی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، حاجی صاحب، مولانا محمد صاحب اور حافظ صاحب کی صحبتوں، اہل علم وحال کی فیض یابیوں کا حال بیان کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ ہمارا مقصد ایک تاریخی دستاویز کو جو اس تفصیل سے کتابوں کے اوراق میں منتشر ہے یکجا کر دینا ضروری تھا، مگر نہ اتنا طویل کہ سمیٹنا مشکل ہو جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ توفیق نے ساتھ دیا تو ہم ایک مستقل کتاب اس مضمون پر علیحدہ لکھیں گے، بہر حال مذکورہ بالا حضرات اور پھر حضرت مولانا رشید احمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہما کا تھانہ بھون آجانا اور سب کا ایک جگہ جمع ہونا کیا رُوح پرور نظارہ ہوتا ہوگا جس کا نقشہ کھینچنا قلم کے امکان سے باہر ہے۔

مسجد پیروالی تھانہ بھون کا منظر حکیم محمد عمر چرتھاولی کے الفاظ میں

حکیم محمد عمر چرتھاولی مولانا شیخ محمد محدث کے مرید اپنی ایک تحریر میں مسجد پیروالی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> ''سبحان اللہ وہ بھی ایک زمانہ تھا کہ یہ مسجد عبادت گاہ قدسی نفساں تھی۔ ہمپایۂ نجوم یہاں کے نمازی تھے، ہم مرتبہ فلک یہاں کی زمین تھی۔ ایک طرف شمال کے حجرے میں مثال قطب شمالی عاشق ذوالجلال شہید لم یزل، ولی ازلی حافظ ضامن علی رحمۃ اللہ علیہ یادِ الٰہی میں مشغول رہتے، ایک جانب جنوب کی سہ دری میں حضرت فیض درجت سلطان زمین ولایت وکرامت ماہ آسمان رفعت وعظمت، درویش صاحب برکت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ سرگرم قال اللہ وقال الرسول رہتے اور مسجد کے سامنے کوگرتوں پڑتوں کے تھامنے کو مشرق کے حجرے میں ہمارے مرشد مشفق قدس اللہ سرہ الخالق...... کبھی درس وتدریس طلبہ میں...... کبھی مشاہدات ذات وسلطان اذکار میں مستغرق...... ہر ڈھنگ میں زیرِ قدم نبی مقبول، باطن میں سب سے الگ ظاہر میں شامل رہتے تھے تینوں صاحب علاوہ اتحاد نسب، ایک پیر (میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی) کے مرید۔ وہ ماہِ نور تو وہ بدر، وہ بدر تو وہ خورشید، جب کوئی شخص مرید ہونے کے لئے اس قافلہ میں آتا، ہفتوں بلکہ مہینوں بار بیعت نہ پاتا، جس کے پاس جاتا وہ اپنے سے بہتر دوسرے کو بتلاتا، دن رات پانچ سات طالب علم بحث مابعد وماسبق میں مصروف، کوئی ذِکر کلمہ طیب سے مطیب، کوئی تلاوت کلامِ زیبا سے مزیب، کسی کا دل پر اضطرار، صورت سیماب، گرمی شغل ہُو سے جواب برق مضطر، کسی کا سینہ فگار، ضربات اسم ذاتِ حق سے نمونۂ شق القمر، کوئی آٹھوں پہر بارہ تسبیح کے ذکر میں، کوئی نفی واثبات...... پر نظر جمائے ہوئے، کوئی ذکرِ خفی

کے ذریعے ...... دھیان لگائے ہوئے کوئی مجرد "الا اللہ" کی ضربیں لگاتا اسمِ ذات پڑھتا...... کوئی درودِ نا محدود پڑھنے میں دل و جان سے متوجہ، کوئی ادائے نوافل و وظائف میں اطمینان سے متوجہ، کوئی قرآن خوانی کرتا...... کوئی مراقبات میں جانفشانی کرتا، کوئی تفسیر پڑھتا، حدیث سند کرتا، کوئی فقہ و اصول میں جد و جہد کرتا، کوئی منازل درویشی کی تحقیق میں، کوئی مراحل و مراتب تصوّف کی تصدیق میں، طرہ برآں کسی طرف تسبیح خوان کبوترانِ یاہو، کسی طرف کچھ قمریانِ مشغول حق سرہٗ اور جب کبھی دو چار دل فگار مریدانِ رشید حضرت ممدوح الاذکار میں سے مثل مولانا قاسم نانوتوی میاں جی کمال الدین چرتھاولی غفرلہما اللہ الولی خواجہ حکیم ضیاء الدین رامپوری یا مولوی رشید احمد گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ آتے جاتے اور ہی رنگ جماتے ...... جہاں گل وہاں خار، جہاں نیک وہاں نوہیدہ کار جس جگہ یہ سب حضرات وہاں ہم سا بھی واہیات کم محنت، غفلت شعار، محض مشتاقِ دیدار، اپنے مرشد کا چہرہ دیکھنے کے مارے سب سے کنارے ٹکٹکی لگائے ہوئے ذکر سے مطلب نہ فکر سے واسطہ، دید کی عید میں سُد بُد گنوائے ہوئے، ہر شب میں وقت سحر ذکر جہر کا وہ شور بڑھتا کہ دن چڑھے اُٹھنے والا بھی نہایت ذوق و شوق سے اوّل وقت اُٹھ کر صبح کی نماز جماعت سے پڑھتا...... ایک طرف گوشۂ جنوب احاطہ مسجد (پیر والی) میں مولوی محمد اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی قبر مثل پارہ ابر شجر احضر کے پائے میں...... یہ بزرگ مولانا صاحب (شیخ محمد محدث) کے دادا بھائی ہیں، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ہم عصر تھے، عالم و فاضل، درویش کامل، صاحب نظم و نثر تھے "اصطلاحات الفنون" آنحضرت کی بہت بڑی کتاب ہے، فی زمانا نہایت کارآمد ہے ایک مرتبہ طبع ہوئی اب نایاب ہے۔

مسجد کے بیچ میں کوئی

بیچ میں مسجد کے...... ایک چھوٹی کوئی بڑے موقع سے بنی ہوئی۔ پانی وہ خنک اور شیریں گویا بہشت کی نہر کا سوتا ہے...... مسجد

مسجد کی ہیئت

> مسجد کی صورت وشان قطع نظر خوبی عمارت واسلوبی بُنیان، قابل تامل عارفاں، بُرجی نہ مینار، صرف بیچ میں ایک گنبد صورت سرِ انسان۔ خیال کر کے دیکھو تو ایک آدمی بیٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غور کر کے صاف مفہوم ہوتا ہے کہ امام اپنے مقتدیوں کو نماز پڑھا کر دُعا مانگ رہا ہے۔ اور یہ بھی پوشیدہ نہیں کہ اسی مسجد متبرک میں پہلے ان حضرات ممدوح سے ایک مدت تک حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس سرہ الولی رہے

مفتی الٰہی بخش صاحب

> اور حسب پیشن گوئی مولوی معنویؒ اشعار باقی ماندہ دفتر ششم ...... کہے......
>
> المختصر لغایت ۱۲۷۲ھ قائم یہ سلسلہ سعید رہا۔ ہر رات، شب برات، ہر روز عید رہا۔
>
> (بحوالہ مضمون مولانا نسیم احمد فریدی تذکرہ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء ص: ۳۳-۳۴)

مولانا محمد عمر صاحب جرتھاولی کے مذکورہ بالا تاریخی نوٹ میں حضرات ثلاثہ کے اجتماع مسجد پیر والی کی وضع، طالبین کا ہجوم، ذکر وشغل کے چرچے اور مفتی الٰہی بخش کا بھی اس مسجد میں قیام اور مولانا روم کی مثنوی کے چھٹے دفتر کی مفتی الٰہی بخش کے ذریعہ تکمیل ان تمام امور پر نہایت واضح طور پر روشنی پڑتی ہے۔

الغرض حافظ صاحب کی شخصیت ان حضرات میں بڑی ممتاز شخصیت تھی اور جہاد شاملی کے دراصل وہی ہیرو نظر آتے ہیں۔ وہ سب کی نظروں میں عزیز اور سب کے دلوں کے محبوب تھے۔ ان کی شہادت کا سب کو بے حد غم ہوا۔ اور جس قدر احباب کو غم ہوا اسی قدر

شہید کو اپنی شہادت کی خوشی ہوئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی ان کے مرثیے میں ۶۵/ اشعار لکھے ہیں۔ یہ اشعار حکیم صاحب کے رسالے "محسن یاراں" میں درج ہیں جن کا نشان خود حکیم ضیاء الدین صاحب نے دیا ہے اور جن میں سے کچھ اشعار ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

نہ پوچھو ہو رہے ہیں کیوں خفا ہم اس قدر جاں سے
ہمیں پالا پڑا ہے اب کے غمہائے فراواں سے
کہیں سے مول لے دے دل، مجھے کچھ اور اے ہمدم
کہ اُٹھنے کا نہیں بارِ غم اس قلبِ پریشاں سے
چھپا آنکھوں سے وہ نورِ مجسم خاک میں جا کر
کہ جس کا خالِ پا بہتر تھا اس مہر درخشاں سے
شہیدِ راہِ حق، حافظ محمد ضامن چشتی
بنایا تھا جسے حق نے مِلا کر عشق و عرفاں سے
فراقِ یار میں جینا تعجب ہے ولے ہمدم
اجل سے اٹھ سکے شاید نہ ہم بار گناہاں سے
نظر آئے گی یارب پھر بھی وہ صورت کبھی ہم کو
سنیں گے پھر بھی وہ آواز ان لب ہائے خنداں سے
کسی کا کیا گیا پر رنج فرقت کی مصیبت کو
کوئی جا کر کے ٹک پوچھے ضیاء الدین نالاں سے
ہوئی ہم سے خطا یا تھی کشش حُبِّ الٰہی کی
کوئی پوچھے سبب رحلت کا اس سالارِ خوباں سے

گناہوں کے سبب گر ہم نہیں تھے لائق صحبت
تو ہم کو بخشوا لینا کچھ کہہ سن کے رحماں سے
اگر ممنوع تھا ہم سے گنہگاروں کا لے چلنا
تو تنہا اس طرح جانا ہی نازیبا ہے سلطاں سے
اگر قاصد مجھے کوئی وہاں تک کا بہم پہنچے
تو کہلا کر کے بھیجوں یوں میں اس سالارِ نیکاں سے
مبارک ہو تمہیں وصلِ خدا، خلدِ بریں میں، پر
ہمیں یوں چھوڑ کر تنہا تمہیں جانا نہ تھا یاں سے
غمِ فرقت میں یاں گزرے ہے پر کچھ بن نہیں پڑتی
تمہیں فرصت نہیں واں لذتِ دیدار یزداں سے
بنے تھے یُوں تو ہم روزِ ازل سے غم اُٹھانے کو
نہ تھی پر یہ خبر ہوں گے الگ بھی تیرے داماں سے
تمہارے ہجر میں جانِ جہاں کچھ بن نہیں آتا
دِل حسرت زدہ گھبرائے ہے سیرِ گلستاں سے
دلِ مایوس کی کوئی نہیں صورت تسلّی کی
مگر ہاں سر نکالو تم اگر گنجِ شہیداں سے
تمہاری بزمِ پر انوار جب یاد آئے ہے ہم کو
تو ایک شعلہ سا اٹھتا ہے ہمارے قلب سوزاں سے

یہ مرثیہ بھی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس کا ایک مصرعہ

تو تنہا اس طرح جانا بھی نازیبا ہے سلطاں سے

اس مصرعے میں سلطان کا لفظ بتاتا ہے کہ حافظ صاحب جہاد میں بڑے سرگرم تھے۔ اور تمام علماء کے نزدیک صحیح معنی میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کر کے شہادت کا مقام حاصل کیا۔

ہم یہاں پہنچ کر حافظ صاحب کے ذکر مبارک کو ختم کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ شاید ان کے اس تذکرے سے ہمیں سرمایۂ سعادت حاصل ہو جائے۔ لہٰذا پھر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے حالات کی طرف اپنے قلم کی باگ موڑتے ہیں جن کا سلسلہ ہم نے شروع کیا ہے۔

پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی طرف

حاجی صاحب کا پہلا حج ۱۲۶۱ھ میں

حاجی صاحب نے پہلا حج ۱۲۶۱ھ میں ادا کیا جیسا کہ آپ کے ایک قول سے واضح ہے۔ پہلے حج کے موقع پر حاجی صاحب کی جدائی سے متاثر ہو کر مولانا محمد محدث تھانوی نے چند اشعار لکھے ہیں جو آپ کی مثنوی میں موجود ہیں۔

اے غذائے رُوح امداد اللہ   آہ قدرے تو کسی نشاخت آہ
حیف راہی حرم تنہا شدی   ناگہاں چوں جاں جدا از ماشدی
آنچہ وصف تو مرا در باطن است   راز دار گوش حافظ ضامن است
گو من و تو ہر دو اے ہم پیر من   خواجہ تا شائیم و ہم بزم سخن
لیکن باشم چاکر تو گر بجاں   موجب فخر است پیدا و نہاں

پہلے حج کے بعد آپ ہندوستان اپنے وطن تھانہ بھون کی طرف لوٹے لیکن کعبۃ اللہ کے جوار اور پڑوس میں رہنے کا جذبہ اسی وقت سے دِل میں موجیں مارنے لگا تھا، اس لئے اسی وقت ہجرت کا ارادہ فرما لیا۔

جنگ آزادی کے بعد

جنگ آزادی اور جہاد شاملی کے بعد جب حکومت فرنگ کی طرف سے گرفتاری کے احکامات صادر ہوئے تو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون اور خانقاہ کو خیر باد کہا، اس اثنا میں آپ گنگوہ، انبالہ، تگھری، پنجلاسہ میں مقیم رہے اور پھر سندھ کی راہ سے کراچی پہنچے۔ اس اثنا میں حکومت کے افراد آپ کی گرفتاری کی فکر میں برابر رہے لیکن یہ بھی آپ کی کرامت سمجھئے کہ حکومت آپ کو گرفتار کرنے سے قاصر رہی۔ کراچی تک پہنچنے اور مریدین اور معتقدین کے یہاں قیام کرنے میں آپ کو تقریباً سوا دو سال گذر گئے۔ اسی سفر میں آپ نے گذشتہ اوراق میں راؤ عبداللہ صاحب کے یہاں قیام کیا۔ ضلع کے کلکٹر کو اطلاع، اس کا راؤ صاحب کے گھر میں گھوڑے دیکھنے کے بہانے داخل ہونا اور حاجی صاحب کا اس کو دکھائی نہ دینا پڑھا ہے۔ بہرحال حاجی صاحب جمادی الاخریٰ ۱۲۷۶ھ میں پنجاب اور سندھ سے ہوتے ہوئے ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ میں مکہ معظمہ پہنچے۔ لیکن حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۷۷ھ میں روانگی لکھتے ہیں جیسا کہ سوانح قاسمی میں آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

حکیم ضیاء الدین صاحب کا عقیدہ ہے کہ حاجی صاحب اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکہ معظمہ کو ہجرت فرما گئے چنانچہ مونس یاراں میں وہ لکھتے ہیں:

> ناگاہ جناب حاجی صاحب قبلہ سلمہ اللہ تعالیٰ کو جناب باری سے الہام ہوا کہ بیت اللہ کو آؤ، چنانچہ وہ بھی بالہام حق بیت اللہ شریف کو تشریف لئے گئے...... ہائے بیدادی کیسے کیسے مربی جدا ہوئے اس پر بھی ہم سر پھرے جیتے رہے...... یہ نظم حسب حال ہے۔

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا غل تھا

خزاں کے دِن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خاک گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

مکہ معظمہ میں غربت کی زندگی

جب آپ مکہ معظمہ پہنچے اور ہمارے خیال میں انہیں انگریزوں کی حکومت میں ہندوستان میں رہنا گوارا نہ ہوا تو وہاں آپ کو سخت تکلیفات کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی کئی وقت بغیر خورد و نوش فاقے سے گذرتے۔ اپنی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> ”جب میں اول مکہ مکرمہ آیا فقر و فاقہ کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ نو روز تک بجز زمزم شریف کے کچھ نہ ملا۔ تین چار دِن کے بعد بعض احباب سے قرض مانگا۔ انہوں نے باوجود وسعت کے انکار کیا، مجھے معلوم ہوا کہ یہ امتحان ہے پس عہد کرلیا کہ اب قرض بھی نہ لونگا اور ضعف سے یہ حالت تھی کہ نشست و برخاست دشوار تھی۔“ (کراماتِ امدادیہ ص:۳۲)

صاحبدل خوب جانتے ہیں کہ ان حالات میں اولیائے کرام کا خاص امتحان ہوتا ہے۔ توکل کا مقام اور اس پر ثباتِ قدمی کا سبق یہیں سے ملتا ہے۔ پھر جیسا اور جس قدر جس کا توکل زیادہ ہوگا اسی قدر اس کے لئے غیب کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ اور ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کے مطابق جہاں سے سان گمان بھی نہیں ہوتا رزق ملتا ہے، امام غزالیؒ نے توکل کے چار مقامات لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ توکل کرنے والا اپنے آپ کو سرتاپا خدائے تعالیٰ کے سپرد کردیتا ہے، اور جس طرح سے ماں باپ بچے کی خوراک و پوشاک کا خود پورے طور پر خیال رکھتے ہیں اور بچے کو پروا بھی نہیں ہوتی، یہی حال توکل کے آخری مقام کا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ آخر یہ بیشمار پرندے جو صبح کو اپنے آشیانوں سے اڑ کر جاتے ہیں شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں، ان سب کا خدا ہی تو ضامن ہے۔

سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

ایک روز سلطان باہو جنگل میں بھوکے پیاسے تھے، بظاہر روزی کی کوئی شکل نہ تھی، مقامِ توکل زوروں پر تھا، ناگاہ پاس سے ایک ہرن گذرا جس کے سینگ میں بھنی ہوئی مچھلی بندھی ہوئی تھی، آپ نے اُسے لے لیا نوش فرمایا۔ اس وقت مقامِ حیرت میں فرمایا۔

عجب دیدم تماشہ شیخ باہو   برات عاشقاں بر شاخ آہو

چار محمدوں کی حالت زار اور غیبی امداد

یاقوت رومی نے کتاب السمعانی سے اپنی کتاب ارشاد الاریب میں نقل کیا ہے کہ محمد بن جریر طبری، محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی اور محمد بن ہارون رویانی چاروں کے چاروں سفر کرتے مصر میں جمع ہو گئے۔ جو کچھ پاس تھا ختم ہو گیا۔ جس مکان میں ٹھہرے ہوئے تھے ایک رات اس میں سب مل کر بیٹھے اور یہ طے پایا کہ قرعہ اندازی کی جائے اور جس کے نام قرعہ نکلے وہ لوگوں سے ساتھیوں کے لئے کھانا حاصل کرے۔ اچانک قرعہ محمد بن اسحاق کے نام نکل آیا انہیں کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہوئے شرم آئی۔ آپ نے وضو کیا اور نماز خیر پڑھنی شروع کر دی۔ ابھی نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دیکھا تو بادشاہ کا خواجہ سرا تھا۔ جو حاکم مصر کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے پوچھا تم میں سے محمد بن نصر کون ہے۔ رفقاء نے ان کی طرف اشارہ کیا تو خواجہ سرا نے ایک تھیلی نکالی اور ان کو دی جس میں پچاس دینار تھے اور ان کو دے دی۔ پھر اس نے پوچھا کہ محمد بن جریر کون صاحب ہیں، اُن کو بھی پچاس دینار کی تھیلی پیش کی، پھر خواجہ سرا نے محمد بن ہارون کے متعلق پوچھا، ان کو بھی پچاس دینار کی تھیلی عنایت کی، آخر میں محمد بن اسحاق کے متعلق دریافت کیا تو رفقاء نے ان کی طرف اشارہ کیا جو ابھی صلوۃ الخیر میں مصروف تھے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو ان کو بھی پچاس دینار کی تھیلی گذرانی۔ اور پھر بولا کہ امیر مصر دوپہر میں آرام کر رہے تھے تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے کوئی کہہ رہا ہے کہ محامد

(چار محمد) سخت تکلیف میں ہیں۔ اس لئے امیر نے یہ روپیہ بھیجا ہے اور کہا ہے کہ جب یہ رقم خرچ ہو جائے تو امیر کو اطلاع دیجئے تا کہ مزید روپیہ بھیج دیا جائے۔

حاجی صاحب کے ساتھ بھی قدرت کا خصوصی معاملہ

اس قسم کے بیسیوں واقعات اللہ والوں کے ہمارے علم میں ہیں جن کو جھٹلانا بہت مشکل ہے اور عقل سلیم ان کو ماننے پر مجبور ہے۔ یہی کچھ واقعہ حاجی امداد اللہ صاحب کے ساتھ ہوا۔ جب حاجی صاحب کو نو دِن نہایت مصیبت کے گذر گئے تو کیا ہوا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی لکھتے ہیں:

"رات میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کو خواب میں دیکھا کہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے تم کو اپنے باورچی خانے کا ناظم اور مہتمم بنا دیا۔ صبح کو اندھیرے میں ایک شخص نے دروازہ کھٹکھٹایا، میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ایک تھیلی دی جس میں سو ریال (حجازی روپیہ) تھے۔ اور چلا گیا۔

غرض حاجی صاحب کو پھر خورد و نوش کی تکلیف نہیں ہوئی اور معیشت کے لئے ہر ماہ سو روپیہ کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتے تھے۔

ہجرت سے پہلے مالی حالت

جب آپ تھانہ بھون اپنے وطن میں قیام پذیر تھے تو آپ کی مالی حالت بہتر تھی۔ جائداد کا معقول حصہ آپ کے پاس تھا لیکن اپنی تمام زرعی جائداد اور مکان اپنے بھائی کو دے دیا اور اپنے آپ اسی پیر محمد والی مسجد کے ایک حجرے میں رہنے لگے۔

مکہ معظّمہ میں قیام

جب آپ ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ پہنچے تو اوّل اوّل چند سال صفا پہاڑی پر اسماعیل سیٹھ کے رباط۔ رباط (گھر) میں ایک خلوہ (گوشے) میں معتکف رہے۔ پھر بعض یاران طریقت

نے حارۃ الباب کے محلے میں ایک مکان میں قیام کی درخواست کی، بلکہ بہت اصرار کیا تب آپ نے دلجوئی کو وہاں رہنا اختیار فرمایا۔

شہرت ولایت

جوں جوں آپ کا مکے میں قیام کا زمانہ گذرتا گیا اہل مکہ اور باہر کے حجاج میں آپ کے صاحب ولایت ہونے کی شہرت ہوتی چلی گئی اور بڑے بڑے صاحب نسبت بزرگوں نے آپ کی خدادوستی کو تسلیم کرلیا۔ قیام مکہ مکرمہ کے اثنا میں بھی رشد وہدایت اور درس مثنوی کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزاروں لوگوں کو روحانی فیض پہنچا۔

نکاحِ اوّل اور اولاد

آپ نے پچاس، پچپن سال تک شادی نہیں کی، کسی اللہ والے کا بغیر شادی رہنا سنت کے خلاف ہے۔ ہجرت کے بعد غیبی اشارہ ہوا کہ عارف درویش کو یہ موزوں اور مناسب نہیں کہ وہ ایسی سنت سے کنارہ کش رہے۔ لہٰذا آپ نے معتقدین کے اور بی بی نورن صاحب ساکنہ کلکتہ زوجہ سید حیدر علی بنارسی کے اصرار پر بی بی خدیجہ سے جو کہ بی بی نورن کی نواسی تھیں ۲۱؍ رمضان المبارک ۱۲۸۱ھ کو بعوض مہر ساٹھ ریال جو ہندوستان اور پاکستان کے ایک سو پچیس روپیہ کے برابر ہوتے ہیں نکاح کرلیا۔ لیکن ان سے کوئی بچہ نہیں ہوا اور مرحومہ کا انتقال ہوگیا۔

دوسرا اور تیسرا نکاح

دورانِ قیامِ وطن میں آپ کی نسبت بی بی خیر النسا سے ہوئی تھی لیکن نکاح نہ ہوسکا تھا۔ حاجی صاحب نے ہجرت کی اور ان کا کسی اور شخص سے نکاح ہوگیا۔ لیکن قدرت الٰہی سے وہ بیوہ ہوگئیں اور حج کے لئے مکہ معظمہ آئیں تو حضرت کا پھر ان سے نکاح ہوا۔ یہ خاتون بے حد عابدہ اور زاہدہ تھیں لیکن حاجی صاحب کی خدمت سے نابینا ہونے کے باعث قاصر

تھیں۔ انہی بی بی کی موجودگی میں ایک اور بی بی قصبہ رام پور منہاران کی حضرت سے مرید بھی تھیں اور گھر کا کام کاج بھی کیا کرتی تھیں۔ حاجی صاحب بالا خانے پر رہتے۔ نیچے آنے اور اوپر جانے کے لئے ضرورت تھی کہ کوئی سہارا دے۔ حاجی صاحب کسی نامحرم کے ہاتھ سے چھوانا بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ اس لئے اس خاتون نے عرض کیا کہ مجھ سے نکاح کر لیجئے تا کہ خدمت میں تکلیف نہ رہے چنانچہ تیسرا نکاح ان سے ہوا، ان کا نام بی بی امت اللہ تھا، مگر ان میں سے کسی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔

اخلاق وعادات اور حاجی صاحب کا سراپا

آپ کا سر بڑا، پیشانی کشادہ بلند، ابرو وسیع وخمدار، آنکھیں بڑی، رنگ گندمی، نحیف الجسم، درمیانہ قد ایک گونہ طوالت کی طرف مائل، فصیح البیان، شیریں کلام، صاحبِ مروت، صاحب اخلاق، بشاشت سے کلام فرماتے، سنت کے سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جسم نحیف اور کمزور اس پر مجاہدات وریاضات، کھانے اور سونے کی قلت اور سب سے زیادہ خدا تعالیٰ کا عشق جس نے ہڈیوں تک کو گھلا دیا تھا اور آخر عمر میں کروٹ تک لینا دشوار تھا۔ (شمائم امدادیہ وامداد ص ۲۰۰)

رواداری ووسعت قلبی

حاجی صاحب کی ایک خاص صفت جو اولیائے کرام میں ان کا خاص طرۂ امتیاز تھا ان کی وسعت قلبی اور رواداری تھی۔ کسی کی دِل شکنی تو ان کے مذہب میں قطعاً روا نہ تھی۔ کسی سے معاصرانہ چشمک کا دُور دور تک نشان نہ تھا۔ اس قسم کے مصلح تھے کہ دیو بندی، بریلوی، غیر مقلد غرض کہ ہر عقیدے کے لوگ آپ سے مرید تھے، لیکن کسی کے عقیدے سے غرض نہ رکھتے تھے صرف اصلاح سے کام تھا۔ ایک دفعہ ایک غیر مقلد آپ کا مرید ہو گیا۔ لیکن اس نے جلدی آمین بالجہر اور رفع یدین ترک کر دیا، آپ نے اس کو بلا کر فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا

ہے کہ تم نے آمین بالجہر اور رفع یدین ترک کر دیا ہے۔ کیا یہ خود ایسا کیا ہے یا ہماری وجہ سے۔ اگر ہماری وجہ سے کیا ہے تو بھائی ایسا نہ کرو۔ میں ترک سنت کا باعث کیوں بنوں۔ سنت یہ بھی ہے اور وہ بھی: اور اگر اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے تو خیر اس نے عرض کیا حضرت! میں نے تو اپنی مرضی سے ایسا کیا ہے۔

اس حکایت سے حاجی صاحب کی وسعت قلبی کا گہرا نقش دِل پر ثبت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی وسعت خیالی کے باعث آپ سے ہر عقیدے کا مسلمان بخوشی بیعت کرتا اور وہ خود بخود اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا۔ آپ کا طریقہ ہر شخص سے رواداری اور نرمی کا تھا۔

معاصرین، خلفا اور مریدن

یوں تو آپ کے معاصرین اور ہم عصر حضرات میں سے بہت سے تھے، لیکن خصوصیت سے حضرت شاہ عبدالغنیؒ صاحب محدث دہلوی ومہاجر مدنی، مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکیؒ، مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ، حافظ محمد ضامن شہیدؒ، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ، مولانا فیض الحسن صاحب ادیب سہارنپوریؒ شارح حماسہ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور خصوصی ہم عصر تھے۔

مولانا رحمت اللہ صاحب تو مکہ معظمہ میں بھی حضرت کے رفیق رہے۔ آپ کیرانہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے مشہور مناظر تھے۔ آپ نے اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ نے اُس نازک وقت اسلام کی تائید کی جب کہ ہندوستان میں عیسائی پادریوں کی انگریزی حکومت کی وجہ سے یلغار تھی اور مزید براں آریہ پنڈتوں نے بھی سر نکالا ہوا تھا۔ اس وقت مولانا رحمت اللہ صاحب نے پادریوں اور پنڈتوں کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ مولانا رحمت اللہ نے مناظرے میں کئی لاجواب کتابیں لکھی ہیں جن کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہو چکے تھے اور ان کی بڑی مقبولیت ہوئی تھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آپ بھی مکہ معظمہ کو ہجرت

کر گئے تھے چنانچہ وہاں آپ نے مدرسہ صولتیہ کی بنیاد ڈالی اور کلکتے کی صولت بیگم کے نام سے جنہوں نے اپنے حج کے زمانے میں مدرسہ صولتیہ کے لئے مولانا کی گذارش پر روپیہ دیا تھا اس کو منسوب کیا۔ یہ مدرسہ ابھی تک محلہ حارۃ الباب مکہ معظمہ میں دومنزلہ عمارت میں موجود ہے اور اس کے برابر میں مولانا کی ہی تعمیر کرائی ہوئی مسجد ہے جو مدرسہ صولتیہ کے دفتر کے سامنے ہے۔ مولانا کا مزار مکہ معظمہ ہی میں ہے۔ آپ کے برادرزادہ مولانا محمد سعید تھے جو آپ کی خدمت میں مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب نے مدرسے کا انتظام ۱۲ سال کی عمر میں ان کے سپرد کر دیا تھا۔ بعد ازاں مولانا محمد سلیم صاحب ان کے فرزند اس مدرسے کے ناظم بنے جو ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس مدرسے میں کبھی سات سو تک طلبہ کی تعداد تھی۔ بہرحال مولانا رحمت اللہ صاحب حاجی صاحب کے خاص رفقا میں سے تھے۔

حاجی صاحب کے مریدوں میں سے یوں تو تقریباً پانسو علماء تھے اور عوام کی تعداد بتانا مشکل ہے۔ مگر خاص خاص خلفاء میں مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی صاحب شارح حماسہ و متنبی، مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عبدالسمیع صاحب رام پوری مصنف حمد باری، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری خاص خاص ہستیاں ہیں۔

حاجی صاحب کا کتب خانہ

حاجی صاحب جب بڑھاپے کے باعث بہت کمزور ہو گئے تو آپ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب کو جنہوں نے خانقاہ امدادیہ کو ۱۸۵۷ء میں جل کر خاکستر ہونے کے بعد پھر بسایا اور صحیح معنی میں حاجی صاحب کی جانشینی کی، لکھا کہ میرا کتب خانہ آ کر لے جاؤ، یہ خطوط مسلسل آتے رہے اور حضرت تھانوی نے مکہ معظمہ جانے کا ارادہ بھی کر لیا، لیکن اس اثنا

میں حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا، اور یہ کتب خانہ مدرسہ صولتیہ کی لائبریری میں بطور وقف پہنچ گیا۔ میں نے جون ۱۹۵۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۸ھ میں حاجی صاحب کے کتب خانے کی اکثر قلمی اور مطبوعہ کتابیں مولوی شمیم احمد صاحب خلف الرشید مولانا سلیم احمد صاحب موجودہ مہتمم مدرسہ صولتیہ کی معیت میں دیکھی ہیں۔ کتابوں پر حاجی صاحب کی مہریں بھی لگی ہوئی نظر سے گذریں، ضرورت اس بات کی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا کوئی نمائندہ حاجی صاحب کی تمام کتابوں کا جائزہ لے اور اگر کوئی کتاب غیر مطبوعہ ہے تو اس کو چھپوائے، جیسا کہ حکیم ضیاء الدین صاحب کا رسالہ "محسن یاراں" وغیرہ۔ اس کتب خانے میں بہت سی قلمی اور مطبوعہ نادر کتابیں ہیں جو استفادہ اور مطالعہ کرنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

حاجی صاحب کے ورثہ کے معظّمہ میں

حاجی صاحب کے حقیقی بھتیجے حافظ احمد حسین صاحب تھانہ بھون سے آپ کی زندگی میں ہی ہجرت کرکے آپ کی مرضی کے مطابق مکہ معظّمہ پہنچ گئے تھے۔ حافظ صاحب کی شادی مکہ معظّمہ میں گاماوالوں میں ہوئی تھی جو سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ حافظ صاحب کے دولڑکے اور دولڑکیاں تھیں۔ ان کی چھوٹی لڑکی مسماۃ خدیجہ کی شادی مکہ معظّمہ کے مشہور معلم شیخ عمر اکبر سے ۱۳۳۲ھ میں ہوئی تھی، ان کا انتقال ہوگیا تھا، لیکن شیخ عمر صاحب اب بھی زندہ ہیں اور عمر کی آخری گھڑیاں گذار رہے ہیں، اس وقت وہ ستر سال کے ہیں۔ وہ مکہ مکرمہ کے امراء میں شمار ہوتے ہیں اور نہایت بااخلاق، مہمان نواز اور حجاج کے بے حد ہمدرد ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں وہ میرے بھی معلم تھے، اور میں نے ایامِ حج میں اکثر ان کے ساتھ اپنے پیارے لمحے گذارے ہیں اور ان کے دسترخوان پر کھانے کھائے ہیں۔ انہوں نے چودہ سال کی عمر سے معلمی اختیار کی۔ نہایت ظریف الطبع، شیریں زبان اور اہلِ علم ہیں۔ ان کا اصلی وطن انبالہ (پنجاب ہندوستان) تھا۔ عمر اکبر صاحب کے والد صاحب شیخ محمد اکبر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں اپنی پھوپھی صاحبہ کے ہمراہ حاجی امداد

اللہ صاحب کے بعد جب کہ ان کی عمر سات سال کی تھی پہنچے۔ ان کے جوان ہونے اور شادی کے بعد شیخ عمر اکبر پیدا ہوئے۔ شیخ عمر اکبر تین سال کے تھے کہ حاجی صاحب موجود تھے اور ان کو گود میں لے کر بہت پیار کرتے تھے اور ان کو بیٹا کہا کرتے تھے۔ ان کے تین صاحبزادے سب سے بڑے شیخ عبداللہ، دوسرے شیخ سراج اور تیسرے شیخ عثمان حجاج کے بہت خدمت گذار اور منکسر المزاج ہیں۔ عثمان صاحب ابھی چھوٹے ہی تھے کہ حاجی صاحب کے بھتیجے احمد حسین صاحب کی صاحبزادی، شیخ عمر اکبر کی بیوی اور عثمان صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر عمر اکبر صاحب نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ پس حاجی صاحب کی آخری دو بیویاں اور ان کے بھتیجے احمد حسین صاحب اور بعد کے وارث بی بی خدیجہ اور شیخ عمر اکبر ہی ہیں۔ یہ سب معلومات مجھے شیخ عمر اکبر صاحب سے ہی حاصل ہوئی ہیں۔

حافظ صاحب کا ترکہ اور تبرکات

ہم حاجی صاحب کی وفات کے ذکر سے پہلے ہی حاجی صاحب کے ورثہ اور ترکے کا ذکر کر رہے ہیں جو وفات کے ذکر کے بعد ہی ہونا چاہئے تھا، مگر بہرحال یہ ذکر آ گیا تو کیا مضائقہ ہے۔ مولانا سلیم احمد صاحب مہتمم مدرسہ صولتیہ نے بتایا کہ حاجی صاحب کے انتقال کے وقت ان کے سامان میں ایک عصاء، تین تکیے جن میں سے ایک چمڑے کا تھا اور اس پر اشعار تھے۔ دو جوڑے سردی کے اور دو جوڑے گرمی کے اور بقیہ کل ستر ریال (حجازی روپیہ) چھوڑا تھا۔ مولانا سلیم احمد صاحب کے پاس حاجی صاحب کا ایک تام چینی کا پیکدان ہے جس کو وہ آج کل استعمال کرتے ہیں اور یہ کسی نواب صاحب غالباً نواب محمد یوسف صاحب نے حاجی صاحب کو تحفے میں پیش کیا تھا۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے یہاں کراچی میں جہاں حضرت نانوتویؒ، اور حضرت شیخ الہندؒ، حضرت گنگوہیؒ رحمہم اللہ علیہم کے بالوں اور خطوط کے تبرکات ہیں ان میں حاجی صاحب کے پیراہن کا ایک ٹکڑا بھی ہے، جس میں سے اس ناچیز کے پاس بھی اس کا کچھ حصہ موجود ہے۔

وفات

مگر وہ وقت بھی آپہنچا کہ اس باخدا انسان کی عمر کا جام لبریز ہوگیا اور آپ ۱۲؍ یا ۱۳؍ جمادی الاخری ۱۳۱۷ھ کو بروز بدھ صبح کی اذان کے وقت چوراسی سال تین ماہ بیس دن کی عمر میں محبوب حقیقی سے جا ملے اور جنت المعلیٰ مقبرہ اہل مکہ میں (جہاں حضرت خدیجہؓ کا مزار ہے) مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مہاجر مکی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تقریباً چوالیس سال آپ ہندوستان میں رہے اور چالیس سال کی عمر کا حصہ آپ نے بیت اللہ کے پڑوس میں گذار دیا۔ کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاكرام۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

* * *

باب دوم

علمیات

حاجی صاحب کی تصنیفات

ہم نے گذشتہ اوراق میں حاجی صاحب کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ سادہ طور پر حسب ضرورت پیش کیا ہے۔ اسی میں آپ کی علمی لیاقت اور محدود و مختصر تحصیل علم کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ آپ نے اگرچہ علوم وفنون میں فضیلت حاصل نہیں کی تھی لیکن آپ پر علم لدنی کے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔

اس مختصر سی تعلیم کے باوجود آپ نے کئی کتابیں اور رسالے تحریر فرمائے جو آپ کی علمی لیاقت کے آئینہ دار ہیں، یہ تصنیفات اگرچہ مختصر ہیں مگر ان میں مضامین کی رُوح الفاظ کے جسم میں ڈال دی گئی ہے اور ایک ایک جملے میں علماء اور صوفیاء کے لئے حقائق اور معرفت کے خزانے بھر دیئے ہیں تصنیفات حسب ذیل ہیں:

۱......مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی کا حاشیہ فارسی زبان میں۔

۲......ضیاء القلوب بزبان فارسی۔

۳......ارشادِ مرشد (اردو)

۴......وحدۃ الوجود (فارسی)

۵......ہفت مسئلہ (اردو)

۶......گلزارِ معرفت (اردو کلام)

۷.....تحفۃ العشاق (اردو مثنوی)

۸...... جہادِ اکبر (مثنوی اردو)

۹.....غذائے روح (اردو مثنوی)

۱۰......دردنامۂ غمناک (اردو کلام)

۱۱......مکتوبات فارسی و اردو۔

ان سب کے مجموعے کو یک جا جمع کر کے اُس کا نام ''کلیاتِ امدادیہ'' رکھ دیا ہے لیکن جن صاحب نے بھی یہ نام رکھا ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ اس نام سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ یہ حاجی صاحب کے اشعار، غزلیات اور نظموں کا مجموعہ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریس والوں نے غالباً یہ نام دیا ہے۔ الحاصل ہم حاجی صاحب کی تصنیفات پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔

مثنوی مولانا رومی

مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی دُنیا کی مشہور کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ اس کی معنوی بلندی کا حال یہ ہے کہ ؎

شش جہت را نور دہ زیں شش صُحُف   کہ یطوف حلہ من لم یطف
مثنوی مولویِ معنوی   ہست قرآن در زبان پہلوی

اور جہاں تک مثنوی کی ادبی اور لسانی قوت کا اثر ہے اس کے متعلق بعض ادبائے فارسی نے کہا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی ادبی اور لسانی حیثیت سے مستند نہیں کہی جاسکتی، کیوں کہ اس میں زبان کی حیثیت سے کوتاہیاں ہیں۔ لیکن ارواحِ ثلاثہ میں جو امیر الروایات، روایات الطیب، اور اشرف التنبیہات کا مجموعہ ہے مولانا اشرف علی صاحب کی روایت یہ ہے کہ:

حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب قدس سرہ العزیز فرماتے تھے کہ میں نے

> مثنوی کے بارے میں مومن خاں شاعر سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا رومی کا کلام شاعری کی حیثیت سے حجت نہیں۔ مومن خاں نے کہا کہ کسی جاہل کا قول ہوگا کہ ان کا کلام شاعری کی حیثیت سے بھی بہت مستند ہے۔
>
> (ارواحِ ثلاثہ: ص ۱۸۱-۱۸۲)

مثنوی کی تالیف کا سبب

مولانا اشرف علی صاحب امداد المشتاق میں تحریر فرماتے ہیں کہ حاجی صاحب نے فرمایا:

> مولانا روم کے والد اپنے وطن بلخ سے باقصد حج وزیارت مدینہ طیبہ مع مولانا (روم) کے روانہ ہوئے۔ نیشاپور میں مولانا فریدالدین عطار کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مولانا عطار نے ان سے پوچھا کہ کہاں کا عزم ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ''حرمین شریفین کا۔'' شیخ فریدالدین نے فرمایا کہ تمہارے لڑکے کے سینۂ بے کینہ میں دریائے معرفت جوش زن ہے اس کی بہت حفاظت رکھو اور اس سفر میں اس کو ہمراہ نہ لے جاؤ اور اپنی تصنیف الٰہی نامہ مولانا روم کو دے کر فرمایا کہ اس کو دیکھا کرو تمہارے دیکھنے سے اس کو شرف ہوگا۔ مولانا کے والد نے عزم حج فسخ کر کے ملک روم میں شہر قونیہ میں اقامت اختیار کی بخیال تبرک مولانا (رومی) ''الٰہی نامہ'' کو ورد میں رکھتے تھے۔ اسی طرز پر مثنوی تحریر فرمائی اور مولانا عطار کی تعریف میں 'ہفت شہر عشق عطار'' الخ کہا۔ (حاجی صاحب نے) فرمایا کہ جو نعمت مولانا روم کو حاصل تھی اگر تمام عمر کی جانفشانی سے بھی حاصل ہو اس کا شکریہ قیامت تک ادا ہونا دشوار ہے..... فرمایا (یعنی حاجی صاحب نے) کہا مولانا روم کہیں تشریف لے جاتے تھے اور جماعت طلبہ ہمرکاب تھی مولانا شمس تبریز نے آپ کی سواری کی باگ پکڑ کے پوچھا کہ حضرت بایزید بسطامی تومَا اَعْظَمَ شَانِی (میری شان کیا بلند ہے) کا

دَم بھرتے ہیں اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ (ہم نے تجھے معرفت کے حق کی طرح نہیں پہچانا) وردِ فرماتے ہیں۔ پس افضل کون ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ عالی رکھتے تھے لہٰذا باوجود کمالِ معرفت کے مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ فرماتے تھے اور حضرت بایزید بسطامی بباعث کم حوصلگی ونقصانِ ہمت کے نعرہٴ مَاأَعْظَمَ شَانِي کا مارتے تھے، پس افضل وہی ہے کہ ہمت عالی وحوصلہ بلند رکھتا ہے، یہ سُن کر حضرت شمس تبریز نے شادان وفرحاں ہوکر ایک چیخ ماری، اس چیخ نے مولانا روم کا مطلب پورا کردیا اور مولانا شمس تبریز کا عاشق بنادیا۔ اس کے بعد حضرت شمس تبریز غائب ہوگئے، مولانا کو آپ کے عشق کا غلبہ ہو چکا تھا لہٰذا بہت پریشان ہوکر آپ کے متلاشی ہوئے۔ چونکہ حضرت شمس تبریز طریقہٴ ملامتیہ رکھتے تھے اس وجہ سے گانے والوں کے ساتھ رہا کرتے تھے، مولانا روم کو ایک جگہ پتہ ملا کہ مولانا شمس تبریز ایک جگہ نَے (بانسری) بجارہے ہیں۔ یہ سن کر وہاں پہنچے اور حضرت سے لپٹ گئے۔ حضرت شمس صاحب اس وقت اپنے گانے بجانے میں مست تھے جب ہوش آیا تو دیکھا کہ مولانا روم حاضر ہیں۔ اسی وقت ان کے کان میں نَے رکھ کر بجادیا اور خود پھر غائب ہوگئے، مولانا روم نے اوّل مثنوی میں اسی نَے کا حال بیان کیا ہے۔

بشنو از نَے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

حاجی صاحبؒ کا مثنوی پر حاشیہ

مولانا روم کی یہ مثنوی چھ دفتروں میں ہے اس پر حاجی صاحب نے فارسی زبان میں حواشی لکھے ہیں۔ اگر حواشی کا پوری تحقیق اور احتیاط سے مطالعہ کیا جائے تو حاجی صاحب کے علوم اور معارف کا اندازہ اس سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ آپ ہی اندازہ کیجئے کہ مثنوی کا حاشیہ

کوئی معمولی کھیل نہیں ہے۔ حاجی صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ایک خط میں اپنے ان حواشی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

> فقیر کی مثنوی شریف جو بعض حواشی وفوائد سے اپنی سمجھ کے مطابق محشی ہے عزیزم مولوی عبداللہ صاحب بواسطہ مولوی ابواحمد صاحب باستبداد واصرار اشد بغرض طبع لے گئے تھے اور مشہور کر دیا ہے کہ فقیر نے خواہش اس کے طبع کی کی ہے، فقیر حیران ہے کہ اول تو وہ حواشی اور فوائد کچھ ایسے قابل نہیں خیال کئے جاتے تس پر طرہ یہ کہ فقیر کی خواہش ہے۔ (مکاتیب رشیدیہ ص ۵)

حاجی صاحب کے اس مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ آپ نے مثنوی کے حواشی اور فوائد تحریر فرمائے۔ یہ حواشی اس قدر مقبول ہوئے کہ بعد میں آنے والوں نے مثنوی کی شرحوں میں ان سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

حاجی صاحب، علمائے دیوبند اور صوفیاء کا مثنوی سے شغف

علامہ اقبال جن کو مولانا روم کی مثنوی نے کندن بنا دیا اور وہ غائبانہ مولانا روم کے مرید ہو گئے، چنانچہ اپنے آپ کو مرید ہندی اور مولانا کو پیر رومی کے لقب سے بار بار پکارا کرتے ہیں اور اصل مولانا روم کے ہی فیض یافتہ ہیں۔ جن لوگوں کا مطالعہ وسیع نہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت اقبال نے ہی خصوصی طور پر مولانا رومی سے استفادہ کیا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہر دور میں علماء اور صوفیاء کی جماعت نے مثنوی سے بہت کچھ باطنی فیضان حاصل کیا ہے۔ انہیں میں سے ایک حاجی امداد اللہ صاحب ہیں۔ خود حاجی صاحب فرماتے ہیں:

> جو کچھ مثنوی میں ہے اس کی روحانی تعلیم مجھ کو حضرت مولانا روم نے فرمائی ہے۔ (امداد المشتاق ص:۶۱)

> میں نے مثنوی شریف تین بار حضرت مولانا عبدالرزاق جھنجھانوی پر عرض کی اور بعض مقامات کی تحقیق مولوی ابوالحسن کاندھلوی سے کی۔ (امداد، ص:۶۳)

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پڑھی نہیں، بلکہ جو کچھ اس کے معانی حاجی صاحب پر منکشف ہوئے تھے وہ مولانا جھنجھانوی پر پیش کر کے تصدیق چاہی۔ البتہ بعض مقامات کی تحقیق مولانا ابوالحسن کاندھلوی سے کی۔

حاجی صاحب کا درسِ مثنوی

نہ صرف یہ کہ حاجی صاحب مثنوی کا مطالعہ فرماتے، بلکہ اس کا درس بھی دیتے تھے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا کہ:

> ایک دفعہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں مثنوی کا درس ہو رہا تھا اور جلسہ عجیب جوش وخروش سے پُر تھا اس روز حضرت نے پکار کر یوں دُعا فرمائی۔
>
> اے اللہ ہم لوگوں کو بھی ایک ذرۂ محبت عطا فرما، آمین۔
>
> پھر دُعا کے بعد فرمایا کہ الحمد للہ ہم سب کو عطا ہو گیا۔ پھر دوسرے جلسے میں فرمایا کہ بھائی ذرے سے زیادہ کا تحمل بھی نہیں ہوسکتا۔
>
> یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں
> یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم
>
> ارواحِ ثلاثہ ص: ۱۸۵

حاجی صاحب کا مثنوی سے اس قدر شغف تھا کہ سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں:

> فقیر نے اپنی عادت کرلی ہے کہ سفر وحضر میں کلام اللہ شریف، دلائل الخیرات، مثنوی معنوی حضرت مولانا کو ضرور پاس رکھتا ہوں...... اور کوئی کتاب حدیث کی خواہ مشکوٰۃ ہی کیوں نہ ہو اور ایک رسالہ فقہ اگرچہ مالا بد منہ ہو اور کیمیائے سعادت امام غزالی قدس سرہ بھی لوازم سفر پر زیادہ کرتا ہوں۔ (امداد: ص:۳۶-۳۷)

مثنوی کا کشفی درس

یوں تو بعض اہل علم مثنوی کو اپنے علم کے زور پر پڑھاتے ہیں لیکن صحیح معنی میں اُس کا درس وہی دے سکتا ہے جس پر سلوک کے مراتب ختم ہو گئے ہوں اور کشف سے اس کو پورا حصہ نصیب ہوا ہو۔ حاجی صاحب پر مثنوی کے راز بستہ کھلتے تھے۔ مولانا اشرف علی صاحب نے فرمایا:

> حاجی مرتضٰی خاں لکھنوی کہتے تھے کہ ایک عالم نے جو کہ اپنے شیخ سے مثنوی پڑھے ہوئے تھے حضرت حاجی صاحب کے یہاں مثنوی آ کر شروع کی۔ ان سے ایک روز میں نے پوچھا کہ تم نے حضرت حاجی صاحب کی پڑھائی میں اور اپنے مرشد شیخ کی پڑھائی میں کیا فرق دیکھا...... انہوں نے کہا کہ تم ایک مثال سے سمجھو کہ جیسے ایک مکان نہایت شاندار ہے اور ہر طرح سے آراستہ و پیراستہ اور ہر قسم کے فرنیچر سے بھرا ہوا ہے۔ ایک شخص تو وہ ہے کہ کسی کو اس کے دروازے پر لے جا کر کھڑا کر دیا اور اس کا تمام نقشہ ایسا بیان کر دیا کہ کوئی چیز نہ چھوڑی اور ایک شخص وہ ہے کہ جس نے زیادہ بیان تو نہیں کیا لیکن دروازے سے اندر لے جا کر مکان کے بیچ میں کھڑا کر دیا اس طرح کہ سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لے۔ حاجی صاحب کا پڑھانا تو ایسا ہی ہے کہ مجھے اندر لے جا کر کھڑا کر دیا اور میرے شیخ کا پڑھانا ایسا ہے جیسا کہ باہر سے پورا نقشہ بتا دیا۔
>
> (ارواحِ ثلاثہ، ص: ۱۸۴)

خود مولانا اشرف علی صاحب جب مکہ معظمہ پہنچے تو لکھتے ہیں کہ میں اپنے ساتھ مثنوی لے گیا کہ حضرت حاجی صاحب کے درس میں شامل ہوا کروں گا۔ چنانچہ حضرت تھانوی نے وہاں پہنچ کر حاجی صاحب کے حلقۂ درس مثنوی میں شمولیت کی اور استفادہ کیا۔ آپ ہی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ جب (حاجی صاحب کے درس میں) مثنوی شریف ختم ہوگئی تو

گیارہ گیارہ بار سورۂ اخلاص پڑھ کر نیاز کی گئی اور شربت بٹنا شروع ہوا۔ آپ (حاجی صاحب) نے فرمایا کہ نیاز کے دو معنی ہیں ایک عجز و بندگی اور وہ سوائے خدا کے دوسرے کے واسطے نہیں ہے، بلکہ ناجائز، شرک ہے اور دوسرے خدا کی نذر اور ثواب خدا کے بندوں کو پہنچانا یہ جائز ہے۔

حاجی صاحب پر مثنوی کا راز فاش ہونے کی شہرت دور دور تھی، چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا اور یہ ۱۳۱۱ھ کی بات ہے کہ ایک سال یاد ہوئے کہ مصر سے ایک پاشا آیا اس کو مجھ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ رات کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تھا صبح کو کئی بار شیخ الحارہ کے ذریعے سے میرے مکان پر دریافت کرایا کہ شیخ بالا خانے سے اترے یا نہیں۔ میرے نیچے آتے ہی وہ بھی ہمرکابی شیخ الحارہ آئے۔ لباس شاہی میں فقیر کامل تھے۔ مجھ سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ حضرت مولانا روم کے خاندان میں بیعت رکھتے تھے۔ چند اشعار مثنوی معنوی کا مطلب مجھ سے دریافت کیا اور بعد دریافت مطلب بہت مسرور ہوئے اور ان کو زیادہ عقیدت ہوگئی۔ (امداد ص ۱۲۷-۱۲۸)

یہاں تک تفصیل سے لکھنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم یہ ظاہر کر دیں کہ مثنوی مولانا روم کی تعلیم حاصل کرنے اور اس کو پڑھانے کا شغف حاجی صاحب کو بہت زیادہ تھا اور مثنوی کے علوم ومعارف حاجی صاحب پر منکشف تھے اس لئے آپ نے چھ دفتروں کے حواشی اور فوائد فارسی زبان میں لکھے۔ اپنے مکتوب بنام مولانا رشید احمد صاحب میں حاجی صاحب نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق اس کے حواشی اور فوائد لکھے ہیں۔ اور اس جملے میں حاجی صاحب نے ایک گہرے راز کو کھولا ہے اور وہ یہی ہے کہ ان پر مولانا روم کے معانی فاش ہوگئے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک پہلی عبارت میں یہ بھی پڑھا ہے کہ حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مثنوی خود مولانا روم سے پڑھی۔

حاجی صاحب نے مثنوی کے سمندر کی گہرائی میں غوطہ مار کر موتی چنے ہیں اور میرے

نزدیک ڈاکٹر اقبال نے بھی مولانا روم سے استفادہ کیا ہے لیکن وہ پانی کی سطح پر تیرتے رہے ہیں۔

غرض کہ حاجی صاحب کی تصانیف میں یہ حاشیہ ایک بڑا کارنامہ ہے جس کی حقیقت اس کے مطالعہ سے اہل باطن پر زیادہ اور اہل ظاہر پر کم منکشف ہو سکتی ہے۔

تفصیلات حاشیہ پر مزید تحقیقی نظر

اب ہم حاجی صاحب کے حاشیہ کے متعلق تجزیہ اور تحقیق کو کام میں لا کر قاری کے سامنے ایک واضح حقیقت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے گذشتہ اوراق میں پڑھا ہے کہ حاجی صاحب کو مثنوی کے مطالعہ اور درس وتدریس سے بہت زیادہ شغف تھا۔۔

مکہ معظمہ میں یا قیام ہند میں آپ کا درس مثنوی مشہور تھا۔ اثنائے درس میں حاجی صاحب اپنی یادداشت اور تحقیقات کے طور پر اشعار کا مطلب اپنی اس مثنوی میں تحریر فرماتے جو آپ کے زیر مطالعہ رہتی تھی، ہوتے ہوتے بہت سے اشعار کے مطالب آپ نے اپنی کتاب میں اپنے خیال کے مطابق تحریر فرمائے۔ چونکہ آپ درس دیتے تھے اس لئے مختلف شارحین مثنوی کی شرحیں آپ کے مطالعہ سے گذری ہوں گی لیکن آپ کا ہر شعر کے مطلب سے جو شارحین نے بیان کیا اتفاق ہونا ضروری نہ تھا اس لئے ان سے اختلاف رکھتے ہوئے اپنی یادداشتیں لکھتے چلے گئے اور یہ ایک اچھا خاصہ گاہ گاہ کے حاشیہ نویسی کا کام ایک مختصر سی شرح کی صورت اختیار کر گیا۔ ان سب حقیقتوں کا انکشاف آپ کے مکتوب بنام مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس مکتوب کا مطالعہ کیجئے۔ لکھتے ہیں:

> "فقیر کی مثنوی شریف (یعنی وہ نسخہ جو آپ کا مملوکہ تھا) جو بعض حواشی وفوائد سے اپنی سمجھ کے مطابق محشی ہے، عزیزم مولوی عبداللہ صاحب بواسطہ مولوی ابواحمد صاحب باستبداد واصرار اشد بغرض طبع لے گئے تھے۔"

اس عبارت سے حاجی صاحب کی زیرِ مطالعہ مثنوی پر اپنی سمجھ کے مطابق نہ کہ دوسرے شارحین کے بیان کردہ مطالب کے موافق، سب نہیں بلکہ بعض حواشی وفوائد سے کتاب مذکور کا محشی ہونا ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ حواشی اتنے درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ ان کو طبع کرا دیا جائے۔ لہٰذا اس مقصد کے پیشِ نظر مولوی عبداللہ صاحب نے مولوی ابو احمد کے ذریعہ حاجی صاحب سے یہ نسخہ حاصل کیا اور اس کو چھپوانے کا ارادہ کیا، لیکن جب بظاہر طبع ہونے میں دیر ہوئی یا حاجی صاحب کو تاخیر کے باعث بے اعتمادی نظر آئی اور محنت کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا تو حضرت مولانا رشید احمد صاحب کو جن پر آپ کو بہر طور اعتماد تھا آپ نے تحریر فرمایا:

> ”تاہم آج تک آٹھ دس ماہ سے کچھ اس کا ایک جز بھی درست نہیں کیا۔ فقیر نے ان کو خط ممانعت کئی بار تحریر کرائے وہ ابھی تک اس کام سے باز نہ آئے۔ آپ کو متصدع ہوں کہ کسی معتبر ذریعہ سے مثنوی شریف محشی فقیر و قلمی ہر دو نسخے مولوی عبداللہ صاحب و مولوی ابو احمد صاحب سے طلب کرا لیں اور بعد میں جیسی رائے آپ کی ہوگی انشاء اللہ ویسا ہوگا۔ یہ تحریر فقیر کی دکھا کر مثنوی شریف منگوا لی جاوے۔“ فقط از مکہ مکرمہ ۲۳؍ رمضان شریف ۱۳۱۰ھ (مہر)

خط کی بقیہ عبارت سے مزید معلومات آپ کے سامنے ہیں کہ مولوی عبداللہ صاحب نے آٹھ دس ماہ سے کتاب لے کر کتاب کے کسی جز کی تصحیح میں تغافل شعاری اختیار کی ہے۔

خط کی مزید مذکورہ عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے پاس ایک مطبوعہ مثنوی تھی جس پر آپ نے اپنے حواشی وفوائد تحریر فرمائے تھے اور دوسری قلمی مثنوی تھی یہ دونوں ہی مولوی عبداللہ صاحب لے گئے تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب کہاں چھپوانا چاہتے تھے اس کی مزید تفصیلات ایک دوسرے خط میں جو حاجی صاحب نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو ۱۰؍ رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ کو مکہ مکرمہ سے تحریر فرمایا ہے، موجود ہیں، لکھتے ہیں:

> ’’مطلب ضروری ہے کہ فقیر کی وہ مثنوی شریف جو ایک زمانہ سے فقیر کے مطالعہ ودرس میں تھی اور اپنے خیال کے موافق اس پر کچھ مطالب وفوائد درج کئے تھے اس دفعہ اس مثنوی کو مولوی عبداللہ صاحب انبیٹھوی بوسیلہ مولوی ابواحمد صاحب بمبئی کے طبع کرانے کی غرض سے فقیر سے لے گئے۔ ان کی تلون مزاجی وغیر استقامت سے اوّل ہی سے فقیر کو معلوم تھا کہ اس کا انجام ان کے حوصلہ وحالت سے باہر ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ پانچ چھ مہینے سے حاجی عبدالکریم صاحب سیٹھ بمبئی کو جو ایک دیندار اور صالح اور معتبر شخص ہیں اس مثنوی کے لاحاصل شغل کی وجہ سے سخت تشویش وزیر باری میں ڈال رکھا ہے۔ وہ تنہا اپنی تجارت کے کام میں مشغول ہیں۔ اس میں مشغول ہونے سے ان کی تجارت کا سخت حرج ونقصان ہے۔ اس لئے فقیر نے سیٹھ صاحب کو لکھ بھیجا ہے کہ مثنوی کا طبع ہونا قطعاً موقوف کر کے فقیر کی دونوں مثنوی آپ کی خدمت میں مقام گنگوہ پہنچا دیں۔ لیکن معلوم یہ ہوا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب ومولوی ابواحمد صاحب مقام سہارنپور میں شاید اسی غرض سے قیام پذیر ہیں۔ اسی لئے آپ بذریعہ حافظ قمرالدین صاحب یا کسی اور معتبر شخص کے ذریعہ سے فقیر کی مثنوی کو سہارنپور سے اپنے پاس منگوا کر رکھ لیں۔ اس بارے میں توقف نہ فرمائیں (ایک) خط بنام مولوی عبداللہ صاحب ومولوی ابواحمد صاحب بھی جاتا ہے۔ آپ دونوں خط پڑھنے کے مجاز ہیں۔ (مہر) از مکہ معظمہ، دہم رمضان المبارک روز دوشنبہ ۱۳۱۰ھ (مکاتیب رشیدیہ ص: ۹-۱۰)

اس مکتوب سے حاشیہ مثنوی کی تحقیق کا ایک ایک گوشہ اُجاگر ہو جاتا ہے اور حسب ذیل امور کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

اوّل یہ کہ حاجی صاحب نے اپنی زیر مطالعہ مثنوی پر کچھ مطالب درج کئے تھے اس کو

مولوی عبداللہ صاحب لے گئے۔ یہ صاحب انبیٹھ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے حاجی صاحب سے بذریعہ مولوی ابواحمد اصرار کر کے محشی مثنوی حاصل کی۔ مولوی ابواحمد صاحب بمبئی کے سیٹھ حاجی عبدالکریم کے سرمائے سے حاجی صاحب کی محشی مثنوی چھپوانا چاہتے ہیں۔ چونکہ سیٹھ صاحب کی تجارت کو اس طرف توجہ کرنے سے نقصان پہنچ رہا تھا اس لئے حضرت نے یہ بات گوارا نہ فرمائی۔ غالباً سیٹھ صاحب بھی حاجی صاحب کے مرید معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حق پرست پیروں کی شان یہ ہے کہ وہ خود غرضی سے بالاتر ہوتے ہیں۔

حاجی صاحب نے اپنے اس مکتوب میں مولوی عبداللہ صاحب کی تلون مزاجی غیر استقامت کا شکوہ فرمایا ہے۔ بہر حال ان دونوں خطوط سے مثنوی کے حاشئے اور اس کی طباعت میں حاجی صاحب کے متوسلین کی سرگرمیاں ظاہر ہیں اور اشتیاق طباعت واضح ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب کے مکاتیب میں افسوس کہ کوئی خط ایسا نہیں ملا جس سے معلوم ہو کہ انہوں نے حاجی صاحب کے گرامی نامہ کا کیا جواب دیا۔ اور اس کا کیا ردِ عمل ہوا۔ البتہ حاجی صاحب نے مولانا رشید احمد صاحب کو ۲۳ر جمادی الاخریٰ ۱۳۱۱ھ کو جو مکتوب تحریر فرمایا ہے اور جو مکاتیب رشیدیہ میں ساتواں خط ہے اس میں یہ جملہ بھی ہے۔

> ”آپ کا خط متضمن حالات مولوی عبداللہ صاحب پہنچا تھا۔ اس کا جواب بسبیل ڈاک قبل اس کے بھیجدیا گیا۔ فقط“ (مکتوباتِ رشیدیہ ص:۹)

لیکن حضرت گنگوہی نے حاجی صاحب کو مولوی عبداللہ صاحب کے حالات کیا لکھے تھے کہیں درج نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مولوی عبداللہ وہی زیر بحث شخصیت ہیں۔ یہاں تک حاشئے کا حال معلوم ہونے کے بعد مزید حقیقت کا انکشاف نہیں ہوتا کہ مولوی عبداللہ صاحب کی کوششوں نے کیا صورت اختیار کی۔

حاجی صاحبؒ کا خط مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے نام اور مثنوی کی طباعت اور حاشیہ

ان تحقیقات کے بعد امداد المشتاق کے اس حصے میں جو مرقومات امدادیہ کے نام سے موسوم ہے اور جس میں حاجی صاحب کے خطوط مختلف حضرات کے نام ہیں، ایک خط مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ کے نام ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

> تحریر سے مولوی محمد یعقوب کی معلوم ہوا کہ منشی صاحب نے اس فقیر کی عرض کی سبب مثنوی کے طبع کا قصد کیا ہے۔ چنانچہ مولوی (محمد یعقوب) صاحب نے دفتر ثانی سے اس کا تحشیہ شروع کیا ہے اس وجہ سے بہت خوش ہوا کہ مجھ کو مثنوی شریف سے محبت ہے۔ اگر آں عزیز بھی تحشیہ اور اس کی صحت میں شریک ہوں تو بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امید ہے کہ آں عزیز کے شریک ہونے کی صورت میں مثنوی بہت اچھی طبع ہوگی۔" (مرقوماتِ امدادیہ ص: ۲۴۳-۲۴۴)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب نے منشی ممتاز علی صاحب میرٹھی مالک مطبع سے مثنوی چھاپنے کی فرمائش کی تھی اور انہوں نے اس کے طبع کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ نیز مولانا محمد یعقوب صاحب نے مثنوی کے دوسرے دفتر سے حاشیہ کرنا اور لکھنا شروع فرمادیا تھا۔

یہاں صرف اتنا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حاجی صاحب کے حاشئے کا اس سے کچھ تعلق ہے یا نہیں قابلِ تحقیق ہے۔ ایسا پتہ چلتا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب کی کوششوں سے پہلی بھی مثنوی کے نسخے کی صحیح طباعت اور حاشئے کے کام کی تحریک حاجی صاحب کی طرف سے اپنے متوسلین کو ہوتی رہی ہے۔ غالباً حاجی صاحب نے اس وقت پہلے دفتر کا حاشیہ لکھا ہوگا اور اس کے پیش نظر مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے دوسرے دفتر سے حاشیہ لکھنے کا خیال ظاہر کیا ہوگا، کیوں کہ پہلے دفتر پر حاجی صاحب کے حاشئے کو کافی سمجھا گیا ہوگا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا محمد یعقوب صاحب دونوں منشی ممتاز علی میرٹھی

کے کتب خانے میں کتابوں کی تصحیح کے کام پر مامور ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب نے اسی خط میں مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے بھتیجے احمد حسین کے متعلق لکھا ہے:

> ”نیز قبول نہ کرنا عزیز حافظ احمد حسین کا مطبع کے تعلق کو سبب قلت تنخواہ کے معلوم ہوا...... اس علاقہ (تعلق مطبع) میں مطبع کے چند فائدے میں نے سمجھے تھے۔ اوّل یہ کہ صلحا کا مجمع ہے خصوصاً آں عزیز اور عزیزم مولوی محمد یعقوب کی صحبت تھی۔“ (مرقومات ص:۲۴۳)

تحشیۂ مثنوی از مولانا محمد یعقوب صاحب

ایک اور خط جو حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو لکھا ہے مذکورہ بالا خط کے مضمون کی تائید کرتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”بخدمت بابرکت عزیزم مولوی محمد یعقوب صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد سلام مسنون شوق مشحون ومواصلت جسمانی واضح باد۔ مکتوب محبت وعقیدت اسلوب مع خط عزیزم حافظ احمد حسین سلمہ مورخہ ۲۷ر ذیقعدہ در آخر محرم رسیدہ مسرت ساخت واز حال مندرجہ اش آگاہی بخشید معلوم شد کہ عزیز احمد حسین علاقہ مطبع بہ سبب قلت تنخواہ قبول نہ کرد بہتر نہ نمود۔ اگر برآں قناعت کردے خدا تعالیٰ دراں برکت دادے۔ خیر اختیار اوست۔ وہم از دریافت قصد طبع مثنوی شریف وکمر ہمت بستن آں عزیز در مقدمہ صحت وتحشیۂ آں ازیں بسیار فرحت رو داد۔ اللہ تعالیٰ سعی آں عزیز را مشکور ومقبول کناد وبحسن وخوبی باختتام رساناد آمین۔
>
> باید کہ دریں امر سست نشوند، وہمت را کار فرمایند، خدائے تعالیٰ حامی ومددگار است، وایں مدبر را ہم از دُعا شریک دانند۔ وباید دانست کہ بجز حل مطلب از طولانی حاشیہ بہ پرہیزند، ونیز بعض یک لغت را معنی بسیار باشد فقط معنی مراد یہ

> مولانا دیگر نہ نویسند کہ تحریر طویل خواہد شد، بلکہ لغت را اعراب باید داد وحاجت ترکیب نام نیست۔ ومعنی لغت تحت لغت یا در سفیدی نظم نوشتہ شوند مناسب معلوم شود۔ ودریں دو فائدہ است، یکی زینت نظم است، دویم آنکہ گنجائش بر حاشیۂ برائے تحشیہ حل مطالب خواہد شد۔ آئندہ ہر چہ مناسب دانند بعمل آرند مگر بمقدور خود ہیچ دقیقہ فرو نگذارند۔ ونیز اختتام مثنوی شریف تصنیف مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم از نزد مولوی نور الحسن صاحب طلبیدہ ضرور شریک کردہ طبع نمایند، تا کہ کتاب کامل شود۔ ونیز بزبانی مولوی محب اللہ صاحب معلوم شد کہ عبدالرحمٰن صاحب مصالحہ مثنوی یعنی شروح وغیرہ بسیار خوب جمع کردہ بودند، وبلکہ دفتر اوّل بہ تحشیہ وصحت کنانیدہ اند، بہ سبب بعضی امور در طبع توقف شد اگر ممکن باشد آں مصالح را از مطبع میاں عبدالرحمٰن طلبیدہ بکار برند واگر طلبیدہ شد بہتر شد، وقتیکہ طبع شروع خواہد شد فقیر را ہم اطلاع باید کرد......" (مرقوماتِ امدادیہ ص: ۲۴۴-۲۴۵-۲۴۸)

یہ مکتوب واضح کرتا ہے کہ مستقل طور پر مثنوی کی صحت اور حاشئے کا کام مولانا محمد یعقوب صاحب نے سنبھالا معلوم ہوتا ہے۔ مولانا محمد یعقوب صاحب جو مولانا مملوک علی صاحب صدرِ شعبۂ علوم وفنون مشرقیہ دہلی کالج، کے صاحبزادہ تھے خود زبردست عالم وعارف اور حاجی صاحب کے مرید اور خلیفۂ مجاز تھے۔ مثنوی کے معارف اور مضامین پر کامل دسترس رکھتے تھے۔ حاجی صاحب مسرور نظر آتے ہیں کہ مثنوی کی طباعت، صحت اور حاشیہ کا کام ایک دانشمند کامل کے ذریعہ انجام پا کر ایک زبردست شاہکار کی شکل میں جلوہ آرا ہوگا۔ اس جذبۂ بے اختیار شوق میں حاجی صاحب نے حاشیہ نویسی کے لئے جو ہدایات مولانا کو دی ہیں وہ بجائے خود بصیرت افروز ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اس عظیم الشان کام میں ہمت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ مطالب مثنوی کے حل کرنے میں

طوالت سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ طوالت قاری پر اچھے اثرات پیدا نہیں کرتی، پھر یہ کہ مولانا جلال الدین رومی کے منشا کو حاشیہ نویسی میں پیش نظر رکھا جائے۔ الفاظ پر اعراب (زبر، زیر، پیش) لگا کر مختصر کام کیا جائے اور حرکات وسکنات الفاظ کو بقید عبارت ظاہر نہ کیا جائے کہ اس میں بھی طوالت ہے۔ الفاظ کے نیچے یا سفیدی نظم میں لکھ کر خوبصورتی کا خیال رکھا جائے۔

مثنوی کی تکمیل اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کا کارنامہ

حاجی صاحب کے مذکورہ بالا خط میں جہاں مثنوی کی طباعت اور حاشئے کا ذکر ہے وہاں ایک اور حقیقت کا بھی انکشاف کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ مولانا روم نے مثنوی کا چھٹا دفتر جہاں ختم کیا ہے وہاں مضمون پورا نہیں ہوسکا، بلکہ ادھورا رہ گیا ہے۔ ایک بادشاہ کے تین شہزادوں کا ذکر چل رہا تھا۔ تیسرے شہزادے کا قصہ باقی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کا چھٹا دفتر نامکمل رہ گیا ہے، چنانچہ چھٹے دفتر کا آخری عنوان اور اس کے ماتحت چند اشعار رہنمائی کے لئے حسب ذیل ہیں:

”مثل وصیت کردن آں شخص کہ سہ پسر داشت ومیراث خود را بہ کاہل ترین پسر دادو بہ قاضی ونیز بگفت۔“

آں یکے شخصی بوقت مرگ خویش　　گفتہ بد اند وصیت بیش بیش
سہ پسر بودش چو سہ سرد رواں　　وقف ایشاں کردہ او جان وروان
گفت ہر چہ کالہ وسیم وزر است　　آں بروزیں ہر سہ کو کاہل تر است
گفت با قاضی وبس اندرز کرد　　بعد ازاں جام شراب مرگ خورد

ایک باپ نے اپنے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ کاہل بیٹے کے لئے اپنی تمام میراث دینے کی وصیت کی اور پھر مر گیا۔ قاضی شہر کو باپ نے فہمائش کر دی تھی۔ اب قاضی کا یہ فرض تھا کہ وہ یہ معلوم کرے کہ ان بیٹوں میں سب سے زیادہ کاہل کون ہے کیوں کہ باپ

نے اس حقیقت کا انکشاف قاضی کے روبرو نہیں کیا تھا۔ قاضی نے تینوں بیٹوں سے ان کی کاہلی کا حال دریافت کیا۔ مولانا روم لکھتے ہیں:

گفت قاضی ہر یکے با عاقلیش تا بگوید قصۂ از کاہلیش
مہترین را گفت قاضی باز گو قصہ از کاہل ای مال جو

قاضی نے بڑے بیٹے سے اس کی کاہلی کا حال دریافت کیا۔ بعدازاں دوسرے بیٹے سے اس کی کاہلی کی حقیقت معلوم کی۔ اس کے بعد پھر ''ماں اور بچے'' کی ایک مثل بیان کرتے کرتے چھٹے دفتر کو حسب ذیل شعر پر ختم کر دیا ہے ۔

چوں فتاد از روزنِ دِل آفتاب ختم شد واللہ اعلم بالصواب

مگر تیسرے بیٹے کا کوئی حال اس دفتر میں نہیں ہے جس سے چھٹے دفتر کا مضمون تشنہ تکمیل رِہ گیا ہے۔ لیکن چھٹے دفتر کے آخر میں مولانا رومی کے صاحبزادے سلطان ولد مولانا بہاؤالدین نے خاتمے کے اشعار لکھ کر چھٹے دفتر کو ختم اور بند کر دیا۔ مثنوی کے چھٹے دفتر کے خاتمہ کا عنوان یہ ہے اور اس کے اشعار حسب ذیل ہیں:

''خاتمہ لولدہ المعارف الکامل المحقق مولانا بہاء الملۃ والدین۔ قدس سرّہٗ

مدتی زیں مثنوی چوں والدم شد خمش گفتم دراکای زندہ ام
ازچہ رو دیگر نمی گوئی سخن بہرچہ بستی درعلم لُدن
قصۂ شہزادگاں نامد بسر ماند ناُگفتہ دُر سو میں پسر

مولانا روم کے صاحبزادے نے والد محترم سے عرض کیا کہ عرصہ سے آپ مثنوی لکھنے سے خموش ہیں۔ آپ نے علم لدنی کے دروازے کو بند کر رکھا ہے۔ ابھی تیسرے شہزادے کا قصہ بھی ختم نہیں ہوا۔ اس کو سُن کر مولانا روم نے صاحبزادے سے فرمایا ۔

گفت نطقم چوں شترزیں پس بخفت نیستش باہیچ کس تا حشر گفت
ہست باقی شرح ایں لیکن دروں بستہ شد دیگر نمی آید بروں

ہمچو اشتر ناطقہ ایں جا بخفت　　او بگوید من دہاں بستم زگفت
وقت رحلت آمد وجستن زجو　　كُـلُّ شـىءٍ هـالك اِلا وَجهـه
باقی ایں گفتہ آید بی زباں　　در دِل آنکس کہ دارد زندہ جاں
گفتگو آخر رسید و عمر ہم　　مژدہ آمد وقت آں کزتن ہم

مولانا روم نے ان اشعار میں یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اب دِل کا دروازہ بند ہو چکا ہے کچھ آگے کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس نے مجھے زبان بند کرنے کو کہا اور میں نے زبان بند کرلی ہے۔ اب آخری سفر قریب ہے اور خدائے ذوالجلال کے سوا سب کو فنا ہے۔ باقی مثنوی کا مضمون اس بے زبان شخص کے دِل میں آئے گا جو زندہ دِل اور زندہ جان رکھتا ہوگا آگے کے اشعار میں مولانا روم کی گفتگو کو صاحبزادہ صاحب اپنے اشعار میں ذکر کرتے چلے گئے ہیں اور بالآخر والد رومی فرزند عزیز سے کہتے ہیں کہ اب ساتویں دفتر اور خاتمہ کا ذکر چھوڑو البتہ یہ سنو۔

پائے ہمت بر خور وبر ماہ نہ　　سربراں ایوان وآں درگاہ نہ
ایں خودی را خرج کن اندر خدا　　تانمانی ہمچو ابلیسے جدا
آب جاں را ریز اندر بحرجاں　　تاشوی دریای بے حد وکراں
قصہ کو تہ کن کہ رفتم در حجاب
ہیں خمش واللہ اعلم بالصواب

یہ مثنوی کے خاتمے کے اشعار حضرت رومی کے صاحبزادے کی زبانی والد کی ترجمانی میں ہیں جن میں قصہ کوتاہ کر کے مولانا روم نے دُنیا سے حجاب اور روپوشی اختیار کرلی اور صاحبزادہ صاحب نے پھر مثنوی کے متعلق اس طرح فرمایا۔

شکر ایں نامہ بعنوانی رسید　　کم نہ شد نقد وباخوانی رسید
نردبان آسمان است ایں کلام　　ہر کہ از ایں بر رود آید ببام

نی بہام چرخ کاں اخضر بود　　　بل بہامی کز فلک برتر بود
گام گردوں را از وآید نوا
گردشش باشد ہمیشہ زاں ہوا

اس شعر پر مثنوی کا خاتمہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مثنوی نامکمل رہ گئی۔ حاجی امداد اللہ صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کے مذکورہ خط میں مثنوی کی عدم تکمیل کے متعلق لکھ کر اسی حقیقت سے نقاب اٹھایا ہے اور تحریر فرمایا ہے:

''ونیز اختتام مثنوی شریف تصنیف مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم از نزد مولوی نور الحسن صاحب طلبیدہ ضرور شریک کردہ طبع نمایند تا کہ کتاب کامل شود۔''

خدا کی قدرت دیکھئے کہ مثنوی کی تکمیل کا قرعۂ فال مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی ضلع مظفر نگر یو۔ پی کے نام نکلا اور مولانا رومی کے اس شعر کے مطابق۔

باقی ایں گفتہ آید بے زباں
درد دل آنکس کہ دارد زندہ جاں

مفتی صاحب جیسے ''زندہ جاں'' نے مثنوی کا تتمہ لکھ کر مثنوی کو مکمل کیا۔ یہ مفتی الٰہی بخش مرحوم کی وفات کے بعد قلمی شکل میں ان کے حفید (پوتے) مولوی نور الحسن کے پاس چلا آ رہا تھا۔ چنانچہ حاجی صاحب کی فرمائش پر کانپور کے مطبع محمود المطابع میں طبع ہوا۔

مثنوی اس کے تتمے اور خاتمے کے متعلق ہم کہیں سے کہیں نکل گئے مگر اس وادی سے ہمیں گذرنا ناگزیر تھا۔ مضمون کا سلسلہ یہ تھا کہ حاجی صاحب مولانا محمد یعقوب صاحب کے حاشیہ لکھنے پر بہت مسرور ہیں کیوں کہ مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا محمد یعقوب صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب تینوں حضرات علمی اور روحانی طور پر حاجی صاحب کو زیادہ عزیز، ان کے زیادہ معتمد اور زیادہ مشارٌ الیہ تھے۔ مگر مولانا محمد یعقوب صاحب نے مثنوی کا حاشیہ شروع کیا یا نہیں اگر کیا تو کتنا لکھا دُور دُور تک اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ بظاہر حوادثات زمانہ

اور دیگر موانع نے اس عظیم الشان کام سے مولانا کو روک دیا ہوگا تا آنکہ مولانا نانوتوی ۱۲۹۷ھ میں اور مولانا محمد یعقوب صاحب ۱۳۰۲ھ میں خدا کو پیارے ہو گئے۔

حاجی صاحب کا درس مثنوی مکہ محترمہ میں برابر جاری رہتا تھا غالباً اس عرصہ میں مثنوی کے دفتروں پر حاشیہ نویسی اور یادداشتوں کا کام بھی مسلسل رہتا ہوگا اور جب یہ حاشیہ اس قابل ہوگیا ہوگا کہ طبع کرایا جائے تو مولوی عبداللہ صاحب نے ابو احمد کے ذریعہ مکہ معظمہ حج کے لئے جا کر حاصل کرلیا ہوگا۔ پھر ہندوستان آکر سیٹھ عبدالکریم بمبئی والے صاحب کے سرمائے سے چھپوانے کی کوشش کی لیکن حاجی صاحب نے پھر ۱۳۱۰ھ میں مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو متعدد بار لکھ کر اپنی مثنویاں مولوی عبداللہ صاحب سے منگوالی ہوں گی۔ اور بعدازاں یہ مثنویاں انہوں نے حاجی صاحب کو مکہ معظمہ بھیج دی ہوں گی۔ روانگی کس طرح ہوئی اس کی کہیں کوئی تصریح نہیں ملی۔ لیکن یہ ضرور معلوم ہوسکا کہ محشی مثنوی اور قلمی دونوں حاجی صاحب کے پاس پہنچ چکی ہیں جن کی تفصیلات یہ ہیں۔

مولانا احمد حسن صاحب کانپوری ہندوستان کے مشہور علماء میں سے تھے۔ حاجی صاحب سے مثنوی کی طباعت اور اس کے متعلق عرض کیا۔ چنانچہ حاجی صاحب مولانا اشرف علی صاحب کو اپنے مکتوب ۲۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ میں جبکہ وہ کانپور میں ملازم ہیں لکھتے ہیں:

> ’’مولانا احمد حسن صاحب نے مثنوی کے طبع کے لئے بہت اشتیاق ظاہر فرمایا۔ دِل وجان سے چھپائی کے لئے تیار ہیں۔ میں نے بھی ان کو اجازت دے دی ہے۔ وہ انشاء اللہ میری مثنوی لادیں گے آپ بھی اس میں سعی فرمائیے گا۔‘‘ سب بھائی مل کر اس کو چھپوائے گا۔ میں نے اس مثنوی پر بہت محنت کی ہے۔ خدا کرے صحت کے ساتھ بایں ہیئت کذائی چھپ جائے تو انشاء اللہ لوگوں کو بہت نفع ہوگا۔ آپ لوگوں کے لئے باعث ثمرۂ اخروی ہوگا۔ مثنوی کے نسخے کل غلط چھپے ہیں جس سے بالکل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ مقام سمجھنے

> سے رہ جاتا ہے۔ اگر میری حیات میں طبع ہوگئی تو میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا ورنہ مرضی مولیٰ۔ اور یہ اصل نسخہ مثنوی کا میں نے عزیزی احمد حسن صاحب اور آپ کو دیا ہے۔ آپ دونوں صاحب اپنے پاس رکھئے گا خدا برکت دے گا۔'' (مکتوباتِ امدادیہ ص:۱۸)

اس خط سے صاف معلوم ہوا کہ حاجی صاحب نے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کو اپنی محشی مثنوی طبع کرنے کے لئے دے دی۔ مولانا تھانوی سے بھی مدد کی خواہش ظاہر کی اور اپنے تمام مریدین سے بھی۔

نیز یہ بھی تحقیقاً فرمایا کہ مثنوی کے تمام نسخے غلط چھپے ہوئے ہیں۔ یہ بھی کہ میں نے مثنوی پر بہت محنت اٹھائی ہے اور یہ بھی کہ میں نے اپنی محشی مثنوی آپ دونوں کو دیدی ہے۔ بہر حال اب مثنوی مولانا احمد حسن صاحب خود لے آئے ہیں جیسا کہ اوپر کے خط سے واضح ہے۔

حاجی صاحب ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

> ''مثنوی شریف کی نسبت پہلے میں لکھ چکا ہوں۔ اور اب پھر تحریر کرتا ہوں کہ مثنوی شریف عزیزی مولوی احمد حسن صاحب سلمہ اللہ العزیز، بقصد طبع لے جاتے ہیں۔ آپ بھی اس میں ساعی رہئے گا۔ تصحیح اور عمدگی خط کاغذ کا بہت خیال رکھا جائے۔ بالفعل جتنی مثنوی موجود ہیں یک لخت مسخ ہیں۔ اغلاط کثیرہ کی وجہ سے بالکل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ دیکھنے والا غریب حیران رہ جاتا ہے۔ پہلے بھی بہت لوگوں نے اس کے طبع کی درخواست کی تھی مگر بوجہ عدم وثوق میں نے اس کو منظور نہیں کیا تھا۔ اب انشاء اللہ تعالیٰ امید ہے کہ اس کا انتظام طبع پورا پورا ہو جائے گا۔ خدا ایسا ہی کرے۔ آمین

(مکتوباتِ امدادیہ ص:۱۹-۲۰، خط مورخہ ۹/رجب پنجشنبہ ۱۳۱۳ھ از مکہ مکرمہ)

اس خط سے بھی معلوم ہوا کہ مولانا احمد حسن صاحب نے مکہ مکرمہ میں حاجی صاحب کی

محشی مثنوی لے لی ہے۔ نیز یہ بھی کہ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہونا چاہئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سے پہلے مختلف لوگوں نے اس کے طبع کا ارادہ کیا لیکن عدمِ اعتماد کے باعث ان کو اجازت نہیں دی گئی۔ اس سے مولوی عبداللہ صاحب کی طرف بھی اشارہ ہے۔

مولانا احمد حسن صاحب کی کوششیں

بہر حال مولانا احمد حسن صاحب مکہ مکرمہ سے ہندوستان پہنچے اور مثنوی کی طباعت اور اس کے حاشیہ میں مشغول ہو گئے۔ حاجی صاحب کو ان کوششوں کی اطلاع پہنچ رہی ہے چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۹ محرم ۱۳۱۴ھ میں مولانا اشرف علیؒ صاحب کو کانپور لکھتے ہیں:

> ”عزیزی مولوی احمد حسن زاد اللہ عرفانہ مثنوی شریف میں بہت کوشش فرما رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کو مشکور فرمائے اور اس کی جزا پوری پوری مرحمت فرمائے۔ آپ بھی ان کے شریک حال رہئے حتی المقدور ان کا ساتھ دیجئے۔“ (مکتوباتِ امدادیہ ص:۲۱)

ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو تحریر کرتے ہیں:

> ”عزیزی مولوی احمد حسن صاحب زَادَاللّٰہُ شَوْقَہٗ وَ مَحَبَّتَہٗ کی کارگذاری کی خبریں ہر طرف سے آرہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کوشش وسعی بلیغ کو مشکور فرمائے۔ آمین۔ (مکتوباتِ ص:۲۵)

بہر حال مولانا احمد حسن صاحب مثنوی کی طباعت اور حاشیہ کے سلسلے میں سرگرم ہیں اور اس کی خبریں مشہور ہو چکی ہیں۔ ایک اور خط میں مولانا تھانوی کو تحریر فرماتے ہیں:

> ”دربارہ طبع مثنوی شریف آپ و مولوی احمد حسن و مولوی محمد علی کے مشورے پر ہونا مناسب ہے۔“ (مکتوبات ص:۲۶، مورخہ ۲۵ صفر ۱۳۱۴ھ)

مثنوی شریف کا پہلا دفتر چھپ چکا اور اس کا نسخہ حاجی صاحب کو پہنچ گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''عزیزی مولوی احمد حسن صاحب زَادَاللّٰہُ مَحَبَّتَہٗ وَعِرفَانَہٗ اس میں شک نہیں کہ بہت کوشش فرما رہے ہیں، خداوند کریم اپنے فضل وکرم سے ان کی سعی کو مشکور فرمائے۔ اور ان کی ترقی درجات کا مثنوی شریف کو سبب بنائیں آمین۔ پہلا جز اس کا میرے پاس آگیا۔ دیکھ کر نہایت جی خوش ہوا۔ مثنوی شریف جس درجہ کی کتاب تھی عزیزی موصوف نے اس کا پورا حق ادا کیا۔ خداوند کریم اس کو بایں حسن وخوبی تمام کو پہنچائے۔ آمین۔''
>
> (مکتوباتِ امدادیہ ص: ۲۸-۲۹ مورخہ ۱۶/ رجمادی الاولیٰ ۱۳۱۴ھ)

پہلا دفتر طبع ہونے کے بعد حاجی صاحب کو دوسرے دفتر کا انتظار ہے۔ مولانا احمد حسن صاحب کا خط حاجی صاحب کے پاس دیر تک نہیں پہنچا۔ اس لئے مولانا تھانوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''مولوی احمد حسن صاحب زَادَاللّٰہُ مَحَبَّتَہٗ وَعِرفَانَہٗ اور ان کے جمیع متعلقین سے بہت دُعا وسلام کہہ دیجئے گا۔ بہت دِنوں سے کوئی راحت نامہ ان کا نہیں آیا۔'' (مکتوباتِ امدادیہ ص: ۳۰، مورخہ ۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۳۱۴ھ)

ایک اور خط مورخہ ۱۲/ رمضان المبارک ۱۳۱۴ھ روز یکشنبہ میں مکہ مکرمہ سے مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

> ''اور درباب مثنوی شریف کے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نے اس کو بہت پھیلایا ہے۔ خیر خدا انجام فرمادیں۔'' (مکتوبات ص: ۳۲)

حاجی صاحب نے مولانا محمد یعقوب صاحب کو حاشیہ میں طوالت سے بچنے کی تاکید فرمائی تھی۔ مولانا احمد حسن صاحب نے حاشیہ بسط وتفصیل سے لکھنا شروع کیا ہے اس لئے طبع میں دیر ہو رہی ہے۔ حاجی صاحب کو یہ طوالت پسند نہیں۔ تاہم اختتام کے خواہش مند ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی صورت سے زندگی میں جلد چھپ جائے۔

مذکورہ بالا حاجی صاحب کے خطوط مولانا تھانویؒ کو کانپور پہنچتے رہے ہیں جو خط حاجی صاحب کے پاس سے ۱۲؍ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ اور اس کے بعد مولانا تھانوی کے پاس پہنچے ہیں وہ تھانہ بھون پہنچے ہیں کیونکہ اس اثنا میں مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کانپور کی ملازمت کا سلسلہ چھوڑ کر مستقل طور پر خانقاہ امدادیہ میں اپنے وطن تھانہ بھون میں مقیم ہو چکے ہیں چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۱۲؍ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں لکھتے ہیں:

> ”عزیزم مولوی محمد اشرف علی صاحب زاد اللہ عرفانہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ واضح ہو کہ خط آپ کا سنا، احوال سے آگاہی ہوئی۔ بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری وباطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ ومسجد کو از سرِ نو آباد کریں گے۔“ (مکتوبات ص: ۲۳-۲۴)

یہ وہی مسجد پیر محمد والی ہے جس میں حافظ محمد ضامنؒ صاحب، مولانا شیخ محمد صاحبؒ تھانوی اور حاجی صاحب رہا کرتے تھے جس کا نہایت تفصیل سے ذکر آچکا ہے۔ اسی مسجد میں مدرسہ بھی تھا، اسی خانقاہ امدادیہ میں مولانا اشرف علی صاحب نے رشد وہدایت کا نیا باب کھولا ہے۔

حاجی صاحب اپنے ایک اور مکتوب میں ۱۷؍ربیع الآخر ۱۳۱۶ھ کا لکھا ہوا ہے مولانا تھانوی کو لکھتے ہیں:

> ”مولوی احمد حسن صاحب کی سعی حد درجہ کو پہنچ چکی ہے، جلد ثالث کا ابھی تک سامان نہیں ہے۔ پھر پندرہ سو روپیہ قرض بھی ہو گیا ہے۔“ (مکتوبات ص: ۳۸)

اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ حاجی صاحب کی زندگی میں اس مکتوب کے لکھنے تک مثنوی کے دو دفتر چھپ چکے ہیں۔ اس خط کے بعد مولانا تھانوی کو جو آخری خط انہوں نے تحریر فرمایا ہے وہ ۲۰؍ربیع الاول ۱۳۱۷ھ ایک سال بعد کا ہے، لیکن اس اثنا میں جو خطوط آئے ہیں ان میں مثنوی کا اور مولانا احمد حسن صاحب کانپوری محشی مثنوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔

اس خط کے دو ماہ بعد حاجی صاحب کا ۱۲ر یا ۱۳ر جمادی الاخریٰ ۱۳۱۷ھ کو انتقال ہو گیا، لہٰذا مثنوی کی طباعت کے بقیہ تحقیقی حالات کے لئے ہمیں بھی اب خود اسی مطبوعہ مثنوی کی تلاش میں سرگرداں ہونا پڑا اور مَنْ جَدَّ وَجَدَ (جو کوشش کرتا ہے پاتا ہے) کے مطابق یہ حاجی صاحب کی عزیز از جان و دِل محشّی مثنوی پنجاب پبلک لائبریری لاہور سے مل گئی اور اس وقت ایک ماہ سے زیادہ عرصے سے میری تحقیقات کا نقطۂ نگاہ بنی ہوئی ہے۔

اس مثنوی کے پہلے اور چھٹے دفتر کے آخر میں کتاب طبع کرانے والے صاحب کی طرف سے بہت ہی نایاب تحقیقی معلومات حاصل ہوئے۔ حالات اگرچہ ایک ایک صفحے پر ہیں لیکن مجھے جس چیز کی تلاش تھی اس میں مجھے سب کچھ مل گیا۔

میری تحقیق میں یہ بات آگئی کہ دوسرے اور تیسرے دفتر کے درمیان حاجی صاحب کے لئے موت کا پیغام آ گیا۔ چنانچہ ان دونوں دفتروں میں آپ کے حاشئے کے آخر میں ’’مرشدنا قبلہ عالم حاجی امداد اللہ صاحب مدظلہ العالی‘‘ جا بجا لکھا ہوا ہے اور تیسرے دفتر میں ’’مرشدنا حاجی صاحب نور اللہ مرقدہٗ‘‘ کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

مثنوی کی طباعت کے منتظمین

اس مثنوی کی طباعت کا انتظام دو صاحبان کی منت کا مرہون ہے یعنی ابتدائی دو تین دفتر تو مولوی رحمت اللہ صاحب رعدؔ کے انتظام سے ’’مطبع نامی‘‘ کانپور میں چھپے جیسا کہ پہلے دفتر کے اندر کے ٹائٹل کی عبارت ہے۔

به امداد الله

دفتر اوّل - مثنوی شریف

از رحمت الله

در مطبع نامی واقع کانپور مطبوع گردید

اور باہر کے ٹائیٹل کی عبارت یہ ہے:

''در مطبع نامی کانپور محمد رحمۃ اللہ رعد طبع نمود، لیکن چھٹے دفتر کے ٹائیٹل کی عبارت حسب ذیل ہے:

''در مطبع محمود المطابع باہتمام سید محمود علی واقع کانپور مطبوعہ گردید۔''

بہرحال ان دونوں صاحبان کے مطبعوں میں یہ کتاب طبع ہوئی۔ چھٹے دفتر کے آخر کے صفحہ پر طابع صاحب، مثنوی کی طباعت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ابتدائے طبعش در ۱۳۱۴ھ شدہ۔ ودر اثنائے آں بیسارے از حوادث رونہادہ کہ بیانش طولے وارد۔ فالحمد للہ کہ از پنجۂ پرشور فتن رستگاری یافتہ در ۱۳۱۴ھ ہر شش دفتر تمام وکمال بصرف زر کثیر کہ تعدادش تقریباً چہاردہ ہزار است باوجود فقدان اسباب ظاہریہ محض بعنایت الٰہی وتصرف مرشد کامل بزیب اختتام رونق پذیر شد۔''
>
> **ترجمہ:** اس مثنوی کی طباعت کی ابتدا ۱۳۱۴ھ میں ہوئی اور اس اثنا میں بہت سی مشکلات آڑے آئیں جن کا بیان طوالت سے خالی نہیں۔ سو خدا کا شکر ہے کہ فتنوں کے پرشور پنجے سے نکل کر ۱۳۲۱ھ میں چھ کے چھ دفتر زرِ کثیر کے صرف کے بعد جو چودہ ہزار کی رقم ہے، تمام وکمال طور پر ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود صرف اللہ تعالیٰ کے کرم اور مرشد کامل (حاجی صاحب) کے تصرف سے ختم ہو کر رونق پذیر ہوئے۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی طباعت کی ابتدا ۱۳۱۴ھ سے ہوئی اور ۱۳۲۱ھ کے سات آٹھ سال کے عرصہ میں یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی۔ مگر اس اثنا میں ۱۳۱۷ھ میں مثنوی کی تکمیل سے چار سال پہلے حاجی صاحب راہی ملک بقا ہو چکے تھے۔ مثنوی پر کل چودہ ہزار کی رقم صرف ہوئی۔ جو اس زمانے کے اعتبار سے بہت بڑی رقم خیال

کی جاتی تھی۔

مثنوی کی ظاہری خوبصورتی

اس میں شک نہیں کہ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں مثنوی کے جتنے دفتر دیکھے ان سب میں حاجی صاحب کے حاشئے والی مثنوی سے زیادہ عمدہ خوبصورت اور صحیح نسخہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس کی تمام لکھائی نہایت خوبصورت اور کسی اعلیٰ درجہ کے کاتب کی لکھی ہوئی ہے۔ ٹائیٹل چار رنگہ ہے اور سنہرا بھی ہے۔

حاجی صاحب نے جو ہدایت مثنوی کی طباعت اور حاشیہ کے متعلق مولانا محمد یعقوب صاحب کو دی تھیں انہی ہدایات کی روشنی میں جلی قلم سے کتاب لکھی ہوئی ہے۔ چاروں طرف اور حسب ضرورت کتاب کے نچلے حصے میں حاشیہ ہے۔ لغت کے معانی سفیدی میں لکھے گئے ہیں۔ بعض نظموں کی مختصر تشریح بھی بین السطور میں لکھ دی گئی ہے، بلکہ حاجی صاحب کے الفاظ میں کہ عزیز موصوف نے مثنوی کا حق ادا کر دیا۔

اصل حاشئے پر تحقیقی نظر

حاجی صاحب نے اپنے مریدین کو مثنوی کی طباعت کی طرف جو توجہ دلائی ہے اور مریدین نے بھی جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس سے تمام کا منشا یہی ہے کہ حاجی صاحب کا مثنوی کا حاشیہ کسی صورت سے چھپ کر معتقدین اور اہل علم کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا لیکن قرعہ فال جیسا کہ راقم الحروف نے پہلے بھی عرض کیا ہے مولانا احمد حسن صاحب کانپوری کے نام نکلا۔ مولانا کانپوری حاجی صاحب قبلہ کے مرید ہیں اور نہایت قابل اور فاضل آدمی ہیں۔ ان کے بعض اور کتابوں پر بھی حاشئے ہیں۔ چنانچہ حاجی صاحب سے مولانا نے دورانِ حج محشی مثنوی طبع کرنے کے لئے حاصل کر لی اور اس کی طباعت کے لئے کمر ہمت کس لی۔ مگر اس اثنا میں

انہوں نے محسوس کیا کہ مثنوی کے حاشیہ کو پھیلایا جائے چنانچہ حاجی صاحب کے مختصر حواشی کے ساتھ ساتھ انہوں نے دیگر شرحوں سے استفادہ کیا اور ان کا خلاصہ بھی حواشی کے طور پر حاجی صاحب کے حاشیے کے ساتھ ساتھ درج کر دیا۔ اور حسب ضرورت اپنی فراست سے کام لے کر بھی تشریح کی۔ اور جہاں کہیں حاجی صاحب نے اشعار کی تشریح نہیں کی وہاں انہی شرحوں سے حاشیہ کو بھر دیا۔ گویا کتاب کو پھیلا دیا۔ اسی طرف حاجی صاحب کے گذشتہ خطوط میں صراحت کی گئی ہے۔ بہر حال مثنوی کی شرح بحر العلوم اور مولانا ولی محمد صاحب کے مطالب کا خلاصہ مولانا رومی کے صاحبزادے سلطان ولد کی تشریحات اور دیگر شارحین کی تشریحات سے کتاب کو پُر کر دیا۔ اس سلسلے کی مزید تحقیقات اسی محشی مثنوی کے پہلے دفتر کے آخری صفحے سے حسب ذیل عبارت میں حاصل کیجئے۔ طابع مولوی رحمت اللہ صاحب رعد حمد وثنا کے بعد لکھتے ہیں:

> مثنوی حضرت مولانا روم کہ اہل ظاہر بصورتش پویاں وصاحب باطن معنیش را جویاں کہ مجمع بحرین است یا مجموع الخافقین والی اللہ المشتکیٰ کہ از دستبرد مطابع چہ عارت ہا است کہ برو نتاختہ واز لغزش قلم ہا کدام تصرفہاست کہ برو علم نیفراختہ۔ پس دریں زماں مصدور البیان حضرت زبدۃ علمائے انام عمدۃ فضلائے عالی مقام جناب مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم حسب ایمائے شریف وفرمان منیف یادگار سلف، یکتائے خلف، آشنائے بحر تدقیق، دانائے رموز تحقیق، آیۃ من آیات اللہ حضرت حاجی محمد امداد اللہ صاحب مہاجر مکی روحی فداہ مطبع ہذا را بطبعش حقا کہ اقلیم ہند را ممنون نمودند۔ مساعی جمیلہ حضرت ممدوح در تصحیح کتاب موصوف الصدر نہ بمرتبہ ایست کہ صفحۂ قرطاس گنجائش او دارد یا ناطقۂ بیان شمۂ از اں بفعلیت آرد لکن بقول شخصے مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ مجملش ایں کہ جناب موصوف در طبعش امور ذیل مرعی داشتہ اند۔

۱...... اوّل منقّش رابحعد نسخہای مقابل فرمودند کہ ہر یکی را بجای صد کتاب تواں گفت۔ نہ نہ کہ صد گوہر ازمختلف کانہا برآوردہ بیک سلک سفتند چرا کہ بعضی ازمثنوی مولانا جامی علیہ الرحمۃ منقول است ودیگری در کتبخانہائے شاہی بگنجینۂ بی بہا موصول۔ حتیٰ کہ بعضی تقریباً بصد نسخہ تصحیح کردہ شدہ ودیگری بدست ہزار علمائے ظاہری وباطنی دستمال ماندہ وعلی ہذا القیاس۔

۲...... دوم آں کہ حتی الوسع درمواقع اختلاف ہیچ نسخہ فروگذاشت نگشتہ۔ طرفہ ایں کہ ہر جملہ بامناسب خود کما حقہ پیوست نہ آں کہ برطبق ابنائے زمان از کثرت نسخہا بجز اندراج غرض نداشتہ وقشر راازلب نشاختہ۔

۳...... سوم آں کہ درانتخاب حواشی قلیل المبانی کثیر المعانی نہایت مسیحائی نمودند کہ درحل مطالب نظیرش درچشم فلک نگذشتہ یعنی اوّلاً باتزام حواشی حضرت پیر مرشد حقیقی جناب حاجی صاحب رادرحوض درج نمودند۔ ثانیاً تحریرات متفرقہ از شروح معتمدہ ومخترعات طبیعت وقادہ برحاشیہ مزید کردند۔ حتیٰ کہ حواشی کتاب مذکورہ خلاصہ بست شرح گفتن رواست ورقم ہائے متعلقہ اورالب لباب صدہا مضامین نوشتن سزا۔

بعد ایں چنیں تصحیح بالا کلام وتنقیح حسب مرام کدام مثنوی مطبوعہ یا قلمی رایارا کہ بوصف مجموعی وعلوی ہمسریش دارد۔ یا ہیچ مصحح وصاحب مطبع بہمتایش لب بکشاید۔ نظر بانصاف توقع از حضرات متوسلین درس تدریس مثنوی مولوی معنوی ومشتغلین استفادہ قرآن زبان پہلوی آنست کہ اگر نسخہ ہذا رابتقدیم وتاخیر یا ترک بعض اشعار دربعض مقامات بکتب موجودہ مخالف دانند یقین باید کرد کہ منشای ایں اختلاف غایت تصحیح است وایں چنیں اشعار درہمیں کتاب بدیگر دفترہا بمواقع مناسبہ باشد والا نسبت تصرفات ملحقین کردہ آید۔

۴...... چہارم آں کہ دفتر اوّل وباہتمام مذکوہ بالا ہدیۂ ناظرین است انشاء اللہ العزیز بقیہ دفاتر ہم بدو چند رعایت عنقریب حلیہ طبع بیزاید۔ ہر گاہ کہ در طبع کتاب مذکور مصارف جانی ومالی منحصر بذات مقدس مولانا ممدوح است مطبع را بجز خدمت گذاری الطباع استحقاقی نہ پس حضرات کہ ارادہ خریداری ایں گوہر آبدار دارند بخدمت مولانا مولوی احمد حسن صاحب معزی الیہم از شہر کانپور مسجد رنگیاں طلب فرمایند۔

ترجمہ: مولانا روم کی مثنوی کے ظاہر پر نظر رکھنے والے اس کی صورت کی طرف دوڑتے ہیں اور اہل باطن اس کے معانی کے طلبگار ہیں حقیقت یہ ہے کہ مجمع بحرین ہے یا مجموع الخٰفقین۔ اور اللہ سے ہی فریاد ہے کہ چھاپہ خانوں کی دست اندازی سے اس (مثنوی) پر مصیبتیں نوئیں اور لکھنے والوں کی لغزشوں سے اس میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہوئیں، پس مذکورہ بالا زمانہ میں حضرت زبدۂ علمائے، عمدہ فضلائے، عالی مقام جناب مولانا احمد حسن صاحب عم فیضہم نے حسب الحکم یادگار سلف، یکتائے خلف، آشنائے بحر تدقیق، دانائے رموز تحقیق، اللہ کی آیات میں سے ایک آیت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی روحی فداہ نے اس مطبع کو اس کے چھاپنے کے لئے حکم فرمایا اور خاص طور پر مطبع والوں بلکہ حق یہ ہے کہ اہل ہند کو ممنون فرمایا۔ حضرت ممدوح (مولانا احمد حسن) کی کوششیں مثنوی کی تصحیح میں ناقابل بیان وتحریر ہیں۔ لیکن کسی کے قول کے مطابق کہ

مَالَا يُدْرَكُ كُنُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُنُّهٗ

اجمالی کیفیت یہ ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب نے اس کے طبع کرانے میں حسب ذیل امور کالحاظ رکھا ہے۔

۱......اوّل یہ کہ مثنوی کے اصل اشعار کو متعدد مثنوی کے نسخوں سے مطابق کیا کہ جن میں سے ہر ایک کو سو کتابیں کی جگہ کہا جا سکتا ہے۔ نہیں نہیں کہ سو موتی مختلف کانوں سے نکال کر ایک لڑی میں پروئے کیوں کہ بعض تو مولانا جامی کی مثنوی سے منقول ہیں اور دوسری شاہی کتب خانہ سے ملیں۔ حتی کہ بعض تقریباً سو نسخوں سے تصحیح کی گئیں۔ اور دوسری ظاہری ہزاروں علما کے ہاتھوں میں رہی وعلیٰ ہذا القیاس۔

۲......دوسری یہ کہ حتی المقدور اختلاف کے مواقع میں کوئی بھی نسخہ نہیں چھوڑا گیا۔ عجب یہ کہ تمام کو کما حقہ مناسب جگہ رکھا گیا، ایسا نہیں جیسا کہ دوسرے اہل زمانہ نے بہت سی مثنویوں سے بغیر صحیح وغلط کی تمیز کے نقل کر لیا۔

۳......تیسرے یہ کہ قلیل الفاظ اور کثیر معانی حواشی کے انتخاب میں مائل کیا ہے یہ ایسے حواشی ہیں کہ اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ سب سے زیادہ ضروری حضرت پیر مرشد حاجی امداد اللہ صاحب کے حواشی کو درج کیا گیا۔ بعد ازاں متفرق شرحوں کی تحریروں کو اور خود اپنی (مولانا احمد حسن صاحب کی) فہم کے مطابق حاشیے پر مزید کچھ لکھا گیا، تا آنکہ اس مثنوی کے حاشیوں کو بیس شرحوں کا خلاصہ کہنا درست ہے۔ اور اس سے متعلق تحریروں کو صدہا مضامین کا خلاصہ لکھنا لائق ہے۔

اس جیسی انتہا درجہ کی حسب منشا تصحیح کے بعد کسی مطبوعہ یا قلمی مثنوی کو اس کی ہمسری کا درجہ دینا ٹھیک نہیں، یا کوئی تصحیح کرنے والا اور صاحب مطبع اس کی برابری کا دعویٰ کرے۔ اس لئے مثنوی کے پڑھانے والوں اور زبان پہلوی کے قرآن یعنی مثنوی سے ذوق وشوق رکھنے والوں سے یہ توقع ہے کہ اس نسخے کو اشعار کی تقدیم وتاخیر یا بعض اشعار کے ترک پر اختلاف پائیں تو اس کو

> غایت صحت پر محمول فرمائیں۔ اور اس قسم کے اشعار اسی کتاب میں دوسرے دفتروں میں مناسب مواقع پر ہونگے ورنہ اپنی طرف سے لاحقین کا تصرف خیال کریں۔
>
> ۴...... چوتھے یہ کہ پہلا دفتر مذکورہ بالا انتظام کے بعد ہدیہ ناظرین ہے۔ انشاء اللہ مثنوی کے دوسرے دفتر بھی دوچندر عایت سے عنقریب چھپ کر شائع ہوں گے۔ ہاں یہ بھی سن لیجئے کہ اس کتاب میں جانی و مالی مصارف مولانا (احمد حسن صاحب) کے ہیں۔ مطبع کو صرف طبع کرنے کے سوا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے جو صاحب اس کو خریدنا چاہیں وہ مولانا مولوی احمد حسن صاحب سے شہر کانپور مسجد رنگیاں کے پتہ پر طلب فرمائیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے حاشئے کو اصل قرار دیتے ہوئے تقریباً بیس شرحوں کا خلاصہ کر کے مولانا احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مثنوی کے نسخے کو شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے یقیناً بڑی محنت اور کاوش دماغی کے علاوہ مالی قربانیاں بھی کی ہیں اور قبلہ مرشد حاجی صاحب کے کارنامے کو اجاگر کرنے اور لوگوں سے روشناس کرانے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

چھٹا دفتر جو ذی الحجہ ۱۳۲۱ھ میں پانچویں دفتر سے دوسال بعد چھپا ہے اس کے آخر میں بھی اعلان کے عنوان کے ماتحت ایک صفحے کی فارسی عبارت ہے جس میں پہلے حمد ہے بعد ازاں نعت اور اس کے بعد انسان کی پیدائش کا مقصد یعنی حصول معرفت مرشد کامل کی رہبری اور تصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کتابوں میں مثنوی کے مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے طابع لکھتے ہیں:

> عمدہ ترین وسائل حصولِ ایں نعمت جزیلہ مزاولت مثنوی مولانائے روم است۔
>
> ہر کس از اصحاب ظاہر و ارباب باطن درخور استعداد بہرہ مند فیوض نامتناہی گشتہ۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد
برنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

صد ہا اولیائے کرام عالی مقام از مطالعش بحصولِ مقصود فائز شدند، و ہزار ہا صلحائے عظام از فہم مضامینش بہرہ یاب گشتند۔ مگر از غارتگریہائے نساخین فغانی بلند بآسماں می رسید۔ واز کثرت اغلاط دود آہ مشاقین بہ سپہری و بسیاری از تصرفات را مخزن واکثری از تحریفات را معدن گشتہ بود تا آنکہ بحر مواج عنایت لم یزل بجوش آمدہ وگلبانگ شادی بجزوش یعنی مقبول خداوند ذوالمنن سیدنا ومقتدانا مولانا احمد حسن صاحب حسب فرمان واجب الاذعان مقتدائی عازمان پیشوائی خداشناس غواص بحر تجرید، واقف دریائے تفرید عارف کامل، مکمل آیۃ من آیات اللہ صاحب مہاجر مکہ مجلہ نور اللہ مضجعہ در تصحیح متن مثنوی شریف وادراج نسخہائے لطیف بمواقع مناسبہ وتقدیم وتاخیر اشعار بسرخیہائے محققہ وہم در تزئین کتاب مسطور بدر تحریمات حضرت مرشد کامل ممدوح الصدر وانتخابات بدیعہ ومخترعات غریبہ وتلخیص مضامین شروح متعددہ باختصار مرغوب واقتصار مطلوب سعی تمام وکوشش بلا کلام مبذول فرمودند حق اینست کہ از احاطۂ توصیف حسن ظاہر وباطن کتاب مستطاب وسعت میدان تبیان معترف بقصورست، واز اظہار کمالاتش زبان فصیح البیان مقر بقصور۔ دفاتر سابقہ کہ بعد تحلی بحلیۂ انطباع ہدیۂ ناظرین شدہ بر کمالش شاہدیست کافی وبرہانیست وافی۔ بحمد اللہ کہ دفتر ششم کہ از مدت دو سال در خیام عوائق وموانع مقصود ومستور گشتہ بود، ودیدۂ مشتاقین جمال خوش منظرش در رنگ نایافتگی شاہد رعنائی تاب بود، ہم بلباس فاخرہ طبع آراستہ وپیراستہ گردید۔

ساقی بیا کہ یار زرخ پردہ برگرفت
کارچراغ خلوتیاں باز در گرفت

بار غمیکہ خاطر ما خستہ کردہ بود
عیسیٰ دمے خدا بفرستاد وبرگرفت

ترجمہ: اس نعمت (معرفت) کے حاصل کرنے کے لئے مثنوی مولانا روم بہترین وسیلہ ہے۔ اس مثنوی سے ظاہری اور باطنی علماء نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق بے شمار فیض حاصل کئے ہیں۔

اس کے حسن کی بہار دِل وجان کو تازہ رکھتی ہے
صورت کے بھوکوں کو رنگ سے اور باطن کے طلبگاروں کو معنی سے

صدہا عالی مقام اولیائے کرام اس کے مطالعہ سے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوئے اور ہزارہا صلحاء اس کے مضامین پا کر فیضیاب ہوئے، لیکن کاتبوں کی حماقتوں سے فریاد ہے جن کی غلطیوں سے کتاب کا ستیاناس ہوگیا۔ چنانچہ یہ مثنوی ان کی تبدیلیوں سے مسخ ہو کر رہ گئی یہاں تک کہ قدرت کا دریائے مواج جوش میں آیا اور اس نے خوشی کا پیغام دِیا یعنی خدا تعالیٰ کے نیک بندے مولانا احمد حسن صاحب نے مقتدائے عارفاں، پیشوائے خداشناساں، غواص بحر تجرید، واقف دریائے تفرید، عارف کامل ومکمل، اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی حضرت سیدنا ومولانا حاجی شاہ محمد امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نور اللہ مضجعہٗ کے حکم سے مثنوی شریف کے متن کی تصحیح کر کے اور لطیف نسخوں (۱) کو مناسب مقامات پر درج کر کے اور تحقیق شدہ عنوانات کے ماتحت اشعار کو آگے پیچھے کر کے اور کتاب مذکور کو حضرت مرشد کامل (حاجی صاحب)

---

(۱) نسخوں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو مختلف مثنویوں میں مختلف پائے گئے۔ مثلاً مثنویوں میں یک زمانہ صحبتے با اولیا۔ بہتر از صد سالہ بودن در لقا کی بجائے یک زمانہ صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا۔ گویا صحبت اور لقا کی بجائے اور بے ریا پر ـ کا نشان بنا کر حاشیہ پر دوسرے الفاظ لکھ دیئے جاتے ہیں کہ بعض مثنویوں میں ان لفظوں کی بجائے یہ الفاظ ہیں۔ لہٰذا ان کو نسخہ کہا جاتا ہے۔ منصف

موصوف کے حواشی سے سجا کر اور عمدہ انتخابات اور بہترین طبع زاد معانی ومطالب اور متعدد شرحوں کے مضامین کا خلاصہ کرکے مناسب اختصار کے ساتھ پوری کوشش اور بے حد سعی صرف کی۔ حق یہ ہے کہ اس کا ظاہری وباطنی حسن احاطۂ تحریر سے باہر ہے اور اس کے کمالات کا اظہار کرنے سے فصیح سے فصیح زبان بھی عاجز ہے مثنوی کے پہلے چھپے ہوئے دفتر ہمارے بیان کے شاہد ہیں اور ہمارے قول پر روشن دلیل ہیں۔ الحمد للہ کہ چھٹا دفتر جو دو سال کی مدت سے موانع اور مشکلات کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور دیکھنے والوں کی نگاہیں اس کے حسن وجمال کے دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں وہ دفتر بھی عمدہ چھپائی سے آراستہ ہوکر سامنے آگیا۔

اے ساقی آ کہ یار نے چہرے سے نقاب اٹھا دی
اور خلوت میں بیٹھنے والوں کا چراغ گل کر دیا

اور جس غم کے بوجھ نے ہمیں تباہ کر دیا تھا ایک عیسیٰ نفس کو خدا نے بھیجا اور اس نے اس کو اٹھا لیا۔

یہاں تک اعلان کی عبارت کا مقصد یہ نکلا کہ مثنوی معنوی کے مطالعہ سے ہزاروں عارفین اور علماء نے معرفت الٰہی حاصل کی۔ مگر کاتبوں کی دستبرد سے مولانا روم کی اصل مثنوی میں بہت سی غلطیاں پیدا ہوگئیں نہ صرف غلطیاں، بلکہ بعض غیر محتاط لوگوں نے تو اس میں الحاقی اشعار کا سلسلہ جاری کر دیا جس سے مثنوی میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوگئیں اور اصلیت میں مسخ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ مولانا احمد حسن صاحب نے یقیناً مختلف مثنویوں سے مقابلہ کرکے کتاب کو درست کیا۔ لیکن حاجی صاحب کی مثنوی کا نسخہ خود ان کی کاوشوں کے نتیجہ میں بہت صحیح کیا جاچکا تھا۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ اسی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاجی صاحب کے نوشتہ

تمام حاشیہ کو اس میں جگہ دی گئی اور مزید براں دو شرحوں کا خلاصۂ مطالب اور خود اپنی فہم سے بھی کافی کام لیا گیا۔

ان حقیقتوں کے علاوہ اس مطبع نے ایک اور زبردست کارنامہ کیا کہ مثنوی کا تتمہ جو مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی مرحوم کا لکھا ہوا تھا اور جس کی طباعت کے لئے حاجی صاحب نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی لکھا تھا اس پر بھی مولانا احمد حسن صاحب نے حاشیہ لکھا اور اس کو بھی ساتویں دفتر کی طرح اسی تقطیع پر نہایت خوبصورت طبع کرایا گیا۔ چنانچہ اعلان کی عبارت یہ ہے۔

> تتمہ مثنوی شریف مصنفہ جناب مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس سرہ مثل دفاتر مثنوی مزین بہ تصحیح و تحشیہ شدہ بقالب طبع در آمدہ است لیکن از دفتر ششم علیحدہ چاپ نمودہ آمد تا باعث از دیاد حجم دفتر ششم کہ ہم از اکثر دفاتر کلاں تر است، نگردد، و موجب بدنمائی جلد و سبب زیادت قیمت مشتہرہ ہر دفتر نشود۔
>
> **ترجمہ:** مثنوی شریف کا تتمہ جس کو مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی قدس سرہ نے تصنیف فرمایا تھا، مثنوی کے دوسرے دفتروں کی طرح تصحیح اور حاشیہ کے بعد چھپ گیا ہے لیکن چھٹے دفتر سے علیحدہ کر کے چھاپا گیا ہے تاکہ دفتر ششم کی ضخامت زیادہ نہ ہو جائے اور جلد کی بدنمائی اور اعلان کردہ قیمت سے زیادہ قیمت کا باعث نہ بن جائے کیوں کہ چھٹا دفتر باقی دفتروں سے زیادہ ضخیم ہے۔

اس تتمہ کے علاوہ ایک اور قابل تحسین امر یہ ہے کہ مولانا احمد حسن صاحب نے چھٹے دفتر کے آخر میں حضرت فریدوں معروف بہ سپہ سالار کا تصنیف کردہ رسالہ جس میں مولانا روم کے مناقب اور ان کے خلفاء کے حالات درج ہیں اور جو سو صفحوں پر مشتمل ہے طبع کرایا، حضرت سپہ سالار مولانا روم کی خدمت میں چالیس سال رہے ہیں اس لئے مثنوی کا یہ ایڈیشن اپنی نوعیت میں قابل فخر و مسرت ہے۔ یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس میں سلطان

العلماء سید بہاء الدین، سیدنا جلال الدین، سید برہان الدین، حضرت شمس الدین، حضرت زرکوب صلاح الدین، سیدنا چلپی حسام الدین، سلطان ولد بہاء الدین، حضرت جلال الدین چلپی، حضرت عابد شمس الدین چلپی، سیدنا چلپی صلاح الدین، سیدنا چلپی واجد حسام الدین اور حضرت علاء الدین رحمہم اللہ علیہم کے حالات اور مناقب درج ہیں اور ان کے حالات کے ضمن میں مولانا رومی کے مناقب اور صفات کی تفصیلات کا پتہ چلتا ہے جن سے مولانا روم کی شخصیت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس رسالہ کا اردو زبان میں ترجمہ کرکے اور مولانا روم سے متعلق بہت سے معلومات پیش کرکے قارئین کے لئے دعوت فکر ونظر دوں۔ مثنوی کا یہ ایسا ایڈیشن ہے کہ دوبارہ چھپنا اس کو نصیب نہ ہوا۔ چنانچہ آج کل بالکل نایاب ہے، بلکہ معدودے چند کے سوا کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ حاجی صاحب خود کون تھے اور انہوں نے مثنوی کا کوئی حاشیہ بھی لکھا تھا اور ان کے مرید مولانا احمد حسن صاحب مرحوم نے نہایت تفصیلی اور تحقیقی اضافے کرکے اہل علم کے لئے بیش بہا علمی خدمات انجام دی تھیں۔ یہ امر بھی حیرت سے خالی نہیں کہ اگر یہ اعلانات جو پہلے اور چھٹے دفتر کے آخر میں ہیں نہ ہوتے اور مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات اس سے متعلق تصریحات نہ ہوتیں تو یہ بھی پتہ چلانا بے حد مشکل ہو جاتا کہ اس حاشیے کی خدمات مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے انجام دی ہیں کیوں کہ کسی دفتر کے اوّل میں یا اور کسی جگہ مولانا احمد حسن صاحب کا نام تک مذکور نہیں۔ اور یہ غالباً اس لئے کہ انہوں نے ٹائیٹل پر اپنا نام لکھوانا اپنے مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی جناب میں گستاخی تصور کیا ہوگا۔ اسی لئے ٹائیٹل پر صرف یہ عبارت ہے ”بہ امداد اللہ دفتر اول باہتمام منشی رحمۃ اللہ مطبع نامی یا نظامی میں باہتمام محمود علی صاحب طبع ہوا۔

ہم نے یہاں تک تحقیقات میں جس قدر تفصیلات سے کام لیا ہے وہ اس قدر طویل ہو چکی ہیں کہ اس سے زیادہ لکھنا دردسری سے کم نہیں۔ اس لئے اب ہم صرف حاجی صاحب

کے بعض حواشی مزید تحقیقات کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین ان کی محنت لیاقت اور مقام معرفت اور ذوق مثنوی کا اندازہ لگا سکیں۔

حاجی صاحب کے بعض حواشی
اور مطالب مثنوی

حاجی صاحب نے مثنوی کے اشعار کے جو مطالب بیان کئے ہیں اور جو شرح تحریر فرمائی ہے ان میں سے کچھ حسب ذیل پیش خدمت ہیں۔ اس سلسلہ میں مثنوی کے پہلے دفتر کا پہلا شعر اور اس کا مطلب ملاحظہ فرمائیے۔

بشنو از نی چوں حکایت میکند   از جدائی ہا شکایت می کند

از نی مراد انسان کامل کہ ذات حضرت مولانا جلال الدین رومی است، اگرچہ ذات مبارک ایشاں درعین وصال است اما مطابق آنکہ۔

گفتمش درعین وصل ایں نالہ و فریاد چیست   گفت مارا جلوۂ معشوق دریں کار داشت

ودر مفارقت از عالم قدس احتمال قبض وبسط ہم است۔ مشاہدۃ الابرار بین التجلی والاستتار۔

بہر استبقائی ایں جسم چوجاں   لجۂ در ابر گردد خور نہاں

پس چنانچہ حسن وجلی حق را نہایت نیست ذوق وشوق ایشاں را ہم پایانی نیست کہ مدام دمساز ند ومشتاق اند ۱۲ قبلہ عالم حاجی محمد امداد اللہ صاحب دام ظلہم العالی۔ (مثنوی دفتر اوّل ص ۲ حاشیہ نمبر ۱)

سرِ پنہان است اندر زیر وبم   فاش گر گویم جہاں برہم زنم
آنچہ نی می گوید اندر ایں دو باب   گر بگویم من جہاں گرد وخواب

پہلے شعر میں جو مولانا روم نے، نے کی حکایت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ کیا کہتی ہے

یعنی فراق کی شکایت کرتی ہے۔ مولانا رومؒ اس راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ ان دونوں شعروں میں انہوں نے یہ فرمایا کہ بانسری کے زیر و بمؔ میں جو راز پوشیدہ ہے اگر میں اس کو فاش کردوں تو دُنیا درہم برہم ہو جائے گی۔ ان دونوں اشعار میں سے دوسرے شعر کی شرح میں حاجی صاحب لکھتے ہیں:

> قولہ گر بگویمؔ الخ اے اگر فاش بگویم یعنی فراق کہ نے در زیر و بمؔ میگوید اگر من گویم جہاں خراب شود۔ زیرا کہ گفتار ہر گوئندہ رابقدر حال آں گویندہ آثارست ویقین است کہ حالت من بمراتب از حالت نے زیادہ است۔ پس گویا بوجہ خرابی جہاں اشارہ می نماید درآنچہ می فرماید کہ۔
>
> جملہ معشوق است و عاشق پردۂ ۱۲۔ مرشدنا قبلہ و عالم عمؔ فیضہم (دفتر اول ص ۵ حاشیہ نمبر ۱۰)

یک زمانہ صحبت با اولیا بہتر از صد سال بودن درتقا

> حضرت مرشدنا (حاجی امداد اللہ صاحب) مد اللہ ظلہ در وقت درس مثنوی وغیرہ فرمودند کہ مراد ازیں زمانہ مطلق نیست بلکہ وقت خاص است کہ بر اولیائے کرام می آید۔ صحبت آں وقت موجب ایں چنیں فضیلت و کرامت ست نہ مطلق صحبت۔ اگرچہ مطلق صحبت خالی از فائدہ نیست ۱۲ (دفتر اول ص ۶۲ حاشیہ نمبر ۱)

(نوٹ) صاحب شمائم امدادیہ لکھتے ہیں کہ حاجی صاحب نے اس شعر کے متعلق فرمایا کہ اس سے زمان عام نہیں بلکہ زمان عام مخصوص ہے جب اَنَّ لِیُ مَعَ اللّٰہ وقت میسر ہو۔ وہ وقت مراد ہے۔ اور فرمایا کہ ایک دم میں ولایت حاصل کرنے کے لئے خدمت کرنا چاہئے جیسے کہ حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ مرید حضرت شاہ ابوالمعالی قدس سرہ اپنے مرشد کی انواع واقسام کی خدمت کرتے تھے اور بڑی مشقت کرتے تھے۔ دِن کو دِن اور رات کو رات نہیں جانتے تھے، ایک دِن شاہ صاحب نے نکال دِیا، شاہ بھیک صاحب شہر کے اردگرد

گھومتے پھرتے۔ ایک دِن شاہ (ابوالمعالی) صاحب کی اہلیہ نے کہا کہ تم نے ایسے بے حس آدمی کو کیوں نکال دیا اگر وہ ہوتا تو کوئی کام ہی کرتا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے نکال دِیا ہے تم نے تو نہیں نکالا تم بلالو۔ غرض کہ شاہ بھیک صاحب کو طلب کر کے کوٹھے کی چھت بنانے کا حکم دیا، شاہ بھیک بے تکلف اکیلے بنانے لگے، اور بڑی بڑی لکڑیوں کو کاٹ تراش کر چھت بنانی شروع کی، حضرت کو یہ خدمت پسند آئی۔ چونکہ ان کی مشقتیں انتہا کو پہنچ چکی تھیں اس لئے شاہ ابوالمعالی نے ایک دَم میں توجہ باطنی سے کمال کو پہنچادِیا۔

(شمائم ص۹۳-۹۴)

ایں نہ جبر ایں معنی جباری ست　　ذکر جباری برائے زاری ست
زاری ما شد دلیل اختیار　　خجلت ماشد دلیل اختیار

یعنی جبر نیست، بلکہ مشاہد وغلبۂ قدرت حضرت باری ومطالعۂ آثار جباری اوست وتفویض وتسلیم جمیع امور بوجود مطلق کہ وجود امکانی درجب آں وجود واجبی ابداً مستہلک ومتلاشی است، تادریافت ایں معنی درعجز وتضرع ونالہ وزاری بیفزاید مذہب اہلسنت وجماعت جبر متوسط نہ بالکل جبر ونہ بالکل اختیار بلکہ چیزی میانہ مثل نالیدن بیمار کہ ہم بہ بے اختیاری است وہم بااختیار واللہ اعلم۔ مرشدنا قبلۂ عالم جناب حاجی امداداللہ صاحب عم فیضہم (دفتر اوّل ص۵۴-حاشیہ نمبر۱)

من کسے درنا کسے دریافتم　　پس کسے در نا کسے در باختم

بموجب ایں تقریر دریافتن کسے درنا کسی عبارت از حصول مرتبہ فناء الفنا ست۔ بایں خطاب مشرف گردیدم، اما ازیں مقولہ کہ سر الٰہی بر من مکشوف شد یا نہ شد تصریح نفرمودند زیرا کہ حق تعالیٰ کہ درحق بندگاں واقع ست ورضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ویحبہم ویحبونہ برسبقت نوازش او برضا ومحبت وشاہد عادل اند بیان می فرمایند تاترا در وقوع ایں خطاب شبہۂ روندہد ومتیقن شود کہ ظہور

کمال درصورت نقصان من حیث المجاز ہم شواہد بسیار دارد، پس بدانی کہ محبت ورضائی، فرع ونتیجۂ محبت ورضائی خالق است کما قال۔

جملہ شاہاں بندۂ بندہ خودانمی گویند۔

چونکہ عاشق اوست تو خاموش باش　　　او چو گوشت می کشد تو گوش باش

مراد آنست کہ ہر چند سبقت در محبت از حق است بندہ را باید کہ خود را محبوب نداند ومغرور نشود ودر مقام ادب وفرمانبرداری باشد، مثلاً ہر مرید چوں شیخ عاشق شود باید کہ مرید لوازم معشوقی رہا کند وشرائط مریدی بجا آرد ۱۲ مرشدنا قبلہ عالم عم فیضہم (دفتر اوّل ص:۱۵۱ حاشیہ:۴)

چوں نباشد عشق را پروای او　　　او چو مرغی ماند بی پروای او

یعنی چوں عشق را کہ مراد ازاں معشوق است، خواہ بآں اعتبار کہ نظر باں اعتبار علم وعالم ومعلوم یکے می گویند خواہ بآں نظر کہ مصدر بمعنی اسم مفعول است پروای آں عاشق نباشد واو را محافظت چنانچہ صاحب پردہ را می نماید ایں عاشق ہمچو مرغی بی پر ماند وای افسوس آں عاشق را ۱۲ مرشدنا قبلہ عالم دام ظلہم العالی۔

نے حریف ہر کہ از یاری برید　　　پرداہائش پردہاے ما درید

قولہ نے حریف۔ یار وغمخوار۔ پردہائش۔ آوازہا۔ یعنی ما کہ از فرقت دلدار بوجہ اضطرار اصطبار نمودہ ایم چوں نے پردہا انداخت ما را غم فراق در جوش آورد وبی اختیار کرد۔ پردہاے ما کہ درمیان محبوب بود درید۔ یعنی حجاب ہستی از پیش نظر برداشت وکشف اسرار نمودند۔ مرشدنا قبلہ عالم عم فیضہم۔

ترک استثنا مرادم قسوتے ست　　　نی ہمیں گفتن کہ عارض حالتیست

مراد از ترک استثنا غفلت قلبیہ است خواہ از زبان متروک باشد دیا یا بر زبان جاری شود ۱۲ (نے ہمیں گفتن کہ عارض عالتیست) گفتن استثنا از زبان عارض حالتست واز قلب ناشی نیست۔ بالجملہ ایں گفتن با غفلت نیز داخل ترک استثنا

است۔ ۲امرشدنا قبلۂ عالم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب (دفتر اول ص:۸ حاشیہ:۱)

یہ ہیں مثنوی مولانائے روم حاجی صاحب کے حواشی یا فوائد جن کو ہم نے قارئین کی ضیافت طبع کے لئے محض نمونے کے طور پر پیش کر دیا ہے۔ راقم الحروف کو بہت مسرت ہے کہ اس نے حاجی صاحب کی تصنیفات میں پوری ذمہ داری اور تحقیق سے کام لے کر ان حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے جو مدتوں سے گمنامی کے گوشوں میں کسمپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی کراہ رہی تھیں۔

دفتر ہفتم مثنوی

از مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ

حاجی صاحب کے حواشی کے سلسلے میں دو باتیں اس قابل ہیں کہ ان پر بھی ذرا ہم معلومات میں اضافے کے طور پر تفصیلات پیش کر دیں۔ ایک تو یہ جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں کہ مولانا رومی نے مثنوی کا چھٹا دفتر نامکمل چھوڑا تھا اور جب آپ کو دفتر مکمل کرنے کے لئے یاددہانی کرائی گئی تو آپ نے فرمایا تھا کہ اس کو اب کوئی اور خدا آگاہ انسان مکمل کرے گا۔ چنانچہ مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی نے چھٹا دفتر تھانہ بھون کی مسجد پیر محمد والی میں مکمل کیا تھا جس کا ذکر حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی نے کیا ہے۔ اور جس کو حاجی صاحب کی فرمائش کے مطابق بطور ضمیمہ مولانا احمد حسن صاحب کانپوری نے علیحدہ چھپوایا تھا۔ افسوس کہ یہ ضمیمہ ہمیں باوجود تلاش بسیار نہ مل سکا۔ مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے کتب خانے کی فہرست میں حاجی صاحب کی محشی مثنوی موجود ہے اور مفتی الٰہی بخش صاحب کا وہ ضمیمہ بھی درج ہے لیکن شمیم صاحب نے اور میں نے بہت تلاش کیا مگر ضمیمہ نہ مل سکا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں بھی حاجی صاحب کی محشی مثنوی ہے لیکن مفتی صاحب کا ضمیمہ موجود نہیں۔ مگر دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ مفتی الٰہی بخش صاحب کے ضمیمے کے تجسس

میں ایک اور کتاب ہمیں ملی جو مثنوی مولانا روم کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور دفتر ہفتم مثنوی کے نام پر مولانا شیخ محمد محدث تھانوی نے تحریر فرمائی ہے۔ اسی دفتر ہفتم کے متعلق مولانا روم کے صاحبزادے نے بھی ان کو توجہ دلائی تھی۔

ذکر جمیل مولانا محمد محدث تھانوی

مثنوی کے دفتر ہفتم پر تبصرہ کرنے سے پہلے قدرے مولانا محمد محدث کا ذکر بھی زینت تذکرہ بنا دیں۔ یہ مولانا شیخ محمد محدث وہی عالم دانشمند ہیں جن کا ذکر جہاد شاملی کے سلسلے میں کئی جگہ آ چکا ہے اور پیر محمد والی مسجد تھانہ بھون میں یہی تین حضرات یعنی حاجی صاحب حافظ محمد ضامن صاحبؒ اور مولانا محمد محدثؒ صاحب شریعت و طریقت کے تین درخشندہ آفتاب تھے جو ۱۸۵۷ء کے جہادِ حریت میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے، حاجی صاحب مکہ مکرمہ کو ہجرت کر گئے، حافظ صاحب شہید ہو گئے، محدث صاحب تھانہ بھون میں رہے لیکن پھر تا زندگی اطمینان نصیب نہ ہوا، ہم مولانا کے حالات مولانا نسیم احمد صاحب فریدی کے مضمون سے لے رہے ہیں جو تذکرۂ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ہے، اور انہوں نے یہ مضمون مولانا محمد صاحب کے مرید حکیم محمد عمر چرتھاولی ضلع مظفر نگر کی کتاب ''حالاتِ محمدیہ'' سے اخذ کیا ہے جو ان کو حکیم عبدالواحد خاں صاحب اور ان کے بڑے بھائی حکیم محمد الیاس صاحب کرتپوری بجنوری کے کتب خانے سے ملی۔

تاریخ پیدائش اور نام و نسب نیز والد کا نام اور وطن

مولانا شیخ محمد صاحب کے والد کا نام نامی مولانا احمد اللہ تھا۔ آپ تھانہ بھون میں ۲۰ ؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۳۰ھ کو پیر کے دن پیدا ہوئے۔ والد صاحب علاوہ عالم ہونے کے تحصیلداری کے عہدے پر سرفراز رہے۔ مولانا پانچ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ اور دس سال کی عمر میں آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ

عنہ سے ملتا ہے بڑے لڑکے محمود صاحب کے نام پر اپنی کنیت ابومحمود رکھی۔

تعلیم

گیارہ سال کی عمر میں آپ نے قرآن کریم حفظ کیا۔ بعد ازاں فارسی اور پھر مولانا عبدالرحیم صاحب سے صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں اور مولانا قلندر علی جلال آبادی سے بھی تعلیم حاصل کی۔ مولانا پندرہ سال کے تھے کہ دہلی میں شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ انیس سال کی عمر میں تمام علوم وفنون مثلاً علم حدیث، فقہ، تفسیر، اصول، فرائض، کلام، منطق، ریاضی اور فلسفہ سے فراغت کی سند حاصل کی۔

قیامِ وطن یعنی تھانہ بھون اور گھر کی مالی حالت

حصولِ تعلیم کے بعد آپ نے اپنے وطن تھانہ بھون میں قیام کیا اور اہل وطن کو وعظ وتعلیم درس وتدریس سے فیض پہنچایا۔ آپ کا دولت خانہ پیروالی مسجد کے متصل تھا۔ گھر کے بہت بڑے زمیندار تھے اور کئی گاؤں کے مالک تھے۔ آپ کو باہر معقول ملازمتیں ملتی تھیں لیکن آپ نے ”کون جائے شیخ یہ تھانے کی گلیاں چھوڑ کر“ پر عمل کیا۔ اور باہر جانے سے گریز کیا۔

منزل فقر وسلوک

پہلے زمانے کے علماء ظاہری علم کے ساتھ روحانی علوم اور تصرف کو ضروری خیال کرتے تھے، چنانچہ آپ نے پہلے حافظ محمد ضامن صاحب شہید سے جو کہ آپ کے رشتے کے ماموں بھی ہوتے تھے روحانی فیض حاصل کیا اور بعد ازاں میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی (جھنجھانہ ضلع مظفر نگر میں ایک مقام ہے لوہارو) سے بیعت کی اور پھر خود بہت بڑے روحانیت کے مالک اور ان کے خلفاء میں سے ایک خاص خلیفہ بن گئے۔ ۱۲۵۹ھ میں میانجی صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت

جس زمانے میں حضرت مولانا سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تھانہ بھون اور اس کے اطراف وجوانب کا تبلیغی دورہ ۱۲۳۴ھ میں فرمایا آپ تھانہ بھون پہنچے تو مولانا محمد صاحب بچے تھے۔ آپ کے بزرگوں نے مولانا کو ازراہِ برکت بیعت کرادیا ہوگا اس لئے مولانا اپنے رسالے ''الہامات الموجود'' میں لکھتے ہیں:

> ''فقیر یاد دارد کہ عمرم ہفت سال باشد کہ در مسجد پیر محمد والی واقع وطن فقیر قصبہ تھانہ بھون ضلع سہارنپور بشرف بیعت جناب سید صاحب قبلہ ممدوح قدس سرہ مشرف شد۔ اگرچہ در ایام طفلی بود، اما پرتو بزرگان کافی است''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب ۱۲۳۷ھ میں یہاں تشریف لائے ہوں گے جبھی تو مولانا کی عمر سات سال کی ہوسکتی ہے ورنہ اگر سید صاحب کا تبلیغی دورہ ۱۲۳۲ھ کا مانا جائے جیسا کہ مولانا ابوالحسن ندوی نے سیرت سید شہید میں لکھا ہے تو پھر مولانا کی عمر چار سال بنتی ہے۔ اور مولانا بڑے وثوق سے اپنی عمر اس وقت سات سال بتاتے ہیں۔

سفرِ حج ۱۲۶۳ھ

۱۲۶۲ھ میں ٹونک کے نواب وزیر الدولہ کی خواہش پر احادیث تہذیب اخلاق کا کام ٹونک میں رہ کر انجام دیا اور بعد ازاں کچھ پاپیادہ اور کچھ جہاز کے ذریعہ سفر کر کے ۱۲۶۳ھ میں حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب متوفی ۱۲۶۲ھ کے چھوٹے بھائی شاہ محمد یعقوب صاحب مہاجر سے سندِ علوم اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

حج سے واپسی ۱۲۶۴ھ

حج کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور پھر ۱۲۶۴ھ میں حدیدہ وعدن کے راستے بمبئی پہنچے۔ اثنائے راہ میں امام ابوالحسن شاذلی یمنی کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت

حاصل ہوئی۔ واپسی پر آپ نے تھانہ بھون کی پیر والی مسجد میں ہی رہنا اختیار فرمایا، ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی اور سینکڑوں نے علم حاصل کیا۔ پیر والی مسجد کا منظر ہم حافظ شہید صاحب کے بیان میں حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی اور حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری کے الفاظ میں پیش کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہاں اُس کے بیان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

نکاح اور اولاد

سب سے پہلے قاضی محبوب علی خاں کی بھانجی سے نسبت قرار پائی لیکن وہ چیچک میں نابینا ہوگئیں، یہ نسبت ختم ہوگئی۔ بعد ازاں ۱۲۵۴ھ میں غالباً دہلی کی ایک عورت سے شادی ہوئی لیکن ان سے کوئی بچہ نہ ہوا۔ پھر آپ نے مولوی محمد زمان کی بیوہ دختر سے ۱۲۷۲ھ میں نکاح کیا ان سے مولانا محمود اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ ۱۲۷۷ھ میں مرحومہ دُنیا سے رخصت ہوئیں، تو بعد ازاں قاضی عنایت علی خاں تھانوی کی حقیقی ہمشیرہ سے جو بیوہ تھیں نکاح کیا جن سے میاں محمد عمر اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پھر اس بیوہ بیوی کی سفارش پر چیچک سے نابینا ابتدائی مخطوبہ سے شادی کی جن سے حافظ محمد صدیق پیدا ہوئے جو میاں محمد عمر سے صرف ۲۲ روز چھوٹے تھے۔ والدہ محمد عمر کے انتقال کے بعد پھر میرٹھ کی ایک بیوہ سے نکاح کیا لیکن وہ بھی کچھ عرصے کے بعد راہی ملک عدم ہوئیں۔ پھر ایک اور نکاح کسی بیوہ سے کیا لیکن وہ غیر معمولی طور پر پھوڑ تھیں اس لئے ان کا حق مہر ادا کر کے ان کو طلاق دے دی۔ ان کے علاوہ ایک اور بھی خاتون سے شادی ہوئی تھی۔

میرٹھ اور ٹونک کا قیام ۱۲۷۴ھ سے ۱۲۸۰ تک

۱۲۷۴ھ سے ۱۲۷۷ھ تک آپ میرٹھ میں مسجد خیر المساجد واقع خیر نگر میں مقیم رہے جہاں بہت سے لوگوں نے بیعت کی اور ذکر وفکر اور درس وتدریس کا وہاں شغل جاری رکھا۔ ۱۲۷۸ھ میں نواب وزیر الدولہ مرحوم کے صاحبزادے نواب محمد علی خان کی خواہش پر ٹونک تشریف لے گئے جہاں نواب صاحب نے آپ سے حدیث پڑھی۔ آپ کا قیام ٹونک میں

۱۲۸۰ھ تک رہا۔

معرکۂ جہاد ۱۲۷۵ھ

جہاد ۱۸۵۷ء میں آپ کو اپنے رفقاء حاجی صاحب، حافظ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے اختلاف تھا۔ لیکن یہ اختلاف ایسا نہ تھا جس سے آپس میں کوئی مخاصمانہ رنگ پیدا ہوتا، نہ آپ نے مجاہدین کی مخالفت کی اور نہ مجاہدین نے آپ کے اختلاف سے نفرت کا اظہار کیا، بلکہ یہ ایک اجتہادی اختلاف تھا جس میں انہوں نے اپنے لئے دوسری راہ اختیار کی اور بس۔

زمین کی نیلامی

۱۸۵۷ء میں آپ کی جائیداد گورنمنٹ برطانیہ نے بغاوت کے جھوٹے الزام میں ضبط کر کے نیلام پر چڑھادی۔ نواب محمد علی رئیس ٹونک نے جو مولانا کے شاگرد تھے پینتیس ہزار روپیہ پیش کیا کہ آپ اپنی جائداد نیلام میں خرید لیں، چنانچہ مولانا نے انیس ہزار میں نیلام خرید لیا اور رسید بھی لے لی۔ مگر ضلع مظفر نگر کے کلکٹر نے بددیانتی سے اگلے ہی روز کچھ زیادہ روپیہ کے اضافے سے یہ جائداد بلدیو سہائے بیوہری کو دے دی، جس پر مولانا نے مقدمہ دائر کیا اور آخر کار مولانا جیت گئے۔ اس سلسلے میں مولانا کے معتقدین نے میرٹھ کے ایک مہاجن سے روپیہ سود پر قرض لے کر خود ہی مقدمہ لڑا تھا۔ مولانا کو جب سود پر روپیہ لینے کا علم ہوا تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ ادھر بیوہری پر جو ڈگری معہ سود ہوئی تو مولانا نے سود واپس کر دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے نواب محمود علی خاں چھتاری سے منشی محراب علی کی معرفت ۱۲۸۸ھ میں ۱۶ ہزار روپیہ قرضہ لیا بہر حال یہ سب کچھ ادا ہو گیا۔ مگر اس جائداد کے باعث مولانا دُنیاداری کے چکر میں پھنسے رہے۔ جو ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

اخلاق وعادات

آپ کے اخلاق وعادات کے متعلق حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی آپ کے مرید اپنی

کتاب ''حالاتِ محمدیہ'' میں لکھتے ہیں:

''آپ ہمیشہ پاک وصاف، نفیس وشفاف کپڑے پہنا کرتے تھے۔ لطیف وقلیل کھانا کھاتے۔ دوسرے تیسرے روز جاڑوں میں اور گرمیوں میں اکثر روزانہ نہاتے۔ باوجود موجود ہونے عظمت ہر قسم کی کبھی خودستائی کی گفتگو نہ کرتے اور کسی حالت میں کسی فرد بشر کی جرم بینی اور نکتہ چینی کی جستجو نہ کرتے کبھی کسی کو برا نہ کہتے۔ کسی وقت بے وضو نہ رہتے۔ آٹھ پہر میں کل چار گھنٹے آرام فرماتے۔ ہر امر میں اتباع سنت اسلام فرماتے۔ بعضا سائل بڑا کندۂ ناتراش ہوتا کہ ایک چھوٹے سے مسئلے کے دریافت کرنے کے واسطے دو دو گھنٹے سمع خراش ہوتا مگر آپ جواب میں ذرا بھی سختی کو کام میں نہ لاتے، نہایت نرمی سے مکرر سہ کرر سمجھاتے۔ ہر طرح اطمینان فرماتے، کبھی کسی سے ترش رو یا خفا نہ ہوتے۔ دوست ہوتا یا دشمن تخم کدورت سینۂ صفا گنجینہ میں نہ بوتے۔ بلاضرورت شرعی کہیں نہ جاتے۔ ہر وقت اپنے قیام کی جگہ بیٹھا رہنا پسند فرماتے۔ اور مسکن ومجلس، روش ارباب داد ودہش رات دن کھلا رہتا۔ سفر میں باوصف موجود ہونے سواری کے کوسوں پیدل چلتے۔

قوت حافظہ اور علمی مقام

صورت آپ کی بہت حسین تھی۔ حافظہ آپ کا بہت اچھا تھا۔ جو کتاب ایک دفعہ دیکھ لی آخر تک ازبر تھی۔ تفسیریں سب یاد تھیں۔ اصولِ فقہ تمام منضبط صحاحِ ستہ برزبان تھا......''

خلفاء، مریدین اور شاگرد

یوں تو آپ کے سینکڑوں شاگرد اور ہزاروں مرید تھے لیکن خصوصیت سے خلفا میں قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری، حکیم محمد عمر چرتھاولی تھے اور شاگردوں میں نواب محمد علی

خاں والی ٹونک، دیوان شمس الدین نائب ریاست ٹونک، قاضی شیخ محمد محدث مچھلی شہری (قاضی بھوپال) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ اپنے زمانے کے زبردست صاحب نسبت بزرگ اور بلند مرتبہ محدث تھے۔

تصنیفات

آپ نے تصنیفات کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے جو حسب ذیل ہے:

(۱) دلائل الافکار فی اثبات الجبر والاسرار۔ (۲) مناظرہ محمدیہ فی بحث بعض عقائد دینیہ مصنفہ ۱۲۶۴ھ (بجواب مولانا عبدالحق خیرآبادی کہ انہوں نے امام رازی کے بعض اقوال کی تردید میں رسالہ لکھا تھا) (۳) مکاتیب محمدیہ فی جواب اعتراض مولوی بشیرالدین قنوجی۔ (۴) ارشاد محمدی فی الاشغال والاعمال ۱۲۷۷ھ بقیام میرٹھ۔ (۵) انوار محمدی فی المراقبات والمشاہدات مطبوعہ مطبع ضیائی میرٹھ (۶) رسالہ صلوۃ۔ (۷) الہامات محمدیہ جس کا پورا نام الالہامات الموجود فی تحقیق وحدۃ الوجود والمشہود ہے۔ (۸) قسطاس فی موازنۃ اثر ابن عباسؓ یہ کتاب مولانا عبدالحیٰ فرنگی کی کتاب دافع الوسواس کے جواب میں تحریر فرمائی ہے۔ (۹) بیاض محمدی حصہ اوّل مجرب اعمال ونقوش میں ہے مسلم پریس دہلی میں چھپی (۱۰) بیاضِ محمدی حصہ دوم۔ (۱۱) شرح نسائی (۱۲) رسالہ گل ولالہ (تصوف میں میانجی نور محمد صاحب کی زندگی میں لکھا گیا) (۱۳) فتاویٰ محمدی۔ (۱۴) سماعِ موتی مصنفہ آخر ماہِ صفر ۱۲۹۶ھ آخری تصنیف ہے جو بوجہ کمزوری حکیم محمد عمر جیتھاولی کو بول کر لکھائی۔ اور مولانا رحم الٰہی منگلوری کو جو اس روز اتفاق سے آ گئے تھے سنائی۔ یہ رسالہ دراصل سماعِ موتی کے ایک استفتا کا جواب ہے۔ (۱۵) مثنوی دفتر ہفتم۔ حکیم محمد عمر صاحب نے مولانا کی بتیس کتابوں کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے تصنیف کیں لیکن بقیہ کا نام نہیں لکھا۔ قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری نے اپنے رسالے تنبیہ کے حاشیے میں ایک اور کتاب کا حوالہ دیا ہے جس کا نام (۱۶) فیضان

محمدی تھا ان کتابوں میں سے اکثر طبع ہوگئی تھیں۔ لیکن رسالہ گل ولالہ افتادی محمدی اور بعض نامعلوم کتابیں طبع نہیں ہوئی تھیں۔ البتہ بقیہ مذکورہ کتابیں چھپ چکی تھیں۔

کتب خانہ

آپ کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا جو ورثہ میں منتقل ہوا۔ مولانا کے بڑے صاحبزادے کے چار لڑکے تھے۔ میاں مسعود احمد، میاں محمد احمد، میاں محمد اعلیٰ، حافظ محمد افضل۔ پہلے دونوں صاحبزادے پاکستان میں ہیں۔ آخری دونوں کا انتقال ہوگیا۔ موخر الذکر حافظ محمد افضل کے دولڑکے میاں اسلم اور میاں اکمل مولوی عبدالاحد صاحب مالک مطبع مجتبائی دہلی کے نواسے ہوتے ہیں۔ اکمل صاحب کا تو انتقال ہوگیا البتہ اسلم صاحب زندہ ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں یہ کتب خانہ اسلم صاحب کے پاس تھا لیکن جب وہ پاکستان چلے آئے تو ان کے آتے ہی شرنارتھی قابض ہوگئے اور انہوں نے تمام کتب خانہ ردی میں کسی دوسری جگہ جاکر فروخت کردیا۔ اسلم صاحب کے مکان کے برابر میں جامعہ اشرفیہ کے مدرس رہتے تھے باقی کتابیں انہوں نے خرید لیں۔ اس طرح یہ نادر کتب خانہ ختم ہوگیا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔ (بیان مولانا سید حامد حسین امروہی خلیفہ مجاز مولانا اشرف علی صاحب تھانوی۔ بجواب خط مولانا نسیم احمد فریدی رسالہ تذکرہ دیوبند اپریل ۱۹۶۲ء ص: ۲۴)

وفات ۷ / ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ

رجب ۱۲۹۵ھ میں آپ کو تپ ولرزہ آنے لگا تھا جس سے بہت کمزور ہوگئے تھے مگر پھر حکیم محمد عمر کے علاج سے افاقہ ہوا۔ اس سال کے رمضان میں قرآن کریم سنایا۔ رمضان ہی میں حکیم محمد عمر صاحب اور قاضی محمد اسماعیل صاحب منگلوری سے فرمایا کہ آئندہ رمضان آتے دکھائی نہیں دیتے، کیوں کہ نقاہت جاری تھی، مگر اس کے باوجود تلاوت قرآن کریم، اوراد و وظائف، تہجد، اشراق اور دیگر عبادات و وظائف میں فرق نہیں آیا، تصنیف وتالیف کا کام بھی جاری رہا اور درس وتدریس کا بھی، اسی عالم میں جلد جلد نسائی شریف کا حاشیہ لکھا۔

اسی اثنا میں دوسری مرتبہ چھتاری تشریف لے گئے۔ ضعف تو تھا ہی اور ضعف ہو گیا۔ رات کو بخار ہو گیا۔ وعظ بھی کہنا پڑا اور علاج بھی نہیں کیا۔ وہاں سے لوٹے تو میرٹھ اترے اور طبیعت خراب ہو گئی۔ دواپی تو قدرے افاقہ ہوا۔ شام کو بخار بڑھ گیا اور ذات الجنب ہو گیا۔ سانس اور کھانسی کی زیادتی ہو گئی۔ تین چار دن میرٹھ میں علاج کیا۔ حکیم عبدالغفور سکندر آبادی آ گئے تو ان کا علاج کیا۔ بعدازاں تھانہ بھون پہنچے۔ شب وفات سے پہلے دِن پیر کو افاقہ محسوس ہوا۔ یہ سنبھالا تھا۔ صاحبزادہ محمد محمود جو ٹونک میں ناظر تھے وہ بھی آ گئے۔ فرمایا بس تو آج تک کا ہی قصہ تھا۔ فقیر کی چارپائی درست کرادو اور بغور قبلے کی جانب کردو۔ دیکھو میرے سامنے سے کوئی نہ گذرے۔ کوئی شخص جو خلاف ملت حضرت شفیع محشر ہو نہ آئے۔ اور تم اور محمود کھانا کھالو۔ بارہ بجے تک سب مہمانوں نے کھانا کھالیا۔ کمزوری بہت تھی لیکن پاس انفاس جاری تھا۔ فرمایا مجھے ذکر چھوڑنے کی قدرت نہیں۔ جب دِن زیادہ چڑھا تو تنفس بڑھ گیا۔ آپ نے کچھ آہستہ آہستہ پڑھا۔ دِن کے ایک بجے سلطان الاذکار میں مشغول ہو گئے۔ ہر سانس میں صاف اللہ نکلنے لگا۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ ہر طرف سے اللہ اللہ کی آواز آ رہی تھی۔ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی آخر جب تک نصف رات گذری تو مغرب کی طرف سے آندھی اٹھی۔ بادل چھا گیا۔ اور آپ آدھی رات کے وقت بارہ بجے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ایصال ثواب ہوا۔ ۷؍ربیع الثانی ۱۲۹۶ھ کو منگل کے دِن دس بجے کے قریب عیدگاہ کے قریب نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور الغرض دوپہر سے پہلے یہ نیر شریعت وطریقت زیر زمین دفن ہوا۔ حکیم محمد عمر صاحب نے حسب ذیل تاریخ نکالی۔

اے فکر رحلت مغفور ہے گر
کر شمار عدد شیخ محمد مرحوم
۱۲۹۶ھ

الحاصل

یہ ہیں مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے وہ ضروری حالات جو مولانا رومؒ کی مثنوی

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حواشی مثنوی، مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی کے دفترِ ششم کی تکمیل کے ضمن میں پیش کرنے ضروری تھے جن کا سلسلہ ان کے دفترِ ہفتم سے ملتا ہے۔

جیسا کہ مولانا شیخ محمد صاحب کی تصنیفات کے ضمن میں ان کی ایک کتاب ''مثنوی دفتر ہفتم'' کا نام آیا ہے اس مثنوی کے نام کے ساتھ ہفتم کا لفظ خود بتاتا ہے کہ مولانا نے چھٹے دفتر اور مفتی صاحب کے تتمے کے علاوہ ساتویں دفتر کی بھی ضرورت محسوس کی۔

مولانا محمد کی مثنوی پر ایک سرسری نظر

مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ کی یہ مثنوی آپ کی وفات کے بعد حکیم محمد عمر صاحب چرتھاولی کی تصحیح و ترتیب کے بعد ۱۳۰۷ھ میں بنام ''دفتر ہفتم'' مولانا روم، میرٹھ کے محبوب المطابع میں چھپی۔ اس مثنوی کو دوسرا تاریخی نام مثنوی ''شورشِ عشق'' دیا گیا ہے جس کے عدد ۱۲۷۶ نکلتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ مثنوی ۱۲۷۶ھ میں لکھی گئی۔ ٹائیٹل کی عبارت یہ ہے۔

> ''مثنوی شورشِ عشق الموسوم دفترِ ہفتم مولانا روم مصنفہ حضرت ابوالمحمود مولانا شیخ محمد تھانوی بتصحیح و ترتیب حکیم محمد عمر چرتھاولی بمحبوب المطابع واقع میرٹھ طبع گردید۔''

یہ مثنوی ۲۰x۲۶/۸ سائز پر ۲۱۹ صفحات تک پھیلی ہوئی ہے اور جو تین ہزار بائیس (۳۰۲۲) اشعار اور ایک سو چوراسی (۱۸۴) عنوانات پر شامل ہے۔ اوّل میں دو صفحوں کا مقدمہ اور آخر میں دو صفحوں کا خاتمہ نیز جابجا مثنوی پر حکیم محمد عمر چرتھاولی کے حواشی ہیں۔

مقدمے میں حکیم محمد عمر صاحب مثنوی کی وجہ تصنیف لکھتے ہیں:

> ایں مثنوی کہ حضرت جامع معقول و منقول بقیۃ المحدثین سلطان العارفین ابوالمحمود مرشدنا و مولانا شیخ محمد تھانوی ہنگام ذوق و شوق مطالعہ مثنوی معنوی بنام نہاد دفتر ہفتم مثنوی مسودہ نمودہ۔ بوجہ نا آمدن نوبت نظر ثانی شائع نفرمودہ بودند

> وباعث تصنیفش ایمائے مکرر حضرت جلال الدین رومی وضیائے مستقر حضرت شمس الدین تبریزی بود بر ذیائے معتبر وموجب نہ نمودن نظر ثانیش دیدن اجزائے مسودہ را بعالم خواب در دست مبارک جناب رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم) ومس فرمودن ہر شعر او را بانگشت شق القمر کہ در بادی النظر خبر از مقبولیتش بحیثیت موجودہ می داد۔ اگر چہ راز ے بود مستتر کہ بالآخر بوقت معہود باجتہادیکہ شایانش بود در کشاد (دیباچہ مثنوی ص:۲)

> ترجمہ : یہ مثنوی جو کہ جامع معقول ومنقول بقیۃ المحدثین سلطان العارفین ابو المحمود مرشدنا ومولانا حضرت شیخ محمدؒ تھانوی نے مولانا روم کی مثنوی کے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے وقت ''دفتر ہفتم مثنوی'' کے نام سے لکھی تھی نظر ثانی کی نوبت نہ آنے کے باعث (مولانا محمد صاحب) نے شائع نہیں کی تھی۔ اس کی تصنیف کا سبب مولانا جلال الدین رومی کا بار بار سچے خوابوں میں اشارہ کرنا اور حضرت شمس تبریز (مرشد رومی) کی قلبی نورانیت کا خواب میں پرتو فگن ہونا ہے، اور مولانا محمد صاحب کے نظر ثانی نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے خواب میں مسودے کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں اور مثنوی کے ہر شعر کو شق القمر کی انگلی سے چھوتے دیکھا تھا کہ یہ خواب بحیثیت موجودہ ظاہری نظر میں مثنوی کی مقبولیت کا پتہ دیتا تھا۔ اگر چہ تصنیف مثنوی کا یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا لیکن آخر کار ایک مقررہ وقت پر اس اجتہاد کی بنا پر کہ جو اس کے لئے شایاں تھا کھول دیا۔

مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی یہ مثنوی انتقال کے بعد ان کے خلیفہ حضرت قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری کے پاس تھی جو مولانا کے خلیفہ اور زبردست روحانی مرشد تھے۔ آپ کا فیض راقم الحروف کے قصبے یعنی شیر کوٹ کو بھی بہت پہنچا اور میرے دادا شیخ محمد حسن صاحب

مرحوم اور میرے نانا شیخ غلام مرتضیٰ صاحب مرحوم اور ان کے علاوہ شیر کوٹ کے سینکڑوں حضرات ان کے مرید تھے۔ بہر حال قاضی صاحب سے یہ مثنوی نظرِ ثانی اور ترتیب کے لئے حکیم محمد عمر کے ہاتھوں میں پہنچی جیسا کہ وہ مقدمے میں لکھتے ہیں:

> وبعد انتقال مصنف مسودہ مذکور راز ید قاضی محمد اسمٰعیل منگلوری بایں احقر محمد عمر بمراد تکمیل جلی دررسید
>
> **ترجمہ:** مصنف کے انتقال کے بعد مذکورہ مسودہ قاضی محمد اسمٰعیل صاحب منگلوری سے موٹی موٹی باتوں کی تکمیل کے لئے احقر محمد عمر (چرتھاولی) کو ملا۔

ایک سال تک حکیم صاحب نے اس کی ترتیب وتصحیح کا کچھ کام نہ کیا۔ ناگاہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ”لبانم رابلعل لبہائے مبارک خود بوسہ دادند“ اسکے بعد سے کام شروع کیا۔ محمد عمر صاحب لکھتے ہیں:

> ازاں روز فیروز درشب وروز وقتیکہ یافتم بہ تصحیحش پرداختم درستی کہ مقدر بود وتکمیلیکہ شدنی بکمال افضال الٰہی درساختم۔ تابہمہ جہت مرتب ومکمل شد۔“ (مقدمہ: ص ۳)
>
> **ترجمہ:** خواب کے دِن سے رات دِن جو وقت بھی ملا اس کی تصحیح میں مشغول رہا۔ جو درستی مقدر میں تھی اور جو تکمیل کہ ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ کی بیحد مہربانیوں سے میں نے کی۔ تا آنکہ ہر حیثیت سے مرتب اور مکمل ہوگئی۔

افتتاحِ مثنوی

مولانا شیخ محمد صاحبؒ نے مثنوی کو حسب ذیل اشعار سے شروع کرکے واقعی اپنی اس مثنوی کو مولانا روم کی مثنوی کا ساتواں دفتر بنادیا ہے اور اسی طرز میں شروع کیا ہے جس طرز میں مولانا روم نے اپنے ہر شش دفتروں کو اپنے خاص خلیفہ ومرید حسام الدین چلپی کو مخاطب کرکے کیا ہے، کیوں کہ مولانا روم سے مثنوی لکھانے کے باعث اور محرک مولانا حسام

الدین چلپی ہی تھے۔ بہر حال مولانا شیخ محمد اس طرح مثنوی کا آغاز کرتے ہیں ۔

اے محمد دیر شد جذب حُسام　　ہمچو صمصام تو ہست اندر نیام
خوش بیا واز میانش کش چو نور　　تا شود تاریکی احوال دُور
یا الٰہی بخش الٰہی بخش را　　کز جلالش بود ذکرے در ورا
دفتر سادس مکمل کرد ورفت　　عقدۂ کان بود ہم حل کرد ورفت
لیکن چوں ہر دفتر است از مثنوی　　کعبۂ دِل را طوافِ معنوی
پس ز ایمائے جلال پاک دیں　　وز ضیائے آں خور بُرج یقیں
بہر شوط سابعہ جاں چست شد　　چستیم در کار دُنیا ست شد
خواہد از آں خالق انوار شمس　　گیرد از ذرہ بغیرا کار شمس
ایں شررہا چوں بجانم ریختند　　شعلہ ہا در سینہ بر انگیختند
اندریں بودم کہ تیغ آں حسام　　مثل برق آمد بروں زابر نیام

ان اشعار میں مولانا شیخ محمد اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے مولانا حسام الدین چلپی کی کشش اور جذب کا ذکر کر رہے ہیں۔ چونکہ مولانا رومی کی مثنوی کا مطالعہ کرتے تھے اس لئے ایک رات خواب میں شمس تبریز اور مولانا جلال رومی کو دیکھا کہ دونوں تشریف رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم بھی کوئی ایک مثنوی لکھو، جیسا کہ محمد عمر پہلے شعر کے حاشیہ نمبر ایک میں لکھتے ہیں کہ مولانا شیخ محمد صاحب شاعری کا ذوق بالکل نہیں رکھتے تھے اس لئے مثنوی لکھنے کا خیال بھی نہیں کیا۔ پھر تقریباً بائیس تیئس مرتبہ ان بزرگوں کو خواب میں دیکھا جن میں حسام الدین چلپی بھی تھے، چنانچہ مولانا محمد صاحب نے مثنوی لکھنی شروع کی۔ آپ نے پہلے شعر میں جذب حسام الدین کے ماند ہو جانے اور اس کو بیدار کرنے کا ذکر کیا ہے۔ پھر مفتی الٰہی بخش صاحب کے دفتر سادس کے مکمل کرنے کا ذکر ہے۔ بعد ازاں اپنے ساتویں دفتر لکھنے کی وجہ بیان کی ہے کہ چونکہ مثنوی کے چھ دفتر عاشقان خدا کے دِل کے لئے کعبہ

معنوی ہیں اور خانہ کعبہ کے سات طواف ہوتے ہیں جن کے بغیر طواف مکمل نہیں ہوتا، اس لئے ساتویں دفتر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مولانا محمد میں خود مثنوی کا یہ دفتر لکھنے کا جذبہ نہ تھا لیکن جیسا کہ انہوں نے دسویں شعر میں کہا ہے کہ غیبی قوتوں اور منشیان قضا قدر نے میری روح میں دفتر ہفتم کے معانی بھر دیئے اور میرے سینے میں جذب وشوق کے شعلے روشن کر دیئے اور مزید برآں خود حسام الدین چلپی کی تیغ برق کی مانند نیام کے بادل سے نکلی جس کی چمک نے مجھے مثنوی لکھنے پر مجبور کر دیا۔ اور یوں تو ساتویں دفتر کا لکھا جانا مولانا روم کے خیال میں بھی تھا جیسا کہ ان کے فرزند نے ان کو یاد دلایا تھا۔

ہمارا مقصد مثنوی پر تبصرہ کرنا نہیں یہ تو مستقل مضمون چاہتا ہے، بلکہ ایک تسلی بخش تعارف ہے۔ بہر حال مولانا محمد نے مذکورہ بالا اشعار سے مثنوی کا آغاز کیا اور بعد ازاں مولانا روم کے طرز میں کہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، کہیں حضرت ابوبکر، پھر حضرت عمر، بعد ازاں حضرت عثمان وعلی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عنوانات کے ماتحت ان کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ کہیں ''خوبی صحبت شیخ'' کا عنوان ہے اور کہیں ''کیفیات امراض روحانی وعلاج آں'' کی سرخی، کہیں ''در فوائد ادب وانکساری'' پر اشعار میں مضمون لکھے ہیں اور کہیں ''شب بیداری اختیار کردن حضرت امام اعظمؒ'' پر اشعار ہیں۔ کہیں ''در مذمت بے حیائی وحرص'' پر خیال آرائی کی ہے اور کہیں ''در مذمت دنیا وبے شرمی'' غرض اسی طرح تمام مثنوی نہایت پر شکوہ، برجستہ، چست الفاظ میں عمدہ پیرائے کے ساتھ تحریر فرمائی ہے کہ کہیں بھی بندش میں جھول نظر نہیں آتا۔ ہم مختلف جگہ سے نمونے کے طور پر چند اشعار لکھ کر مولانا شیخ محمد محدث تھانوی کا ذکر جمیل ختم کرتے ہیں اور ان کی روح کو خوش کر کے سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا عشق کے متعلق لکھتے ہیں۔

چیست عشق اے عاشق شوریدہ کیش　　دار ہاند مرترا از غیر خویش
عشق آں کام و زباں را سوختہ　　عشق آں بالب دہاں را سوختہ

عشق آں خواب وخورش کم می کند   دیدہ پُر تم سینہ پُر خم می کند
کیں حدیث قدسیِ از مصطفیٰ است   منزل حق در ضمیر باصفا است

معجزۂ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم در جنگ اُحد

بر سر کفار زو چوں مشت خاک   شد قبای حال ایشاں چاک چاک
رمی آں ہم او بخود منسوب کرد   تا نماند بر رُخ کار تو گرد
فعل نائب ہست بل فعل منیب   از حبیب آید چہ بے اذن حبیب
از دِل وجاں ہر کہ محو یار شد   صورت آہن فنا در نار شد
کرد قوے جبر زینجا اختیار   گشت قوے مالک ومختار کار
رمز اَللہ معی را اے جواں   شاہد تفسیر ایں معنی بداں

سبب مقبول نشدن ایمان فرعون بوقتِ غرق

دانکہ در ایمان فرعون پلید   رد و نا معقولیت آمد پدید
باعثش تنہا نہ وقت باس بود   نے ہراس غرق ومرگ یاس بود
بلک چوں آمنت باللہ صرف گفت   شد بمعبودش کہ شیطان بود جفت
گفتے آمنت بربِّ موسیٰ ار   یافتے از آتش دوزخ مفر

پند

اصل دُنیائے دنی چوں در جہاں   زن، زمین وزر سہ چیز اند اے جواں
تا توانی چشم دِل برشاں منہ   خار آہن در رہ ایماں منہ
چوں نہی پائے طلب در راہِ حق   گیر باخود ہمت آگاہ حق

ذکر پیر ومرشد نور محمد صاحب جھنجھانوی حافظ محمد ضامن وحاجی امداد اللہ صاحبان

چوں بغیر او دمی ناسودہ ایم   نور از نور محمد بودہ ایم

نیک می نہ بد چو نازم از طرب   مرشد کامل عنایت کرد رب

اے جواں بخت ار تو داری فکر پیر   دامن نور محمد خوش بگیر

گر نہ از قسمت رسد دستت باد   در حضور نائبانش آر رد

یعنی الفت گیر باضامن علی   تا شوی روشن ز انوارِ جلی

در میسر ناید از صہبائے وے   خیزد گیر از جام امداد اللہ مے

پھر حاجی امداد اللہ صاحب کی تصنیفات کی طرف

یہ چند اشعار تبرک اور نمونے کے طور پر ہم نے پیش کیے ہیں تاکہ آپ مولانا محمد صاحب کی مثنوی کا معنوی اور ادبی جائزہ لے سکیں۔ اب ہم پھر حاجی امداد اللہ صاحب کے ذکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہم ان کی تصنیفات کے سلسلے میں ان کے مثنوی مولانا روم کے حواشی کا آپ سے تعارف کرا رہے تھے جن پر ہم سیر حاصل تاریخی تبصرہ کر چکے ہیں اب ان کی بقیہ تصنیفات کی طرف آپ کو لئے چلتے ہیں۔ چنانچہ ان کی تصنیف کا دوسرا نمبر پیش کرتے ہیں۔

(۲) غذائے رُوح ۱۲۶۴ھ

یہ ایک مثنوی ہے جو حاجی صاحب نے ۱۲۶۴ھ میں لکھی۔ تحریر فرماتے ہیں:

سال ہجری بھی ہوا جب ختم یار   یک ہزار دو صد وشصت وچہار

جب ہوئی یہ مثنوی یارو تمام   رکھ دیا اس کا غذائے رُوح نام

ان دونوں شعروں سے مثنوی کا ہونا، غذائے رُوح نام رکھنا اور ۱۲۶۴ھ میں تحریر کرنا صاف ظاہر ہوتا ہے۔ حاجی صاحب نے تحقیق کرنے والے کے لئے یہ کام نہایت ہی خوش کن کیا ہے کہ اپنی ہر تصنیف کا سن، نثر کی کتاب کا نثر میں اور نظم کی کتاب کا نظم میں ضبط کر دیا ہے۔ اس مثنوی میں جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے رُوح کی غذا فراہم کی گئی ہے۔ اس میں عجیب وغریب قصوں اور حکایات کے پیرائے میں شیطان کے وسوسے، نفس کے مغالطے

اور جہالت کے نتیجے بیان کیے ہیں اور عاشقانِ صادق کے ولولے اور جوش کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع میں حمد و نعت، خلفائے اربعہ کی مدح ہے پھر میانجی نور محمد جھنجھانوی ؒ کا ذکر ہے بعد ازاں پھر ایک مناجات ہے، اس کے بعد پھر اپنے پیر و مرشد کے احسانات کا ذکر کیا گیا ہے پھر ذوق و شوق محبت الٰہی کے اشعار ہیں، بعد ازاں کتاب نان و حلوہ از تصنیف بہاؤ الدین عالی کا ذکر کر کے اس کے مضامین سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں تاسف و ندامت و ضیاعِ عمر، گوشہ نشینی اور قطع علائق دُنیا، حکایت عابد جاہل، مذمت علمائے نفور از فقرا و محبین امرا، حب الوطن من الایمان، عشق میں مصائب، ریاکاروں کی مذمت غرض کہ اسی قسم کے معرفت اور طریقت کے مضامین اس مثنوی میں بیان کیے گئے ہیں۔

صفحات اور اشعار

یہ مثنوی چھیاسی صفحوں اور سولہ سو پچاس اشعار پر مشتمل ہے، ایک مقام پر لکھتے ہیں:

گوشِ جاں سے سُن تو بلبل سے ذرا   یار کی باتوں سے یہ کہتی ہے کیا
ہے یہ بلبل یار کے گلزار کی   پوچھ باتیں اس سے اس دلدار کی
قاصدا جلدی خبر مجھ کو سُنا   کہتا ہے حق میں مرے کیا دِل رُبا
مجھ سے راضی بھی ہے وہ دِلبر بتا   اور مائل بھی ہے کچھ سوئے وفا
یا ہمیشہ ہجر پر مسرور ہے   سچ بتا جو کچھ اسے منظور ہے
آفریں اے بلبل خوش خواں تجھے   ماسوا سے کردیا فارغ مجھے

غرض کہ اسی طرح عنوانات کے ماتحت یہ تمام مثنوی منظوم ہے۔

۳۔ جہادِ اکبر ۱۲۶۸ھ

یہ بھی حاجی صاحب کا منظوم اردو رسالہ ہے جو ۱۲۶۸ھ میں لکھا گیا ہے۔ حاجی صاحب فرماتے ہیں۔

غرض جب ہوا یہ رسالہ تمام   جہادِ اکبر اس کا رکھا میں نے نام

یہ مضمون تھا فارسی میں لکھا   کسی مردِ حق نے بصد پر ضیا
کیا میں نے ہندی ملاکر کچھ اور   کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور
سن وسال ہجری خیر الانام   تھے بارہ سو اڑسٹھ ہوا جب تمام

ان اشعار سے کتاب کا نام، سن تالیف ظاہر ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حاجی صاحب نے کسی شخص کے فارسی قصے کو اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور اپنی طرف سے بھی اس میں مضمون کا اضافہ کیا ہے۔

اردو کا نام ہندی

ان امور کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت معلوم ہوئی کہ ۱۲۶۸ھ میں حاجی صاحب نے اب سے ایک سو نو سال پہلے اردو کو ہندی کے نام سے یاد کیا ہے۔ گویا اردو کو اس دور میں ہندی کہتے تھے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر ؎

کیا میں نے ہندی ملاکر کچھ اور   کہ تا خاص اور عام سمجھیں بغور

آغاز

کتاب کا آغاز عہد خدا سے کیا گیا ہے ؎

الٰہی تو ہے وحدہٗ لا شریک   بنایا ہے تو نے ہر ایک شے کو ٹھیک

بعد ازاں حسب ذیل عنوانات کے ماتحت اشعار تحریر فرماتے چلے گئے ہیں۔

۱...... حمد و نعت، مناجات، غفلت میں عمر بسر ہونا، نفس کو ڈانٹنا، نفس کا جواب، نفس سے عاجزی اور سلطان روح سے امداد، جسم میں نفس وسواس کا جاسوسی کرنا، نفس کے مقابلے میں روح کا وزیر عقل کو بھیجنا، وزیر عقل کا امیر تقویٰ کو مقابلے کے لئے بھیجنا غرض کہ نفس اور روح کا مقابلہ کر کے نفس پر کنٹرول کرنے کو حاجی صاحب نے جہاد اکبر کہا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

کہا نفس کو آخرش میں نے رات   کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات
خبر حال کی اپنے تجھ کو نہیں   کہ آیا تھا یاں کس لئے اے لعیں

بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا   یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

تعداد اشعار وصفات

اسی طرح تمام رسالہ منظوم ہے اور جو تیئیس ۲۳ صفات اور چھ سو اناسی اشعار پر مشتمل ہے۔

مثنوی تحفۃ العشاق ۱۲۸۱ھ

یہ رسالہ بھی تمام کا تمام منظوم ہے جس کا نام مثنوی تحفۃ العشاق ہے۔ یعنی عاشقان خدا کے لئے اس میں معرفت کے مضامین ہیں۔ حاجی صاحب نے اس کو ۱۲۸۱ھ میں تصنیف فرمایا۔ رسالے کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

بارہ سو تھے اور اکاسی سال ہجر   ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر
ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام   تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

ان دونوں اشعار سے رسالے کا نام اور تصنیف کا سال صاف ظاہر ہے۔

آغازِ کتاب

اس مثنوی کو حسب دستور وعادتِ حاجی صاحب نے حمد خدا مناجات اور نعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے آغاز کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

حمد بے حد ہے سزاوار احد   ہیں احد میں محو سب محدود وحد
حمد ہے اس کو جو خود موجود ہے   اور سوا اس کے جو ہے نابود ہے

حمدِ خدا، مناجات، نعت پیغمبرؐ کے بعد خلفائے اربعہ اور اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل قصہ شروع کیا گیا ہے۔

حاجی صاحب نے اس مثنوی کی تصنیف کا ذکر خود آغاز کتاب میں حسب ذیل عنوان میں کیا ہے:

”در بیانِ باعث نظم وتصنیف ایں مثنوی مسمیٰ بہ تحفۃ العشاق ومدح عقل

جز دی۔'' (تحفہ ص:٦)

اشعار باعث نظم کتاب کا تحریر کرنا یہاں طوالت سے خالی نہیں۔ البتہ مختصر طور پر منتخب کر کے لکھتا ہوں۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

ہوگیا اے دوستو یوں اتفاق   باعث تحریر نظم پر مذاق
رہتا تھا مسجد میں اپنے متصل   مجمع علماء وصلحاء اہلِ دِل
ایک دِن پڑھتا تھا میں نفحاتِ انس   لے رہے تھے حق سے سب نفحاتِ انس
جوش پر تھا بحر علمِ عارفاں   ہو رہے تھے گوہر معنی عیاں
رفتہ رفتہ حضرت تحفہ کا ذِکر   آ گیا اس عاشق خستہ کا ذِکر
سُن کے ان کی شان و شوکت جاہِ عشق   ہمت مردانہ اندر راہِ عشق
بول اٹھا ہر اک بصد ذوق وسرور   ہے یہ قصہ حمد کے لائق ضرور
خاص کر قطب زماں شاہِ وفا   آفتاب معرفت بحر صفا
کامل اکمل ولی بے بدل   عاشق ذاتِ خدائے لم یزل
برگزیدہ دوجہان مقبول رب   مشرب چشتی وفاروقی نسب
یعنی شیخ حافظ محمد ضامن آپ   مجھ کو فرمانے لگے کر کے خطاب
نظم کر اس قصۂ پُر درد کو   گرم کر اک بار ہر دِل سرد کو
مثنویاں ہیں مجازی عشق میں   پر بہت کم ہیں حقیقی عشق میں
قصۂ تحفہ اگر منظوم ہو   رتبۂ عشاق حق معلوم ہو
ریختہ میں نظم کر اس کو خام   تا کہ سمجھیں اس کو سارے خاص وعام

ان اشعار سے مثنوی کے نظم کرنے کا سبب ظاہر ہوتا ہے۔ حافظ ضامن حسن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ جن کی فرمائش پر یہ مثنوی حاجی صاحب نے تحریر فرمائی، آپ کے زمانہ کے وہی صاحب نسبت ولی اور بزرگ تھے جو قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر کے جہادِ حریت ۱۸۵۷ء

میں شہید ہوئے خود حاجی صاحب اپنے ایک مکتوب میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید کے فرزند حافظ محمد یوسف صاحب کو مکہ مکرمہ سے خط لکھتے ہیں:

> مثنوی تحفۃ العشاق کہ بموجب ارشاد حضرت حافظ محمد ضامن صاحب رحمہ اللہ علیہ منظوم کردہ ام ہم میرسد قبول نمایند زیرا کہ آں عزیز را بجائے موصوف میدانم اگر توانند یک نسخہ نقل کنانید نزد فقیر بفریسند کہ نزدم بجز مسودۂ او نماندہ است۔

اسبابِ نظم کے بعد حاجی صاحب نے حضرت بی بی تحفہ مغنیہ کا ذِکر شروع کیا ہے بعد ازاں تمیز عشق حقیقی و مجازی اور عشق مجازی کی مذمت کا ذکر فرما کر حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی داستان لکھی ہے، پھر سری سقطی کی ملاقات حضرت بی بی تحفہ سے اور ان بی بی کے غلبۂ عشق کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں موسیٰ علیہ السلام اور چرواہے کا ذکر ہے۔ حضرت سری سقطی نے بی بی تحفہ کو زنجیر و سلاسل میں بند دیکھا تو داروغہ سے پوچھا کہ اس حسینہ کو بزنجیر کیوں رکھا ہے، داروغہ نے کہا یہ ہمارے آقا کی باندی ہے، اس کا علاج مقصود ہے، اس بات پر حضرت بی بی تحفہ جو خدا کی سچی عاشقہ تھیں رو پڑیں۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

جب یہ داروغہ سے لونڈی نے سُنا روپڑی اک بار اور سر کو دُھنا
دردناک اک کھینچ کرکے دِل سے آہ بولی، ہوں میں اے عزیزو بے گناہ
اے مسلمانو! نہیں مجنون میں اپنے دِل بر کی ہوں پر مفتون میں
سمجھو تم موسیٰ کا چرواہا مجھے جس کے دِل سے بے خبر موسیٰ رہے

الغرض حاجی صاحب نے اس عورت کا جو اپنے مولیٰ کے عشق میں جل چکی تھی اس مثنوی میں قصہ بیان کیا ہے اور جابجا تمثیلوں سے عشق حقیقی کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعد ازاں حضرت سری سقطی کی بی بی تحفہ کے مالک سے ملاقات اور تحفہ کا دِن بدن عشق الٰہی میں جلنے کا ذِکر کیا ہے۔ آخر کار سری سقطیؒ نے تحفہ کو مالک سے خریدنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پاس ایک پائی

نہ تھی۔ بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو کر دُعا کی کہ بارالٰہا میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اتنی دولت دے کہ میں تحفہ کو خرید لوں، آخر ایک امیر احمد بن مثنی اپنے غلاموں کے ہمراہ در پر آیا اور دروازہ کھٹکھٹا کر کہنے لگا کہ مجھے ہاتف غیبی نے ندا دی کہ سری کے پاس سونے کی چند تھیلیاں لے کر پہنچو اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ یہ تھیلیاں لے کر سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ مالک کے پاس پہنچے اور کہا کہ تحفہ کو میرے ہاتھوں بیچ دے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ انہوں نے چالیس ہزار درہم تک قیمت لگا دی لیکن حضرت بی بی تحفہ کے مالک نے کہا کہ اگر ساری دُنیا بھی اس کے عوض میں کوئی دے تو نہ لوں گا۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

میں نہیں دیتا ہوں اس تحفہ کو اب   قیمت اس کی دے سکے گا کوئی کب
قیمت تحفہ ہے بس اس سے سوا   اس سے اس کو کب کروں دِل سے جدا
پھر بڑھائے اور درہم چند بار   بڑھتے بڑھتے پہنچے تا چالیس ہزار
رد کے تاجر نے کہی آخر یہ بات   خواب میں حق نے کہا مجھ کو یہ رات
یعنی ہے مقبول حق "تحفہ" ضرور   پاس میرے، خویش و بیگانہ سے دُور
جان سے میرے طرف مائل ہے یہ   ہے نہ دیوانی بہت عاقل ہے یہ
ہوگیا جب ظاہر اس کا مرتبا   کر سکے کون اس کی اب بیع وشرا

آخر کار حضرت بی بی تحفہ کا اثر تاجر پر ہوا اور وہ خود فقیر بن گیا اور تمام مال خدا کی راہ میں لٹا دیا اور حضرت تحفہ کو آزاد کر دیا۔ آزاد ہو کر بی بی تحفہ خلق سے کنارہ کش ہو گئیں۔ آزادی کے بعد بے تحاشا روتی تھیں اور عشق خداوندی میں جان کھوتی تھیں۔ دِل میں آگ لگی تھی اس کا بجھنا بغیر وصل یار ناممکن تھا۔ حضرت سری سقطی نے فرمایا اب تم آزاد ہو چکی ہو رونے کی بجائے خوش ہونے کا مقام ہے انہوں نے جواب دِیا۔ حاجی صاحب اس کی ترجمانی میں لکھتے ہیں۔

اس سے اس پر ہنستی یا روتی ہوں میں   واسطے اس کے ہی جاں کھوتی ہوں میں

ماہی بے آب کو کب ہو قرار   ہو نہ جب تک بحر تک اس کا گذار
کہہ کے یہ اور اٹھ کے بازاری وآہ   چھوڑ کر ان سب کو لی جنگل کی راہ
شیخ اور تاجر وغیرہ بعد ازیں   باہر آئے دیکھا تحفہ کے تئیں
ڈھونڈا اس کو گرچہ سب نے جابجا   پر نہ تحفہ کا پتہ ان کو ملا
جب نہ تحفہ کا پتہ ان کو ملا   کردیا پھر عزم بیت اللہ کا

الغرض شیخ سری سقطیؒ، امیر احمد مثنّی جنہوں نے حضرت سری کو سونے کی تھیلیاں لاکر دی تھیں اور حضرت تحفہ کا سابق آقا تینوں نے مکہ معظمہ کی راہ لی۔ راستے میں امیر احمد انتقال کرگئے۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

مرگیا ان میں سے رستے میں امیر   حسرت و درد و الم کا کھا کے تیر

لیکن حضرت سری سقطی اور تاجر دونوں بیت اللہ پہنچے۔ ایک روز جب کہ دونوں بیت اللہ کا طواف کررہے تھے کہ ایک پُر درد آواز کان میں آئی کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے۔

اے مرے معبود اے محبوب دِل   اے میرے مقصود اے مطلوب دِل
ہے چراغِ شب، سیہ روز ونکا تو   شادیِ دل ہے غم اندوزوں کا تو
پیاس تیرے شوق کی رکھتا ہے جو   تیرے آبِ وصل سے کب سیر ہو
جو کہ ہو غم سے ترے پُر اضطرار   بن ترے دیکھے اسے کب ہو قرار
سن کے اس سے شیخ، مضمون دُعا   مثل سیل اشک اس جانب چلا
جا کے دیکھا اک طرف اک خستہ تن   سر بسجدہ خاک میں ہے نعرہ زن
سُن کے اسدم، شیخ کی آواز پا   چونک اٹھی یک بارگی وہ پارسا

شیخ سری سقطی نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے جواب دیا۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں۔

تم گئے کیا بھول اے سرّی مجھے   میں ہوں تحفہ مول لیتے تھے جسے

شیخ نے اس کو غور سے دیکھا تو تنکے کی مانند تھی کہ جسم پر گوشت کا نام نہ تھا اور ایک گڑھے میں پڑی تھی اور جسم پر اتنی خاک تھی کہ مٹی ہو گیا تھا۔ حضرت سقطی نے پھر بی بی تحفہ سے دریافت فرمایا کہ تم اب کس مقام پر ہو اور دربارِ حبیب سے تمہیں کیا ملا ہے اس پر تحفہ نے جواب دِیا۔ حاجی صاحب لکھتے ہیں ؎

خلق سے جسدم ہوتی ہوں میں نہاں   جو نہاں تھا ہو گیا مجھ پر عیاں

سری سقطی نے فرمایا کہ جس امیر احمد مثنی نے تمہارے خریدنے کے لئے مجھے روپیہ دیا تھا وہ محبت میں راستے میں ہی مر گیا۔ تحفہ نے جواب دِیا ؎

یوں کہا تحفہ نے اے نیکو سرشت   ہے وہ ہمسایہ مرا اندر بہشت
حق نے بخشا ہے اسے وہ مرتبا   آنکھ نے دیکھا نہ کانوں نے سُنا

سری سقطیؒ نے فرمایا اور وہ تاجر جس نے تمہیں آزاد کیا وہ تمہاری ملاقات کا حد سے زیادہ دلدادہ ہے۔ اس پر تحفہ نے کہا ؎

سُن کے تحفہ نے دُعا اک دِل سے کر   مرگئی رکھ کر در کعبہ پر سر
دَم میں بھر کر سانس ٹھنڈا مرگئی   عشق کے سب کام پورے کرگئی
عمر طاعت میں گذاری یار کی   مرد وار آخر کو جاں بھی وار کی
چھوڑ کر اے دِل یہ روبہ شانگی   سیکھ لے اس زن سے تو مردانگی

حاجی صاحب نے اس آخری شعر کے دوسرے مصرع میں اپنی مثنوی کا نقطۂ خیال پیش کر دیا ہے کہ کس طرح ایک ولیہ کاملہ کے باعث ایک تاجر اور ایک امیر خدا رسیدہ بن گئے۔

آخر کار حضرت بی بی تحفہ جب درِ کعبہ پر سر رکھ کر خدا سے جا ملیں اور بقولِ شاعر ؎

سر ہو قدموں پہ ترے اور اجل آئی ہو

اپنے حبیب کے قدموں میں جاں نثار کر دی تو تاجر وہاں پہنچ گیا اب اس پر تحفہ کو مردہ دیکھ کر کیا گذری، حاجی صاحب لکھتے ہیں ؎

آ گیا تاجر بھی ناگہ اس گھڑی　　دیکھا تحفہ کو کہ ہے مردہ پڑی
بے دِلی سے وہ بھی گر کر خاک پر　　مر گیا تحفہ کے رکھ پاؤں پہ سر
دیکھ کر یہ حال بولے شیخ یوں　　انا للہ وانا الیہ راجعون
بعد ازاں تجہیز اور تکفین کر　　خاک میں دونوں کو سونپا سر بسر

دونوں کو دفن کرنے کے بعد شیخ سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ حج کے بعد وطن کو واپس تشریف لائے۔

خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر

یہ ہے حضرت حاجی صاحب کی مثنوی کا خلاصہ۔ جس مضمون پر ان کی یہ مثنوی گردش کر رہی ہے۔

تعداد صفحات واشعار

اس مثنوی کے بتیس صفحے ہیں اور اشعار کی کل تعداد تیرہ سو چوبیس (۱۳۲۴) ہے جس میں وہ مناجات بھی شامل ہے جو اس مثنوی کے آخر میں حاجی صاحب نے لکھ کر شامل فرمائی ہے۔

دردنامۂ غمناک

یہ رسالہ مختصر سی آٹھ صفحوں کی نظم ہے۔ جس میں شاعر نے اپنے عشق حقیقی اور جذبۂ بے خودی کی ترجمانی کی ہے۔ اس رسالے کے نام سے ہی اس کی دردمندی اور غمنا کی کا پتہ چلتا ہے۔ ابتدا سے آخر تک اس مثنوی میں شعلۂ عشق بھڑکتا نظر آتا ہے جو عاشق شاعر کو جلا رہا ہے۔ اس کے پڑھنے سے دِل پر چوٹ لگتی ہے اور دِل پر شدید اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگ اس کو پڑھ پڑھ کر سر دھنتے ہیں اور اپنے اوپر کیفیت طاری کرتے ہیں۔ امداد المشتاق میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی روایت ہے کہ حاجی صاحب ایک دفعہ کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص دردنامۂ غمناک پڑھ رہا تھا۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا

پڑھ رہے ہو وہ اپنی پڑھائی میں مست تھا حاجی صاحب سے بے رُخی سے پیش آیا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ اس کتاب کے ناظم یہی ہیں تو بہت شرمندہ ہوا اور احترام سے پیش آیا۔

تعداد اشعار

اس نظم کو مختلف عنوانات کے ماتحت ناظم نے نظم کیا ہے اور اس میں کل اشعار ایک سو پچھتر ہیں۔

ارشاد مرشد ۱۲۹۳ھ

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو سولہ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے اس میں نمازوں کے بعد کے وظائف اذکار و اشغال اور مراقبات، طریق اثباتِ مجرد، طریق اسم ذات، طریق ذکر پاس انفاس، ذکر اسم ذات ربانی، اور لطائف ستہ کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے شجرے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ آخر میں شجرۂ پیران چشت کو ایک مثلث میں بیان کیا ہے۔ جس کا آغاز اس طرح ہے ۔

تو اگر چاہے قبولیت دُعا کے واسطے　　عرض کرتا شاہ یوں اوّل خدا کے واسطے
حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے
ہے درود و نعت ختم انبیا کے واسطے　　اور سب اصحاب آلِ مصطفیٰ کے واسطے
فضل کر ہم پر الٰہی مجتبیٰ کے واسطے

سب سے آخر میں نصائح متفرقہ کے عنوان کے ماتحت مختلف اقوال پیش کئے ہیں جن میں سبق آموز نصیحتیں ہیں، مثلاً

> ’’اے پسرم آدم! از فکر من ایمن مباش، مادام کہ از صراط نگذشتہ باشی‘‘ اے پسر آدم نترسی از قوت ورزق، مادام کہ خزانہ من پُر یابی خزانہ من ہرگز فانی و تہی نمی شود۔‘‘

تاریخ تصنیف

یہ رسالہ جیسا کہ حاجی صاحب نے اس کے آخر میں تاریخ درج فرمائی ہے ۲؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۳ھ میں پایہ اختتام کو پہنچا ہے اور میرے پیش نظر مطبع مجیدی کانپور کا دسمبر ۱۹۲۱ء محرم ۱۳۴۰ھ کا چھپا ہوا ہے مگر اس سے پہلے بھی مختلف جگہ اس کے ایڈیشن چھپے ہیں۔

ضیاء القلوب ۱۲۸۲ھ

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ حاجی صاحب نے اس کو حافظ محمد یوسف صاحب صاحبزادہ جناب حافظ محمد ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر مکہ مکرمہ میں ۱۲۸۲ھ میں لکھ کر ختم فرمائی۔ اس کتاب کا تاریخی نام رسالہ ''مرغوبِ دِل'' ہے جس کے عدد میں نے تو نہیں نکالے البتہ حاشیہ پر محشی نے یہ تاریخی نام لکھ کر ۱۲۸۲ھ عدد لکھے ہیں۔ حاجی صاحب دیباچے میں لکھتے ہیں:

> بعضے از یاران طریقت خصوصاً عزیزم، سعید کونین، پسندیدہ اخلاق، حافظ محمد یوسف فرزند رشید امام العاشقین عارف باللہ کامل اکمل حافظ محمد ضامن شہید فاروقی چشتی رحمۃ اللہ علیہ ملتمس شدند وباعث بریں گردیدند کہ آنچہ اذکار واشغال ومراقبات خاندان عالیہ چشتیہ صابریہ قدوسیہ معمول اند، برائے مایاں بقلم آرد، تا در مفارقت بعیدہ کہ تو خدمت حرمین شریفین اختیار کردہ ومایاں دور دراز در ہندوستان افتادہ ایم برآں عمل کردہ آید، وآئندہ را ہم بکار آید۔

> بعض درویش مشربوں نے خاص طور پر عزیزم، سعید کونین، خوش اخلاق، حافظ محمد یوسف نے جو کہ امام العاشقین عارف باللہ کامل اکمل حافظ محمد ضامن شہید فاروقی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادہ ہیں، انہوں نے مجھ سے التماس کیا اور اس رسالے کے لکھنے کے باعث ہوئے، جو کچھ عالیہ خاندان چشتیہ صابریہ قدوسیہ کے اذکار واشغال ہیں ہمارے لئے جو کہ آپ کی جائے قیام حرمین

شریفین سے دور ہندوستان میں پڑے ہوئے ہیں تحریر فرمائیں تاکہ ان پر عمل کرسکیں اور آئندہ کے لئے بھی یہ کتاب مفید و کارآمد ہو۔

مثنوی شریف کے حواشی اور فوائد کے بعد حاجی صاحب کی یہ تصنیف تصوف کا خلاصہ اور جوہر ہے جس میں ہر قسم کے اذکار واشغال وظائف اور عبادات کے ماتحت بیان کئے گئے ہیں، اس کتاب کی وقعت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حاجی صاحب لکھتے ہیں:

> از وفور التماس عزیزاں چارہ ندیدہ وملتجی بجناب قدس حق تعالیٰ گردیدم پس بدلم القا شد کہ بنویس۔
>
> دوستوں کی کثرت خواہش پر کوئی چارہ نہ دیکھ کر خدائے قدوس کی بارگاہ میں ملتجی ہوا اور میرے دِل میں القا ہوا کہ لکھ۔

توجس کتاب کے لکھنے کے لئے بارگاہِ قدس کی طرف سے القا ہو اس کتاب کی توصیف اور کوئی کیا بیان کرے، اس کتاب کی حقیقت کا اندازہ اہل دِل اور عاشق نور حقیقت ہی کرسکتے ہیں۔ البتہ مجھے جو اس کتاب کے پڑھنے سے فائدہ ہوا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مجھے تصوف کی حقیقت کا نور اس میں چمکتا نظر آیا۔ اور اسی کتاب سے مجھے ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (نماز بے حیائیوں اور بری بات سے روکتی ہے) کی حقیقت کا پتہ چلا اور اسی کتاب سے مجھے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت کس طرح کرنی چاہئے اور نماز کس طرح پڑھنی چاہئے۔

وحدۃ الوجود ۲۱/ ذی الحجہ ۱۲۹۹ھ

یہ دراصل ایک طویل خط ہے جو مضمون کی صورت اختیار کر گیا ہے اور جو سات صفحات پر فارسی زبان میں ہے۔

ایک صاحب مولوی محمد عبدالعزیز صاحب نے حاجی صاحب کو خط لکھا تھا کہ آپ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور آپ کے مریدین میں مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند اور

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی اور مولانا احمد حسن رحمہم اللہ علیہم وحدۃ الوجود کے مخالف ہیں بلکہ ایسے شخص کو زندیق کہتے ہیں۔ اس تحریر کے جواب میں حاجی صاحب نے مسئلہ وحدۃ الوجود کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہ اس مسئلہ کے مخالف نہیں ہیں۔

فیصلہ ہفت مسئلہ

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جو بارہ صفات پر مشتمل ہے۔ اس میں ان مسائل پر روشنی ڈالکر فیصلہ کیا گیا ہے جو ہندوستان کے علما میں اختلاف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مثلاً (۱) مولود شریف، (۲) فاتحہ، (۳) عرس وسماع، (۴) ندائے غیر اللہ، (۵) جماعت ثانیہ، (۶) امکان نظیر، (۷) امکان کذب۔

اس رسالے کے دیباچے میں مصنف کی طرف سے لکھا ہوا ہے:

> ''فقیر امداد اللہ الحنفی الچشتی عموماً سب مسلمانوں کی خدمت میں اور خصوصاً جو اس فقیر سے ربط وتعلق رکھتے ہیں عرض کرتا ہے (فیصلہ ہفت ص:۲)

اس رسالے کی تصنیف کے متعلق حاجی صاحب کی زندگی ہی میں شور تھا کہ یہ حاجی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ زبانوں پر مولانا اشرف علی صاحب کا نام آتا رہا اور انہی کی کتابوں کی فہرست میں یہ رسالہ درج بھی ہے اس کو حاجی صاحب کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں امداد المشتاق کی حسب ذیل عبارت جو حاجی سید نور الحسن صاحب ساکن دتہری کی روایت سے ہے ملاحظہ کیجئے۔ سید نور الحسن صاحب اپنے دوسرے سفر حج کے واقعات کے ماتحت روایت کرتے ہیں:

> ''ہندوستان میں بمقام قصبہ خورجہ (ضلع بلند شہر) ایک خانصاحب مرحوم خورجوی نے بسبیل تذکرہ مجھ سے ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کی نسبت کہا کہ یہ رسالہ حضرت حاجی صاحب کا لکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ کسی اور نے لکھ کر حضرت کی طرف

> منسوب کر دیا ہے، اس روایت پر قلب میں ایک شبہ اور وسوسہ پیدا ہو گیا تھا، چنانچہ اس سفر میں ایک نسخہ ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' کا اس نیت سے ساتھ لیا کہ حضرت (حاجی) صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حرف بحرف سنا کر اس کی تصدیق کروں گا کہ یہ سب حضرت ہی کا لکھا ہوا ہے یا اس میں کچھ تحریف ہوئی۔ چنانچہ آگیوٹ میں مولوی محمد سابق انبیٹھوی سے میں نے اس کا تذکرہ کیا کہ میرا ایسا ارادہ ہے، مولوی صاحب بھی میرے ہم خیال ہوئے۔ جب مکہ معظمہ پہنچے تو میں اور مولوی محمد سابق حضرت اقدس کے آستانے پر حاضر ہوئے اور رسالہ میرے پاس تھا، جس وقت قدم بوس ہوئے تو حضرت قبلہ نے اول ہی مولوی سابق صاحب کی طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ ''میاں محمد سابق ہندوستان میں لوگوں میں عجیب عجیب طرح کے نزاعات واقع ہو رہے ہیں۔ سنا ہے کہ فیصلہ ہفت مسئلہ کے اوپر بھی اکثر لوگ اشتباہ کرتے ہیں کہ وہ فقیر کا لکھا ہوا نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ یہ نہیں دیکھتے کہ خواہ کسی کا لکھا ہو حق بات کو سمجھیں اور وہ رسالہ فقیر نے ہی لکھا ہے۔ اس کا اول مسئلہ یہ ہے اور دوسرا یہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ساتوں مسئلوں کو بالتفصیل چند الفاظ میں ایسا بیان فرما گئے کہ مجھے حرفاً حرفاً اس کو سنانے یا تصدیق کی حاجت باقی نہ رہی اور خاموش سُن کر جب وہاں سے واپس ہوا تو مولوی محمد سابق سے کہا کہ لیجئے کیسا اطمینان منجانب اللہ ہو گیا کہ سوال کی بھی ضرورت نہ رہی فالحمدللہ۔'' (امداد المشتاق ص ۱۷۹-۱۸۰)

اس تحریر کے بعد میرا اپنا خیال بھی یہی ہے کہ امداد المشتاق کی یہ روایت زیادہ قابل سند ہے جبکہ خود مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ف: فیصلہ ہفت مسئلہ کی یہ تو حسی تحقیق تھی کہ اس کا وجود کس طرح ہوا باقی اس سے زیادہ ضروری شرعی تحقیق رسالہ ''تنبیہات وصیت'' کے آخر میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔'' (امداد ص:۱۸۰)

قبروں کے عرس اور سماع کے سلسلے میں حاجی صاحب کی حسب ذیل عبارت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ فیصلۂ ہفت مسئلہ حاجی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''مشرب فقیر کا اس امر (سماع) میں یہ ہے کہ ہر سال اپنے پیر مرشد کی روح مبارک کو ایصالِ ثواب کرتا ہوں۔ اوّل قرآن خوانی ہوتی ہے...... ماحضر کھانا کھلایا جاتا ہے اور اس کا ثواب بخشد یا جاتا ہے اور زوائد امور فقیر کی عادت نہیں، نہ کبھی سماع کا اتفاق ہوا۔'' (فیصلہ ہفت مسئلہ ص:۹)

مذکورہ بالا اور حسب ذیل عبارت بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ یہ کتاب حاجی صاحب کی لکھی ہوئی ہے۔ یا رَسُولَ اللہ یا اور کسی کو ندا کرنے کی بحث میں موصوف لکھتے ہیں:

> ''مشرب اس فقیر کا یہ ہے کہ ایسی ندا میرا معمول نہیں۔ ہاں بعض اشعار میں ذوق وشوق سے صیغۂ ندا برتا گیا۔'' (فیصلہ ص:۱۰)

کتاب کے آخر میں مسئلہ امکان کذب پر تحقیق کرکے ہوتے حاجی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اسی مضمون کا خواب فقیر کے ایک متعلق نے دیکھا۔'' (فیصلہ ص:۱۲)

ان سب عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب حاجی صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد لوگوں میں بحثوں کا بازار گرم ہوگیا، حالانکہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رفع اختلاف کے لئے اس مضمون کو تحریر فرمایا تھا یا اپنے خیالات مولانا اشرف علی صاحب پر واضح کرکے ان سے لکھائے تھے۔

حاجی صاحب کا اضطراب

دراصل حاجی صاحب کے مریدین کا حلقہ وسیع ہونے کے علاوہ ایسے حضرات پر مشتمل تھا جن میں دیوبندی عقائد کے حضرات بھی تھے جو دوسرے عقائد کے حامل تھے۔ اس لئے حاجی صاحب دونوں کو اتفاق سے رہنے اور اختلاف سے بچنے اور فساد کو ہوا دینے سے روکنے کے خواہشمند تھے، لیکن اس کے باوجود یہ اختلاف رفع نہ ہوسکا۔ مولانا عاشق الٰہی

صاحب تذکرۃ الرشید میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جس زمانے میں فیصلہ ہفت مسئلہ کا ہنگامہ بپا تھا (حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نے ارشاد فرمایا کہ ہندوستان میں تو کوئی بات بھی نہیں تھی عرب سے تو اب عجیب عجیب خبریں آتی ہیں۔ (تذکرۃ الرشید ص: ۲۸۶ حصہ دوم)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ ہفت مسئلہ کا ہنگامہ ضرور بپا ہوا تھا۔ اور حاجی صاحب کے مریدین میں اختلاف ہوا تھا۔ ایک طرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس دارالعلوم، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، حکیم ضیاء الدین صاحب رائیس رام پور منہیاراں وغیرہ وغیرہ تھے، اور دوسری طرف حاجی عابد حسین صاحب دیوبندی، مولوی عبدالسمیع صاحب رامپوری منہیاراں اور دیگر صاحبان تھے مگر اس کتاب کے آخر میں حاجی صاحب نے جو وصیت کے عنوان کے ماتحت عبارت لکھی ہے وہ حسب ذیل ہے جس سے حاجی صاحب کی صلح پسندی اور حق جوئی کا پتہ چلتا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

> اور اس تمام تحقیق کے بعد بھی فقیر کی یہ وصیت ہے کہ ظنیات میں اپنے علم تحقیق پر وثوق نہ کریں۔ سورہ فاتحہ اھدنا الصراط المستقیم بہت خشوع سے پڑھا کریں اور ہر نماز کے بعد ربنا پڑھ کر دعا کیا کریں اور اپنے اوقات معاش و معاد کے ضروری کاموں میں، خصوص تزکیۂ نفس و تصفیہ باطن میں صرف کریں اور اہل اللہ کی صحبت و خدمت اختیار کریں خصوص عزیزی جناب مولوی محمد رشید احمد صاحب (گنگوہی) کے وجود بابرکت کو ہندوستان میں غنیمت کبریٰ و نعمت عظمیٰ سمجھ کر ان سے فیوض و برکات حاصل کریں۔'' (فیصلہ ہفت مسئلہ ص: ۱۲)

اس عبارت اور بعض دیگر عبارتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب کے

رجحانات مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کی طرف تھے۔

ہم نے بحیثیت مصنف اس کتاب کے تاریخی اور تحقیقی پس منظر بحث کی ہے جو ایک تذکرہ نویس کے لئے ناگزیر ہے۔ کتاب میں مندرجہ مسائل سے ہم نے قطعاً بحث کرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اتنا کہنے کو ضرور دِل چاہتا ہے کہ حاجی صاحب کا مقصد اس کتاب سے معتقدین کے آپس میں اختلاف کو روکنا ہے اور فساد کو ہوا دینے سے بچانا ہے، مسائل کی تحقیق فقہی میں دونوں جماعتیں اپنے اپنے حق میں کھینچا تانی کر سکتی ہیں۔ مگر حاجی صاحب کی نیت صلح کل، مصلحت اندیشی، خلوص اور للہیت پر مبنی تھی۔

سن تصنیف

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس رسالہ کا سن تصنیف خلاف عادت حاجی صاحب نے تحریر نہیں فرمایا۔ تاہم یہ کتاب ہی نہیں دیگر کتب بھی تصنیف سے کئی کئی سال بعد چھپتی رہی ہیں۔ یہ رسالہ جو اس وقت میرے پیش نظر ہے محرم ۱۳۴۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۱ء میں مطبع مجیدی کانپور میں چھپا ہے۔

گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ہے جس کو آپ کے مرید عقیدت کیش میاں نیاز احمد صاحب نے جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس میں حمد، نعت، عشق حقیقی سے متعلق غزلیات، شوق قیام مدینہ وغیرہ مضامین پر مشتمل اشعار ہیں۔ جن میں تین سو انیس (۳۱۹) اردو کے اشعار ہیں اور ترانوے (۹۳) فارسی کے ہیں۔ یہ مجموعہ بلالی وخانی پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں غالباً پہلی مرتبہ شائع ہوا لیکن طباعت کا سال، ماہ وغیرہ کچھ درج نہیں۔

خطوط

ان تصانیف کے علاوہ حاجی صاحب کے مکتوبات ہیں جو علم تصوف اور پند و نصائح کی

جاتی ہیں۔

مرقوماتِ امدادیہ

ان مکتوبات میں اکسٹھ (۶۱) خطوط تو وہ ہیں جو امداد المشتاق کے آخری حصہ میں مرقوماتِ امدادیہ کے نام سے موسوم ہوکر چھپے ہیں اور جن کو مولانا وحید الدین رام پوری نے جمع کیا تھا، یہ مکتوبات فارسی میں ہیں لیکن ان کا ترجمہ مولانا عبدالحی صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے اردو میں کیا ہے اور وہ ترجمہ بھی خطوط کے ساتھ اسی کتاب میں چھاپ دیا گیا ہے۔ یہ خطوط مولانا رشید احمد صاحبؒ، مولانا محمد قاسم صاحبؒ، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، مولانا حکیم ضیاء الدین صاحب رام پوری، حاجی عابد حسین صاحبؒ وغیرہم کے نام ہیں۔

مکتوباتِ امدادیہ

مذکورہ خطوط کے علاوہ پچاس وہ خطوط ہیں جو مولانا اشرف علی صاحبؒ کے نام مکہ معظمہ سے روانہ فرمائے ہیں۔ یہ مکتوبات اردو زبان میں ہیں اور آخری دور کے ہیں۔ آخری خط ۲۰؍ ربیع الاوّل ۱۳۱۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے تقریباً دو ماہ بعد حاجی صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بہرحال یہ خطوط پہلی مرتبہ مطبع احمدی لکھنؤ میں نومبر ۱۹۱۵ء میں طبع ہوئے۔

بنام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

حاجی صاحب نے جو خطوط قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تحریر فرمائے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے، جن میں صرف ایک خط فارسی زبان میں مرقوماتِ امدادیہ میں درج ہے۔

ایک خط مسئلہ وحدۃ الوجود کے بارے میں مولوی عبدالعزیز امروہوی کے نام ہے، جو علیحدہ ایک پمفلٹ کی شکل میں فارسی زبان میں ہے۔ گویا کل ایک سو چوبیس خطوط ہیں جو اس وقت مجھے معلوم ہو سکے، اور کتنے خطوط ہوں گے جو چھپ نہ سکے ہوں گے۔

حاجی صاحب کی شاعری

اور

اردو فارسی نثر و نظم

شعرائے اردو کے مشہور تذکرہ نویس محمد حسین آزاد نے ولی دکنی کو شعرا کا باوا آدم کہا ہے۔ اس کا خیال اس نظریئے کا غماز ہے کہ ولی پہلا صاحب دیوان ہے۔ ورنہ گولکنڈے اور بیجاپور میں ولی سے پہلے قطب قلی وغیرہ بہت سے شاعر گذرے ہیں۔ آزاد کا تذکرہ ''آب حیات'' اپنے دور کی تحقیقات میں اب بہت سی ترمیم کا محتاج ہے۔ شبلی کی شعراء العجم یقیناً اس زمانے میں شعرائے فارسی پر بہترین ریسرچ تھی لیکن حافظ محمود شیرانی کی تنقید نے اس میں نقد و نظر کے نشتر سے بہت کچھ عمل جراحت کیا ہے۔ بہر حال سب سے پہلے صاحب دیوان ہونے کے باعث ولی کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھ دیا گیا۔

حاجی امداد اللہ صاحب بھی شعرا و علمائے دار العلوم دیو بند کے ولی یا باوا آدم تھے۔ ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے دلچسپی اور ذوق تھا۔

تخلص

حاجی صاحب نے اپنا تخلص امداد اختیار کیا تھا۔ گویا اپنے نام کا ایک جز استعمال کر کے علیحدہ کسی اور تخلص کا تکلف کرنا پسند نہیں فرمایا۔

سلسلۂ تلمذ

راقم الحروف پوری تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ آپ کا شاعری میں کوئی استاد نہ

تھا۔ طبیعت میں شاعری کا چشمہ اُبلا اور بہ پڑا۔ جس طرف کو بہا اسی رُخ بہنے دِیا اور جس طرح بہا اس کو اسی طرح چلنے دیا۔ کسی سے اصلاح لینے کی اپنے خیال میں ضرورت نہ سمجھی کیوں کہ کچھ کہنے سے انکا مدعا شاعری نہ تھی، بلکہ دِل کے جذبات کی کیف ما اتفق ترجمانی تھی۔ البتہ ‘جائے استاد خالیست’’ کا نظریہ اگر درست ہے اور یقیناً درست ہے تو استاد کی رہبری سے شاعری کے خط وخال سنور جاتے ہیں، بشرطیکہ کسی کا مدعا اس کے چہرے کو نکھارنا ہو۔ بسا اوقات فطری طور پر ایسے شاعر بھی گذرے ہیں کہ جنہوں نے زندگی بھر کسی کو استاد نہیں بنایا، لیکن چونکہ وہ اسی زندگی کا مشغلہ بنائے رہے اس لئے وہ بہمہ وجود آسمان شعر وسخن کے آفتاب بن کر چمکے۔ آخر غالب کا بھی تو کوئی استاد نہ تھا جس سے شعر وسخن میں انہوں نے اصلاح لی ہو لیکن اس کا مقام اتنا بلندی پر پہنچا کہ اس فن کا امام بن گیا۔

در حقیقت شاعری کے جوہر کے ساتھ اگر قدماء کے اشعار پر عبور ہو اور ان کی تراکیب ولوازم، جذبات لطیفہ، سادگی، جوش اور تخیل کی گھاٹیوں سے انسان خود عہدا برا ہونے کی اہلیت رکھتا ہو تو پھر خود رہبر کے بغیر اچھا شاعر بن سکتا ہے۔

شاعری کے لئے داخلی یا خارجی جذبے کی ضرورت

حاجی صاحب کی شاعری ان کے فطری ذوق کی غماز ہے۔ شاعری کے لئے کسی داخلی یا خارجی آتشگیر مادے کی ضرورت ہے۔ اُن کے دِل میں اٹھارہ برس کی عمر سے عشق حقیقی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس نے اندرونی جذبات کو ریاضت وعبادت، ذکر وفکر اور اشغال کے علاوہ شاعری کے رنگ میں بھی جلوہ گر ہونے کی صورت اختیار کر لی، اسی عشق حقیقی کے نتیجہ میں ان کی تمام تر شاعری عشق ازلی، عشق رسالت، معرفت، نعت اور منقبت سے لبریز ہے۔ مجاز کو کہیں دخل نہیں۔

شعر وسخن سے دلچسپی

کسی شخص کی شاعری کا اندازہ بسا اوقات شعر وسخن سے اس کی دلچسپی سے بھی ہوتا ہے۔

حاجی صاحب کے ملفوظات، ان کی مجالس، خطوط اور تصنیفات میں جابجا دلچسپ اشعار آپ کو ملیں گے۔ مثلاً ایک خط میں انہوں نے حکیم ضیاء الدین صاحب رامپوری (ضلع سہارنپور) کو مکہ معظمہ سے فارسی میں لکھا ہے، اس میں اردو کے حسب ذیل اشعار لکھتے ہیں:

”ای عزیز ما یاں بمصیبت خود مبتلا ئیم غیری را چہ گفتہ آید: شعر۔

روتی ہے خلق میری خرابی کو دیکھ کر　　روتا ہوں میں کہ ہائے مری چشم نم نہیں
غمگیں ہمارے غم سے ہے عالم مگر ہمیں　　غم ہے تو بس یہ غم ہے کہ کچھ بھی تو غم نہیں
ہم پر جفا و جور جو کچھ ہے نصیب ہے　　ورنہ طریق یار کا جور و ستم نہیں
پھولا نہ تخم عشق مرا ورنہ چشم و دل　　گرمی مہر و ابر بہاری سے کم نہیں

ایک اور خط میں حکیم ضیاء الدین صاحب کو لکھتے ہیں:

”عزیز من، عاشقان حق در قبض و ہجراں لذت وصال می چشند۔

جو مزا انتظار میں دیکھا　　نہ کبھی وصل یار میں دیکھا

یہی حال بلکہ اس سے زیادہ فارسی اشعار سے دلچسپی اور یادداشت کا ہے۔ ملفوظات اور مکتوبات میں جا بجا فارسی کے اشعار ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو ایک خط میں لکھتے ہیں اور کیا پیاری فارسی میں لکھتے ہیں:

”بہر صورت، بحال خستہ و شکستہ و بقصور خود معترف گشتہ بر درگاہ کریم کارساز پیوستہ افتادہ ماند ماند، و نہ فہمد کہ لائق دربار حضرت سبحانہ تعالیٰ نیستم۔“ (بیت)

تو مگو مارا بداں شہ بار نیست　　بر کریماں کار ہا دشوار نیست

بلکہ بدست ہمت دامن رحمت گرفتہ نگذارد و امید وار ماند، اگر ایں چنیں کند امید قوی است کہ ارحم الراحمین بندۂ شکستہ خود را نخواہد گذاشت، زیرا کہ او تعالیٰ از عبد خود بجز شکستگی و خستگی نمی خواہد چنانچہ (ابیات)

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں　　پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

چند ازیں الفاظ واضمار ومجاز　　سوز خواہم سوز با آں سوز وساز

غرض کہ علم وفن کے تمام شعبوں میں حاجی صاحب کو شعر وشاعری سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا ایسا شخص فطرت کی طرف سے شاعری کا ملکہ لے کر آتا ہے۔

حاجی صاحب کے کلام کا ذخیرہ

آپ کے کلام کا مجموعہ کس قدر ہے اس کا اندازہ آپ اس عبارت سے کر سکتے ہیں جو نیاز احمد صاحب نے ''گلزارِ معرفت'' کے اوّل میں لکھی ہے۔ نیاز احمد صاحب حاجی صاحب کے کوئی مرید ہیں انہوں نے آپ کا کچھ کلام یک جا جمع کر کے اس کا نام گلزارِ معرفت رکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بعد حمد وصلوٰۃ یہ نیاز احمد...... خدمت میں اخوان طریقت وخلان الحقیقت کے عرض رساں ہے کہ حضرت پیر ومرشد دام ظلہم کا کلام منظوم ہدایت مفہوم اس کثرت سے ہے کہ اس کا احصا وضبط دشوار ہے۔ مگر احقر کو کچھ متفرق ومنتشر اوراق اتفاقاً ہاتھ لگ گئے۔ بغرض انتفاع...... دوسرے پیر بھائیوں وغیرہ کے جی میں آیا کہ اوراق کو جمع کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں اور نام اس مجموعہ طیبہ کا گلزارِ معرفت رکھا۔ (گلزارِ معرفت ص ۲)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی صاحب کا کلام بکثرت ہے لیکن نیاز احمد صاحب نے اس کی تفصیل یا جو کچھ ان کے علم میں آسکتا تھا اس کا اظہار نہیں کیا۔ تاہم میری تحقیق کی جہاں تک رسائی ہے ان کے مجموعہ کلام کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تفصیل کلام

۱...... دردنامۂ غمناک:۔ مختصر سا اردو منظوم رسالہ ہے جس میں ایک سو پچھتر (۱۷۵) اشعار ہیں۔

۲...... غذائے روح:۔ اردو مثنوی ہے جس میں سولہ سو پچاس (۱۶۵۰) اشعار ہیں۔

۳...... جہادِ اکبر:۔ اردو منظوم رسالہ ہے جس میں چھ سو اُناسی (۶۷۹) اشعار ہیں۔

۴...... نالۂ امدادِ غریب:۔ جہادِ اکبر کے آخر میں نالۂ امدادِ غریب کے عنوان سے چھ صفحات کا تتمہ ہے جس میں پہلے ایک رباعی ہے اور بعد ازاں اکیاسی مناجاتیہ اشعار ہیں اور اس کے بعد ایک خمسہ ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور مناجات پر بطورِ تضمین لکھا ہے اوعر جس کے ۳۳ اشعار ہیں۔ پھر شوق مدینہ میں ۱۹ شعر ہیں۔ بعد ازاں ایک مناجات ہے جس کے ۸ اشعار ہیں۔ ایک اور مناجات ہے جس کے ۸ اشعار ہیں۔ آخر میں دو اور مناجاتیں ہیں جن کے ۱۵ اشعر ہیں۔ اس طرح نالۂ امدادِ غریب کے کل ۱۷۸ شعر ہوتے ہیں۔

۵...... مثنوی تحفۃ العشاق:۔ اردو کلام ہے جس میں تیرہ سو چوبیس (۱۳۲۴) اشعار ہیں۔

۶...... گلزارِ معرفت:۔ اردو غزلیات، حمد ونعت وغیرہ۔ جس میں اردو کے تین سو انیس (۳۱۹) اشعار ہیں۔

مذکورہ بالا تمام تصنیفات کے کلام یعنی اردو اشعار کا مجموعہ پانچ ہزار نو سو دس اشعار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ کے مصنفہ رسالے میں جو ''ارشادِ مرشد'' کے نام سے موسوم ہے ایک مثلث شجرہ اردو زبان میں پیران چشت کا ہے جس کے اُناسی اشعار ہیں اور ایک مصرع مزید مثلث کی بنیاد پر ہے۔ اس کے علاوہ ایک مخمس کا پتہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی کتاب ''امداد المشتاق'' سے چلا ہے۔ وہ حاجی صاحب کی زبانی روایت کرتے ہیں جو حسب ذیل ہے:

(حاجی صاحبؒ نے) فرمایا کہ میں نے ایک بار حضرت پیر ومرشد (میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی) کی شان میں ایک مخمس کہا۔ چونکہ مجھ میں تاب سنانے کی نہ تھی کسی اور کی معرفت حضرت کو سنوایا...... تیسرے روز حضرت (میانجی صاحب) نے فرمایا کہ شاہ

عبدالرحیم صاحب (میانجی صاحب کے پیر) نے تم کو سُرخ رنگ کا جوڑا عنایت کیا ہے۔ گویا وہ خلعت صلہ اس مخمس کا تھا......اس مخمس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تم ہو اے نور محمد خاص محبوب خدا   ہند میں ہو نائب حضرت محمد مصطفیٰ
تم مدد گار مدد، امداد کو پھر خوف کیا   عشق کی پر سُنکے باتیں کانپتے ہیں دست وپا
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

جامِ اُلفت سے ترے میں ہی نہیں اک جرعہ نوش   سینکڑوں در پر ترے مدہوش ہیں اے مے فروش
دِل میں ہے ان کے بھرا اک بادہ وحدت کا جوش   پر یہی کہہ کر اٹھے ہیں جب ہے آیا ان کو ہوش
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

آسرا دُنیا میں ہے از بس تمہاری ذات کا   تم سوا اوروں سے ہر گز کچھ نہیں ہے التجا
بلکہ دِنِ محشر کے بھی جس وقت قاضی ہو خدا   آپ کا دامن پکڑ کر یہ کہوں گا برملا
اے شہ نور محمد وقت ہے امداد کا

(امدادالمشتاق ص:۱۱۵-۱۱۶)

لیکن افسوس یہ ہے کہ حضرت راوی نے اس مخمس کے صرف تین بند لکھے ہیں باقی کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کسی اور کتاب میں یہ پورا مخمس موجود ہے یا نہیں۔ البتہ حاجی صاحب کے مجموعہ کلام میں یہ مخمس کہیں موجود نہیں ہے۔

اردو اشعار کا کل مجموعہ

مذکورہ تفصیل کے بعد جس قدر اردو اشعار میری تحقیق میں آسکے ان کا مجموعہ مذکورہ بالا شجرۂ چشتیہ منظوم اور نامکمل مخمس کو شامل کر کے پانچ ہزار نو سو پچانوے (۵۹۹۵) اردو اشعار ہوتے ہیں۔

فارسی کلام

مذکورہ اردو کلام کے علاوہ آپ کے فارسی اشعار صرف گلزار معرفت میں موجود ہیں جن

کی کل تعداد ترانوے (۹۳) ہے۔

کل اردو اور فارسی اشعار

اس مقام پر پہنچ کر ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اپنی تلاش و جستجو اور اپنی کاوش و محنت کا نتیجہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں کہ حاجی امداد اللہ صاحب کے کل اردو اور فارسی اشعار کی تعداد جو ہمیں مل سکی چھ ہزار اٹھاسی (۶۰۸۸) ہے۔ اگر کسی اور صاحب کے علم میں مزید برآں اشعار یا کلام ہو تو شکریہ کے ساتھ معلومات میں اضافے کا باعث ہو گا۔ بہر حال چھ ہزار اٹھاسی اشعار کی تعداد کوئی معمولی تعداد نہیں ہے۔ ایسے شخص کا نام نامی اگر شعرا کے تذکرے کی زینت نہ بنے تو اور کسی کا بن سکے گا۔ اس سے فراغت کے بعد ہم قارئین کو ان کے اصناف شعر کی طرف لئے چلتے ہیں کہ انہوں نے شعر کی کس کس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔

اصنافِ کلام

ہم نے گذشتہ صفحات میں آپ کے مجموعۂ کلام کو پیش کیا ہے لیکن ہم نے یہ تفصیل مذکورہ بالا عنوان کے لئے مخصوص کر رکھی تھی کہ ہم یہ بتائیں کہ ان کی شاعری کا تمام مجموعہ کن کن اصناف شاعری پر شامل ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک تحقیق کی گئی اس کا تجزیہ یہ ہے کہ آپ کے کلام میں شعر کی حسب ذیل اصناف موجود ہیں جن پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ (۱) مثنوی، (۲) غزل، (۳) مخمس، (۴) مثلث، (۵) قصائد، (۶) نعت، (۷) رباعیات، (۸) تاریخی مادے۔ اس تجزئے کے بعد سب سے پہلے ہم ان کے منظوم رسالے پر جو ''دردنامۂ غمناک'' کے نام سے موسوم ہے سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں اور اس میں سے انتخاب پیش کر کے ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

دردنامۂ غمناک پر ایک نظر

یہ رسالہ آٹھ صفحات پر ہے۔ جس میں مثنوی کے طرز پر ایک سو پچھتر اشعار ہیں۔ اس رسالے کا آغاز حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

سنو یارو عجب قصہ ہمارا   بیان کرتا ہوں میں جو غم کا مارا
سناتا ہوں تمہیں اس کو سراسر   گذرتا ہے جو کچھ اب میری جان پر

آغاز سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر مجازی عشق کا شکار رہا ہے۔ اور معشوق کے ہجر کی سختیاں اس کی جان کو پگھلائے ڈالتی ہیں، چنانچہ اس کے آٹھویں شعر سے مجاز کا صاف دھوکا ہوتا ہے۔ شاعر لکھتا ہے۔

مرا اک دِل رُبا سے دِل گیا مل   ہوا، تیغ نگہ سے اس کی بسمل
اٹھا کر زلف، رُخ اپنا دکھایا   بلا میں عشق کی مجھ کو پھنسایا
مرا اک کھیل خلقت نے بنایا   تماشے کو بھی تو لیکن نہ آیا

ایک سو پانچ اشعار تک مسلسل غم واندوہ، سوز، اضطراب وبیقراری، خواہش دیدار اور شکوہ وشکایت کا سلسلہ چلا گیا ہے اور قاری دور تک عشق مجازی کے دھوکے میں منزلیں طے کرتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ ایک سو پانچ اشعار کے بعد ایک سو چھٹا شعر آیا اور اس کو پڑھ کر قاری کے انتظار کا اضطراب، سکون میں تبدیل ہوا۔ جس شعر نے حقیقت سے نقاب الٹی وہ یہ ہے۔

یہ پردہ دور تک اللہ کر تو   مجھے اس بھید سے آگاہ کر تو
کہیں ہو کر کے بے پردہ پیارے   ذرا تو روبرو ہو جا ہمارے

اسی طرح شاعر عشق خداوندی میں بے تاب نظر آرہا ہے اور آخر میں جب اپنی بے دست وپائی پہ نظر ڈالتا ہے تو رضائے الٰہی میں گم ہو جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے۔

رضا گم اپنی کر اس کی رضا میں   نہ پڑ ہرگز خودی کی تو بلا میں

بس اب اللہ، بس اللہ، بس ہے　　　سوا حق کے جو ہے باقی ہوس ہے

دردنامۂ غمناک کے یہ دونوں آخری اشعار ہیں جن پر یہ نظم ختم ہوتی ہے۔ اس سے عشق حقیقی کا مطلع بالکل صاف ہوگیا ہے۔ مذکورہ بالا اشعار مضمون کی نوعیت کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔ جو دردنامۂ غمناک کی معنوی پوزیشن واضح کرتے ہیں۔ جہاں تک شاعرانہ خصوصیت کا تعلق ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں دردنامۂ غمناک حاجی صاحبؒ کی شاعری کی ابتدائی منزل کا پتہ دیتا ہے۔ اس رسالہ پر تنقید کے لئے حاجی صاحب کے دور کو متعین کیجئے۔ حاجی صاحب کا زمانہ زندگی ۱۲۳۳ھ سے ۱۳۱۷ھ تک ہے۔ جو چوراسی سال تک پھیلا چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں آپ نے انگریزوں کے خلاف جہادِ حریت میں حصہ لیا اس وقت آپ کی عمر چوالیس (۴۴) سال تھی۔ اسی زمانہ میں آپ نے مکہ معظمہ کو ہجرت فرمائی ہے اس وقت اردو شاعری ترقی میں کہیں سے کہیں جا پہنچی تھی، لیکن ترقی کا یہ دور اُن شعرا کے لیے ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا روشن مقصد شاعری کو بنالیا ہے۔ حاجی صاحب اس طرح کے شاعر نہیں ہیں کہ شاعری کے تمام اصول وضوابط کو پیش نظر رکھیں گے، خاص خاص کو چھوڑ کر عموماً اس دور کی نثر ونظم پُرانے ڈھنگ کی سی بے تکلف ہوتی تھی۔ چنانچہ پہلے اور دوسرے دور میں بلکہ میر تقی اور درد کے زمانے کے وہ الفاظ جو پانچویں دور میں متروک ہوچکے تھے۔ سادگی سے حاجی صاحب کے کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً ٹک کا لفظ دردنامہ میں ملاحظہ ہو۔

ٹک اپنے حسن کا جلوہ دکھادے　　　کہ اب بیخود مجھے مجھ سے بنادے
یہ پردہ دور ٹک اللہ کر تو　　　مجھے اس بھید سے آگاہ کر تو

میر تقی کہتے ہیں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　　ابھی ٹک روتے روتے سوگیا

ایسے اشعار بھی حاجی صاحب کے کلام میں ملیں گے جنہیں ذرا سی ترمیم سے بالکل

صاف اور سیدھا بنایا جا سکتا ہے، لیکن وہی فقیرانہ سادگی میں جو قلم پر ایک دفعہ آ گیا، لکھتے چلے گئے ہیں۔ مثلاً دردنامۂ غمناک کا یہ شعر۔

مرا اک دِل رُبا سے دِل گیا مِل　　ہوا تیغ نگہ سے اس کی بسمل

اس شعر کو ادنیٰ تامل سے اگر یوں بدل دیا جائے:

"مرا اک دِل رُبا سے مل گیا دِل" تو مصرع بالکل صاف اور سیدھا ہو جاتا ہے۔

حاجی صاحب کے کلام میں بعض ساکن حرفوں کا متحرک ہونا متعدد مقامات پر موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں حسب ذیل اشعار۔

تڑپ کر غم میں شب کو صبح کرنا　　صبح سے شام تک رو رو کے مرنا
غرض دیوانہ مجھ کو جان کر کے　　ہوئے گرد آمرے لڑکے شہر کے

پہلے شعر میں لفظ (صبح) بروزن لطف صحیح استعمال کیا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع میں صبح کی (ب) پر زبر ہے۔ اس طرح دوسرے شعر کے مصرع میں شہر کے لفظ میں (ہ) پر زبر ہے۔ علاوہ ازیں شعر کے دوسرے مصرع میں تعقید لفظی بھی موجود ہے۔ شہر کی غلطی کو باقی رکھتے ہوئے اس مصرع کو یوں کہا جا سکتا تھا۔

"مرے گرد آمرے لڑکے شہر کے" مگر کلام میں پستی اور بلندی کا معاملہ شاعر کے ساتھ ہے۔ میر تقی میر جس کو اردو شاعری اور بالخصوص غزل میں اوّلیت کا مرتبہ حاصل ہے اس کے متعلق شیفتہ کا یہ مشہور فیصلہ پیش نظر رکھیے۔

"پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" اسی طرح حاجی صاحب کے اشعار میں پستی بھی ہے اور بلندی بھی۔ اسی دردنامہ کے حسب ذیل معیاری اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا اک کھیل خلقت نے بنایا　　تماشے کو بھی تو میرے نہ آیا
کہاں جاؤں کہوں کس سے حقیقت　　کوئی ہمدم نہیں جز دردِ فرقت
جو میں ظاہر کروں سوزِ جگر کو　　کروں شرمندہ دوزخ کے شرر کو

حقیقت دِل کی گر اپنے دکھاؤں   ہنسوں میں اور عام کو رلاؤں
ہوا ہے ہاتھ سے عاجز گریباں   ہے گریاں سیل اشک غم سے داماں
خدا کے واسطے جلدی خبر لے   کہیں یہ آپ خون اپنا نہ کرے
جو تھی منظور کرنی بے وفائی   تو کی تھی مجھ سے پھر کیوں آشنائی
جو یا آئے گی وہ زلفِ پریشاں   تو پیچ وتاب کھائے گی مری جاں
اگر پوچھے کوئی یہ مجھ سے آکر   کہ کیا گذری ہے اے دیوانے مجھ پر
نہ ہرگز حال دِل اپنا کہوں گا   ہنسوں گا اور روکر چپ رہوں گا
رہو غیروں میں تم خوشیاں مناتے   ہم اس حسرت میں خونِ دِل ہیں کھاتے
یہی بہتر ہے اب رویا کریں ہم   سرشک غم سے منہ دھویا کریں ہم

تمام امداد کر یہ درد نامہ
کہیں ایسا نہ ہو پھٹ جائے خامہ

مذکورہ بالا اشعار میں صفائی، سلاست، تسلسل اور سادگی کا پورا پورا عمل کارفرما ہے۔ از ابتدا تا انتہا کلام میں سوز اور درد ہے۔ روانی کا یہ عالم ہے کہ کلام میں کہیں رکاوٹ نظر نہیں آتا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حاجی صاحب کو شاعری میں ایسا ملکہ ہے کہ وہ نثر کی طرح نظم لکھتے جاتے ہیں، مذکورہ بالا اشعار میں پانچویں شعر تو خوب ہے۔

ہوا ہے ہاتھ سے عاجز گریباں
ہے گریاں سیلِ اشک غم سے داماں

سیل اشک نے دامن کو اتنا تر کر دیا ہے کہ پھر داماں بھی اشک برسانے لگا ہے اور آنسوؤں کے جذب کی اس میں طاقت نہیں رہی۔ یا یہ کہ سیل اشک غم سے داماں بھی نالاں ہیں۔ غرض کہ دونوں معنی خوب ہیں۔ اسی طرح دسواں شعر اپنی فصاحت، سلاست اور سوز دروں کی بہترین ترجمانی کر رہا ہے۔

نہ ہرگز حالِ دِل اپنا کہوں گا
ہنسوں گا اور روکر چپ رہوں گا

شاعر کو مایوسی میں ہنسی بھی آتی ہے۔ اور جب مجبور ہو جاتا ہے تو روتا بھی ہے اور جب ہنسنے اور رونے سے بھی کام نہیں بنتا تو چپ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اشعار عام نظم میں جذبات نیز نیچرل شاعری کا بہترین نمونہ پیش کررہے ہیں۔ گیارہواں شعر رشک کے مضمون میں خوب نکالا ہے۔ بارہویں شعر میں رونے کی تدبیر سے وصل کی التجا ہے۔ سرشک غم سے منہ دھونے کا لسانی چٹخارہ خوب ہے۔

اردو مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی کو سب سے اوّل درجہ دیا گیا ہے۔ اور دوسرے نمبر پر دیا شنکر نسیم کی گل بکاؤلی کو اور اس میں بھی شک کیا ہے۔ لیکن حاجی صاحب کے مذکورہ بالا اشعار بلا مقابلہ اپنی جگہ پر اچھی نظم کا نمونہ پیش کررہے ہیں۔

دردنامۂ غمناک کے متعلق اس قدر ہی لکھنا کافی ہے اس کے بعد ہم ان کے دوسرے منظوم کلام میں سے رسالہ ''جہادِ اکبر'' کی طرف قلم کی باگ موڑتے ہیں۔

جہادِ اکبر پر تبصرہ

حاجی صاحب کی دوسری نظم ''جہادِ اکبر'' ہے۔ اس مختصر سے منظوم رسالے میں مثنوی کے وزن میں نفس کی غفلت دُنیا میں مشغولیت کا ذکر کیا ہے اور بالآخر نفس کو غفلت سے جگانے اور عشق حقیقی کی طرف دِل لگانے کو جہادِ اکبر کہا ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک یہ نظم دردنامہ سے ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے، چونکہ دردنامہ کیفیت عشق، دردِ جدائی اور شکوہ وشکایت کا انداز رکھتا ہے اس لئے اس میں سوز واضطراب ہے اور ''جہادِ اکبر'' میں نفس کو تنبیہ ہے اس لئے نظم کے لب ولہجہ میں فرق پیدا ہوگیا ہے۔ ملاحظہ ہوں حسب ذیل اشعار۔

بیاں حال اب اپنا کرتا ہوں میں   کہ جس فکر میں روز مرتا ہوں میں

مجھے آگیا جو خیال ایک رات　　لگا سوچنے اپنے دِل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر　　سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر
مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں　　کہ کی دولت عمر برباد کیوں
نہ سویا شب اس فکر میں ایک دَم　　رہا رات بھر اس سے میں چشم نم
اسی میں گئی رات ساری گذر　　شش وپنج کرتا رہا تا سحر

کہا نفس کو آخرش میں نے رات　　کہ کیا ہوگیا تجھ کو اے بدصفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں　　کہ آیا تھا یاں کس لئے اے لعین
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا　　یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

حاجی صاحب مذکورہ اشعار میں غفلت میں عمر بسر کرنے پر نفس کو تنبیہ کر رہے ہیں۔ جس کو سادہ طور پر ہم پند و نصیحت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ایسے اشعار شعریت سے ہٹ کر شعرا کے نزدیک صرف نصیحت بن جاتے ہیں۔ مثلاً غالب کے حسبِ ذیل اشعار۔

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی　　نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخشدو گر خطا کرے کوئی

ان اشعار کو حکیمانہ یا واعظانہ خیال کہا جا سکتا ہے جو اپنی بجائے شعریت سے کہیں بلند ہے۔ بقول اقبال۔

حق اگر سوزی ندارد حکمت است　　شعر می گردد چو سوز از دِل گرفت

سوز کی مثال اس طرح سمجھئے جیسے کہ میر صاحب کہتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جس کسی نے نام لیا　　دِل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

جہاد اکبر کی نظم مثنوی نامہ فردوسی کے فعولن فولعن فعولن فعول کے وزن پر ہے۔ اس مثنوی میں ایک قسم کا مد و جزر ہے اور الفاظ میں شان و شکوہ پایا جاتا ہے جو نفس کے لئے

تازیانۂ عبرت ہے اور تنبیہ کے لئے مناسب لب ولہجہ ہے۔ الفاظ سادہ اور بندش اکثر چست ہے۔ مضمون میں بھی تسلسل ہے۔

غذائے روح ایک نظر میں

اس مثنوی کے مضامین کے متعلق تصنیفات کے سلسلے میں اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ جہاں تک اس تصنیف کی معنویت کا تعلق ہے یہ مثنوی بلند پایہ ہے جس میں عشق حقیقی اور معرفت نورانی کا ذکر ہے اور اس کے ماتحت مختلف قسم کی تمثیلوں اور حکایات سے ترک دُنیا اور اختیار آخرت کی تلقین کی گئی ہے، لیکن جہاں تک اس کی نظم کا تعلق ہے وہ دوسری مثنویوں کی برابری نہیں کرتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ قلم پر آگیا بغیر غور وفکر لکھتے چلے گئے ہیں۔ لیکن اس میں ایسے بھی اشعار ہیں جن کو ہم بغایت بلند کہ سکتے ہیں۔ چنانچہ حسب ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں انسان کی بوالہوسی کا ذکر کس عمدہ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

تھی اک عورت خوبصورت نازنین　　سیم تن نازک بدن اور مہ جبیں
زلف ورخسار ولب اس کے رشکِ حُور　　جس کی الفت میں دِل اک عالم کا چُور
ایک دِن باناز و باصد کبر و فر　　ایک کوچے میں ہوا اس کا گذر
اتفاقاً سوختہ دِل اک جواں　　دیکھ اس کو ہوگیا عاشق بجاں
اس پری کا دیکھ کر حسن وجمال　　ہوگیا وہ مثلِ تصویرِ خیال
اڑ گئے سب ہوش اور صبر وقرار　　ہوگیا وہ محو اندر روئے یار
اس کو یوں مجنون وشیدا دیکھ کر　　عشق کا اس کے ہوا زن پر اثر
یوں کہا زن نے اسے اے سادہ رو　　حال اپنے کو بیاں کر مجھ سے تو
کیوں کھڑا ہے کس کا تجھ کو دھیان ہے　　کس لئے آئینہ ساں حیران ہے

جا یہاں سے دیکھ اپنا کام کر   کیوں بلا میں پڑتا ہے اے خیرہ سر
اس جواں نے یوں کہا جانِ جہاں   چھوڑ تجھ کو اب بھلا جاؤں کہاں
عشق تیرا لے گیا اے میری جاں   ہوش وعقل وصبر اور تاب وتواں
یہ کہا زن نے اسے اے بے خبر   ہے مری ہمشیرہ مجھ سے خوب تر
حسن میں بہتر ہے مجھ سے لاکھ بار   جس پہ ہیں شمس وقمر دونوں نثار
سن کے یہ اور چھوڑ کر اس کو وہ خام   ہٹ کے پیچھے کو چلا چند ایک گام
جب لگا جانے تو زن نے دوڑ کر   دھول ایک منہ پر لگائی جلد تر
اک طمانچہ اس کے منہ پر مار کر   یہ لگی کہنے اسے اے خیرہ سر
میری صورت پر اگر عاشق ہے تو   اپنے اس دعوے میں گر صادق ہے تو
غیر پر کی کیوں نظر میرے سوا   ہے یہ دعوئ عشق کا اے بے حیا
جو کہ ڈالے غیر پر اپنی نظر   ہے حقیقت میں وہ مشرک سر بسر
عاشق حق ہو کے دیکھے غیر کو   کعبہ میں چاہے بنانا دیر کو
غیر کو نظروں سے تو اپنی نکال   چشمِ دِل سے دیکھ پھر حق کا جمال
جو سوا حق کے ہے دے سب کو جلا   ایک دلبر سے تو دِل اپنا لگا

ان اشعار میں کچھ ایسے ہیں جو صاف، سادہ اور رواں ہیں لیکن بعض ایسے بھی ہیں جن میں ترتیب الفاظ کے اعتبار سے تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے مثلاً چوتھے شعر کے مصرعے کو ملاحظہ فرمایئے ع دیکھ اس کو ہوگیا عاشق بجاں

یہ مصرع ادنیٰ تأمل اور ترمیم کے اس طرح ہوسکتا تھا ع

دیکھ کر اس کو ہوا عاشق بجاں

اسی طرح آٹھویں شعر کا دوسرا مصرع

حال اپنے کو بیاں کر مجھ سے تو

معمولی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح ہو سکتا تھا ع

اپنا حالِ دِل بیاں کر مجھ سے تو

اسی طرح گیارہویں شعر کا یہ مصرع

چھوڑ تجھ کو اب چلا جاؤں کہاں

اس طرح کہا جا سکتا تھا ع

میں تجھے اب چھوڑ کر جاؤں کہاں

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ حاجی صاحب ایسا صاف اور سادہ لکھنے سے عاجز تھے، نہیں ہرگز نہیں، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ شاعری میں کانٹ چھانٹ، خک دھک اور غور و فکر سے شعر کو صاف اور پاکیزہ بنانے کے تکلفات میں نہ پڑتے تھے۔ ہاں پہلی ہی مرتبہ جو شعر عمدہ سانچے میں ڈھل کر آ جائے وہ خوش قسمت ہے۔ مذکورہ بالا مصرعوں کے علاوہ کتنے ایک اشعار ان میں سلیس مربوط اور دلکش ہیں جو صاحبانِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔ مثلاً

کیوں کھڑا ہے کس کا تجھ کو دھیان ہے   کس لئے آئینہ ساں حیراں ہے
جو سوا حق کے ہے، دے سب کو جلا   ایک دلبر سے تو دِل اپنا لگا

فارسی شعروں کا اردو اشعار میں ترجمہ

اس مثنوی میں بعض مقامات پر حاجی صاحب نے مولانا روم کی مثنوی کے اشعار درج کیے ہیں اور ان کا اردو ترجمہ اسی وزن میں کیا ہے جس سے ان کی بدیہ گوئی اور بے ساختہ ترجمے کے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مقام پر دُنیا دار اور طالبِ دُنیا کی مذمت میں مثنوی مولانائے روم کے اشعار پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مثنوی میں مولوی معنوی   نکتہ اِک فرماتے ہیں سُن اے اخی
ترک دُنیا گیر تا سلطاں شوی   ورنہ ہمچو چرخ سرگرداں شوی
زہر دارد در دروں دُنیا چو مار   گرچہ دارد از بروں نقش و نگار

زہر ایں مار منقش قاتل است   می گریزد زو ہرآں کو عاقل است
حبِ دُنیا راس کل خطیئۃ   ترکِ دُنیا راس کل عبادۃٍ

اب حاجی صاحب نے مولانا رومی کے مذکورہ اشعار کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کیجیے:

چھوڑ دُنیا کو کہ تا سلطان ہو تو   ورنہ مثل چرخ سرگرداں ہو تو
زہر قاتل ہے یہ مارِ نقش دار   بھاگتے ہیں اس سے جو ہیں ہوشیار
حب دُنیا سب خطاؤں کا ہے سر   ترک دُنیا ہے ہر طاعت کا پر

یہ ہے مثنوی غذائے روح کے متعلق ہماری ذاتی رائے جس کو ہم نے بے لاگ عرض کر دیا ہے، اگر چہ اس مقدس ہستی کے متعلق ہم لکھ چکے ہیں کہ ان کی ذات شاعرانہ تکلفات سے بلند تھی لیکن کوئی صاحب یہ جواب دینے کی کوشش نہ فرمائیں کہ پھر شعر گفتن چہ ضرور کیوں کہ انہوں نے اپنی شاعری میں بہت سے اچھے اچھے اشعار نکالے ہیں اور اس قسم کی رکاکت سے سودا اور میر کی مثنوی بھری پڑی ہیں۔

مثنوی تحفۃ العشاق پر ایک نظر

حاجی صاحب کی مثنوی ”تحفۃ العشاق“ ”دردنامۂ غمناک“ کی طرح سوز و سازِ عشق سے سوختہ ہے اور اس میں جذبات ابھر ابھر کر عاشق کو جلانے کا کام کرتے ہیں۔ اس مثنوی کے کتنے ایک اشعار ہم نے تصنیفات حاجی صاحب کے عنوان کے ذیل میں درج کئے ہیں جو تمام مثنوی کا خلاصہ ہیں۔ یہاں پر ہم تنقیدی حیثیت سے کچھ کچھ اشعار منتخب کر کے پیش کرتے ہیں جن سے آپ کو اس مثنوی کا شعری مقام معلوم کرنے میں آسانی ہوسکتی ہے۔

فراق ضامن شہید

حافظ محمد ضامن علی صاحب کی شہادت کے بعد حاجی صاحب نے ان کی جدائی پر جو نقشہ اشعار میں کھینچا ہے وہ حسب ذیل ہے۔ لکھتے ہیں:

پر نہ دیتا تھا مجھے فرصت زماں   تا لکھوں اس نظم کو باشوق جاں
لایا اتنے میں زمانہ اور رنگ   ہوگیا کچھ اور ہی عالم کا ڈھنگ

دوسرے شعر میں شاعر نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ خیز زمانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر لکھتے ہیں۔

ہوگئے بس حضرت حافظ شہید   شام غم ہم کو ہوا نوروز عید
خوش نہ آئی اس جہاں کی رنگ و بو   چل دیئے بس جنت الفردوس کو
ہم بچاروں کو تڑپتا چھوڑ کر   سوئے حق راہی ہوئے منہ موڑ کر
وصل سے حق کے ہوئے وہ بہرہ ور   پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
ناز و نعمت میں ہیں وہ مشغول واں   خاک و خون میں لوٹتے ہیں ہم یہاں
جام کوثر سے ہوئے وہ لب بلب   چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
آپ تو راحت کے ساماں لے گئے   اور ہمیں رنج والم یاں دے گئے
عیش میں ہم کو دِیا بالکل بھلا   حق قربت اور اُلفت سب گیا
بے خبر ہم سے اگر رہنا تھا یوں   ساتھ اپنے لے گئے ہم کو نہ کیوں

اور کس قدر حافظ صاحب کے مقام کے سامنے اپنے آپ کو عاجز بنا کر ظاہر کیا ہے اور اسی کو ہم ولایت کی نشانی سمجھتے ہیں، لکھتے ہیں۔

گرچہ ہم لائق نہ تھے درگاہ کے   کفش برادری میں رہتے شاہ کے
شاہ کو زیباء ہے کب تنہا روی   گو بہت خادم نہ ہوں تھوڑے سہی

اظہارِ مسرت

ان کے مقام شہادت اور اپنی نامرادی پر خیال کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

آہ واویلا دریغا حسرتا   ساتھ والے چل دیئے میں رہ گیا
ساتھ کا اپنے ہر اک واصل ہوا   مدعا دِل کا اسے حاصل ہوا

پہنچا ہر اک منزل مقصود پر   رہ گیا میں ہی پڑا بس دور تر
صاف تھے جو چل دیئے صاف اور پاک   مثل تلچھٹ رہ گیا میں زیر خاک
جو کہ نوری تھے گئے افلاک پر   رہ گیا سایہ کی جوں میں خاک پر
گھر کیا قمری نے شاخ سرو پر   جھاڑ میں لٹکی ہے چمگادر مگر
ماہی حق نے تو لی دریا کی راہ   موش سوراخ زمیں میں ہے تباہ
مرغ آبی نے کیا دریا میں گھر   مرغ خاکی لوٹتا ہے خاک پر

غرض کہ اسی طرح فی البدیہ اور بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں حافظ صاحب کے مقام شہادت نے محبت اور جدائی نیز اپنی حرماں نصیبی کا شاعر نے قلق کے ساتھ مگر سادگی میں اظہار کیا ہے۔ اگرچہ ان اشعار کا ایک خاص شہید ہستی کے مقام اور تاریخی حیثیت کو اجاگر کرنے کے لئے ہم نے انتخاب کیا ہے، لیکن حاجی صاحب کے مذکورہ اشعار اپنی جگہ نہایت صاف اور شستہ ہیں اور بے ساختہ پن لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً

ع   پیتے ہیں حسرت سے ہم خونِ جگر
ع   خاک وخون میں لوٹتے ہیں ہم یہاں
ع   آپ تو راحت کے ساماں لے گئے
ع   ساتھ والے چل دے میں رہ گیا

یا حسب ذیل اشعار۔

جام کوثر سے ہوئے وہ لب بلب   چاٹتے ہیں پیاس سے ہم اپنے لب
مرغ آبی نے کیا دریا میں گھر   مرغ خاکی لوٹتا ہے خاک پر

حضرت تحفہ رحمۃ اللہ علیہا کا سراپا

حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ اولیائے کرام میں سے ہیں ایک بیمار خانے میں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں مختلف قسم کے مریض ہیں، ان مریضوں کو دیکھتے دیکھتے ان کی

نظر حضرت تحفہ پر پڑی جو عشقِ حقیقی میں جل کر کباب ہو رہی ہیں۔ ان کی صورت کو دیکھ کر سری سقطیؒ نے جو اثر لیا اس کا نقشہ اور سراپا حاجی صاحب اس طرح کھینچتے ہیں۔

تھا اسی میں جو گئی اک سو نظر   دیکھتا کیا ہوں کہ اک رشکِ قمر
تازہ و پاکیزہ رو صاحب تمیز   بالباس خوب وزیبا، اک کنیز
چہرہ اس کا گویا ہے شمعِ حرم   قامت اس کا گلبنِ باغِ ارم
زلف اس کی دامِ راہِ سالکاں   لعلِ لب اس کا ہے جانِ تشنگاں
چشم اس کی چشمہ ہے فتنے کا باز   خال اس کا تخمِ شوقِ پاک باز
اک طرف بیٹھی ہے جیسے شیر مست   دیکھ کر اس کو ہوئے غم میرے پست
قید میں بھی تھی وہ باصد آب و تاب   کوہ کے اندر ہو جیسے لعلِ ناب
تھیں دو آنکھیں اس کی جوں روشن چراغ   ذوقِ مستی سے کہ تھے اندر دماغ
اس کے رُخ کی دیکھ کر یہ آب و تاب   کھاتا تھا تارِ نظر سو پیچ و تاب
اس کو دیکھا میں نے جب باذوق و شوق   مثلِ قمری ہے گلے میں اس کے طوق
اور بندھے ہیں ہاتھ زنجیروں سے یوں   شاخِ طوبیٰ سے ہو لپٹا سانپ جوں
اور دو مضبوط لوہے کے کڑے   موٹے موٹے اس کے پاؤں میں پڑے
دست بردلِ نغمۂ خوش برزباں   عاشقانہ تھی غزل منہ سے عیاں
مجھکو جب دیکھا تو اس نے اس گھڑی   دی لگا آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
مثلِ ژالہ اشک برسانے لگی   روئے گل کو لالہ دکھلانے لگی
پوچھا داروغہ سے جا کر اس کے گھر   کیوں کیا ہے قید یہ یکتا گہر
بولا داروغہ یہ سُن کر اے عزیز   تھی یہ اک مولیٰ کی شائستہ کنیز
ہوگیا اس کو جنوں تقدیر سے   اس لئے ہے بند یہ زنجیر سے
اس کے مالک نے کیا بند اس لئے   تا کہ عقل و ہوش آجائے اسے

جب یہ داروغہ سے لونڈی نے سُنا رو پڑی اک بار اور سر کو دُھنا
دردناک اک کھینچ کر کے دِل سے آہ بولی میں ہوں اے عزیز وبے گناہ
اے مسلمانو! نہیں مجنون میں اپنے دلبر کی ہوں پر مفتون میں

مذکورہ بالا اشعار ہمیں ایک ایسی وادی کی طرف لے جاتے ہیں جہاں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی، جہاں صاف وشفاف پانی بھی ہے اور کہیں گدلا بھی، جہاں نرم نرم سبزہ بھی ہے اور خشک تنکے بھی۔ جہاں بہت اچھی اچھی تشبیہات بھی ہیں اور عمدہ استعارے بھی۔ الحاصل ان کے مذکورہ اشعار میں جوش اور ولولہ بھی پایا جاتا ہے۔ اور کلام میں روانی اور قدرت شعری پائی جاتی ہے۔ ہم نے حاجی صاحب کی صنف مثنوی پر بقدر ضرورت سب کچھ لکھ دیا ہے اس لئے اب ہم ان کے دوسرے اصنافِ سخن کی طرف قارئین کو لئے چلتے ہیں۔

رباعی

رباعی شعر کی مشہور صنف ہے جس میں کثیر مضامین کو چار مصرعوں میں دریا کو کوزے کی طرح بند کر دیا جاتا ہے، حاجی صاحب کے تمام کلام میں ہمیں صرف دو رباعیاں ملی ہیں جن میں سے ایک اردو میں ہے اور دوسری فارسی زبان میں۔ اردو کی رباعی گلزارِ معرفت کے آخری صفحہ پر درج ہے جو یہ ہے۔

ہے برا اچھا جو سمجھے آپ کو اور بالا سب سے یہ کھینچے آپ کو
مردم دیدہ سے سیکھ امداد تو سب کو دیکھے اور نہ دیکھے آپ کو

بلاشبہ یہ رباعی شیخ عبداللہ انصاری درویش کامل کی حسب ذیل رباعی کا کامیاب ترجمہ ہے۔ رباعی یہ ہے۔

عیب است بزرگ برکشیدن خود را وزجملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمک دیدہ بباید آموخت دیدن ہمہ کس را وندیدن خود را

دوسری رباعی فارسی زبان میں نالۂ امداد غریب کے اوّل میں جہادِ اکبر کے آخر میں درج ہے جو یہ ہے ۔

اے ذات تو بارحمت والطاف قریب دے رحمت ولطف بمناجات مجیب
اکنوں بطفیل احمد ویارانش مقبول شود نالۂ امداد غریب

مثلث ومخمس

مثلث ومخمس کا نمونہ اس سے پہلے دیا جا چکا ہے مثلث میں شجرہ چشتیہ ہے اور مخمس میاں جی نور محمد صاحب کی شان میں لکھا گیا ہے۔

تضمین

حاجی صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور مناجات پر جو جوڑ لگا کر مخمس بنا دیا ہے اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

کر سکے گا کیا کوئی وحدت میں تیری قیل وقال عقل و بحث وعلت ومعلول ہیں زار وعلیل
انت کافی فی مهمات وفی رزقٍ کفیل خذ بلطفك یا الٰهی من له زادٌ قلیل
مفلس بالصدق یاتی عند بابك یا جلیل

خود بخود ہو جائینگے یہ درد سارے دِل سے دُور جتنے مقصد ہیں بر آئیں گے الٰہی بالضرور
یہ تڑپ یہ بے قراری، فکر بے جا ہے قصور انت شافی انت کافی فی مهمات الامور
انت حسبی انت ربی انت لی نعم الوکیل

مذکورہ بالا تضمین سے حاجی صاحب کی قوت شعری اور قدرت سخن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسروں کے اشعار اور مطالب کے ساتھ جوڑ لگانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پہلی رباعی کا تیسرا مصرعہ عربی زبانی میں ہے جس سے ان کی شاعری کا ایک نمونہ مل گیا ہے۔

نعت وحمد اور مناجات

حاجی صاحب کے کلام میں حمد، نعت اور مناجات کے اشعار ان کی ہر ایک منظوم تصنیف میں پائے جاتے ہیں گویا ان کی شاعری کا ایک خاص حصہ حمد و نعت اور مناجات سے مزین ہے۔ حمد و نعت صنف شعر میں کوئی صنف تو نہیں البتہ ایسی شاعری اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ ہم نے ابتدائے کتاب میں موصوف کی حمد و نعت پیش کی ہیں وہاں آپ مطالعہ کر سکتے ہیں۔

تاریخی مادے

حاجی صاحب کو تاریخی مادوں میں بھی اچھا خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ مجھے اس سلسلے میں ان کے لکھے ہوئے دو تاریخی مادے دستیاب ہو سکے۔ ایک شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا اور دوسرا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا، شاہ عبدالغنی صاحب کا مادہ تاریخ یہ ہے۔

عالم وعارف شہ عبدالغنی   کرد چوں جملہ مراتب عمر طے
ایں ندا آمد زہر سو غم فزا   داد جاں عبدالغنی باجلوہ ے

دوسرا مادہ تاریخ مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کا یہ ہے۔

بست وہشتم ذیقعدہ کو   چل دیئے جنت کو یعقوب
رو کے کہا سب نے کہ جہاں سے   ماہ ہدیٰ ہوا آہ غروب

غزل

صنف شعر میں دراصل غزل سب سے زیادہ اہم صنف ہے اس میں شاعر کا کامیاب ہو کر نکلنا اس کی شاعری کا خاص معیار ہے۔ ہمارے خیال میں غزل میں حاجی صاحب دیگر اصناف کی بہ نسبت زیادہ کمال رکھتے ہیں۔ ان کی چند ایک غزلیں اور نعتیہ کلام گلزارِ معرفت میں موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی شاعری کا مقام معلوم کرنے کے لئے ان کی ان

غزلوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور پھر ان کی شاعری کا اندازہ لگانا چاہئے۔ لہٰذا ہم ان کی غزلوں کا انتخاب گلزارِ معرفت سے پیش کرتے ہیں:۔

غزل

عرش بریں پہ آپ ہیں زیر زمین ہوں میں
ملنا کہاں سے ہو کہ کہیں تم کہیں ہوں میں
گر تخت حسن وناز پہ ہیں آپ جلوہ گر
اقلیم عشق میں شہ مسند نشین ہوں میں
مثل نظر ہے آپ کا آنکھوں میں میر گھر
باوصف ایسے قرب کے بس دور بیں ہوں میں
اے وائے بدنصیبی کہ ملنا نہیں نصیب
سائے کی طرح گرچہ جہاں تم وہیں ہوں میں
رہ تیری تکتے تکتے دم آنکھوں میں آگیا
آجا نظر کہیں کہ دم واپسیں ہوں میں
دام بلا میں کس کے تو امداد جا پھنسا
مدت سے جو پتہ ترا پاتا نہیں ہوں میں

یہ غزل فن شاعری کے معیار پر حاجی صاحب کی بہترین غزل قرار دی جاسکتی ہے جس میں درد وسوز، چستی، برجستگی تخیل سب ہی کچھ موجود ہے۔ ایک اور غزل ملاحظہ فرمایئے۔

رخ سے کاکل اٹھادیا کس نے
رات میں دِن دکھا دیا کس نے
نغمۂ سرمدی سُنا کے ہمیں
مست بے خود بنا دیا کس نے
شعلۂ رُخ دکھا کے اپنا ہمیں
سر سے پا تک جلادیا کس نے
میں تو نام ونشان مٹا بیٹھا
میرا چرچا اڑا دیا کس نے
ہنستے ہنستے جو دم میں رونے لگی
شمع تجھ کو جلادیا کس نے
حُسن لیلیٰ دکھا کے اے امداد
تجھ کو مجنون بنادیا کس نے

اس غزل کے اشعار کس قدر رواں، پرشکوہ، مربوط اور فصیح ہیں کہ صاف ذوق کو پڑھ کر لطف محسوس ہوتا ہے۔

متقابل اور متضاد الخیالی

ایک غزل میں آپ نے اقبال کی طرح متضاد صفات کا نقشہ اپنی ذات میں کھینچا ہے۔ اقبال صاحب تو لکھتے ہیں ؎

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے
تیرے ہنگاموں سے اے دیوانہ رنگیں بیاں زینت گلشن بھی ہے آرائش صحرا بھی ہے

غرض کہ ’’عاشق ہرجائی‘‘ کے عنوان کے ماتحت بانگ درا میں اقبال نے اپنے اندر بہت سی متضاد صفتیں جمع کی ہیں۔ حاجی صاحب کے متضاد الصفات ہونے کا رنگ بھی دیکھیے:

غزل

باغ عالم میں ہیں باآہ وفغاں آزاد ہم آپ ہی قمری ہیں اور ہیں آپ ہی شمشاد ہم
داغ دِل گلشن ہے اپنا مرغ دِل سے نالہ گیر آپ ہی ہم گل ہیں اور ہیں بلبل ناشاد ہم
عشق کے صحرا میں آپنا آپ کرتے ہیں شکار آپ ہی ہم صید ہیں اور آپ ہی صیاد ہم
ہوگئے جب محو دلبر عشق پھر کس کا رہا آپ ہی شیریں ہوئے اور آپ ہی فرہاد ہم
قتل اپنے آپ کو کرتے ہیں بے تیغ وتبر آپ ہی مقتول ہیں اور آپ ہی جلاد ہم
آپ ہی اچھے ہیں اور ہیں آپ ہی سب سے برے الغرض جو کچھ ہیں پر ہیں جامع اضداد ہم
بے نشاں بے نام ہیں، ذیشاں ہیں اور ہیں نامور جو کہو سب کچھ ہیں پھر ناچیز بے بنیاد ہم
علم اپنا جہل ہے اور جہل اپنا علم ہے ہیں اسی دانش سے بے رہ صاحب ارشاد ہم
اپنے دشمن آپ ہیں اور آپ ہی ہیں اپنے دوست آپ کو کرتے ہیں ویراں تا کہ ہوں آباد ہم

ہے بہار ہم کو خزاں میں اور خزاں اندر بہار
غم ہے شادی میں ہمیں اور غم میں ہیں بس شاد ہم

مذکورہ غزل میں قمری وشمشاد، گل وبلبل، صید اور صیاد، شیریں فرہاد، مقتول وجلاد، دشمن ودوست، آباد وویران متقابل صفات وکیفیات کو اس طرح جمع کیا ہے کہ ہر ایک شان، تقابل کے باوجود شاعر نے حسن اسلوب سے اپنے اندر پیدا کر کے ثابت کی ہے۔

اب ایک دو غزلیں جن میں سے ایک حمدیہ اور دوسری مختلف خیالات کا مجموعہ ہے اور ملاحظہ کیجیے:

حمدیہ غزل

الٰہی یہ عالم ہے گلزار تیرا   عجب نقش قدرت نمودار تیرا
خوشی غم میں رکھی ہے اور غم خوشی میں   عجب تیری قدرت عجب کار تیرا
الٰہی عطا ذرۂ درد دِل ہو   کہ مرتا ہے بے درد بیمار تیرا
کوئی تجھ سے کچھ کوئی کچھ چاہتا ہے   میں تجھ سے ہوں یارب طلبگار تیرا
نہیں دونوں عالم سے کچھ مجھ کو مطلب   تو مطلوب میں ہوں طلب گار تیرا

اٹھا غم، رکھ امید، امداد حق سے
تجھے غم ہے کیا رب ہے غم خوار تیرا

غزل

نہ دیکھا داغ دِل گلزار کو دیکھا تو کیا دیکھا   نہ دیکھا خار میں گل، خار کو دیکھا تو کیا دیکھا
تماشائے دو عالم ہے مرے دلدار کا کوچہ   جہاں کے گلشن وبازار کو دیکھا تو کیا دیکھا
نہ دیکھا برشِ تیغ نگاہ یار کو تم نے   اگر شمشیر کی اک دھار کو دیکھا تو کیا دیکھا
نہ دیکھا ایک بھی تم نے اگر داغ جدائی کو   فلک سے گرچہ لاکھ آزاد کو دیکھا تو کیا دیکھا
نظر جب کھل گئی اپنی جسے دیکھا اسے دیکھا   نہ دیکھا آپ میں دلدار کو دیکھا تو کیا دیکھا
اِسے دیکھا اُسے دیکھا نہ یہ دیکھا نہ وہ دیکھا   نہ دیکھا ایک کو اغیار کو دیکھا تو کیا دیکھا

ہمارے شعر امدادؔ الٰہی سے ہیں ٹک دیکھو
اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

حاجی صاحب کی مذکورہ غزلوں کو پڑھئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان غزلوں کو پڑھ کر آپ بھی اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان غزلوں کا انتخاب جس شاعر کا کلام ہو اس میں شاعرانہ استعداد کتنی پختہ اور رواں ہے، حاجی صاحب کی مذکورہ غزلیں ہمارے خیال میں زبان کی صفائی، بندش کی چستی، خیال کی بلندی اور جذبات کی پاکیزگی کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ اور سب غزلوں اور مثنویوں میں معرفت کا رنگ ہے۔ حاجی صاحب اپنے اشعار پر خود بھی ناز کرتے نظر آتے ہیں، چنانچہ آخری غزل کا مقطع ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔

ہمارے شعر امدادؔ الٰہی سے ہیں ٹک دیکھو اگرچہ دفتر اشعار کو دیکھا تو کیا دیکھا

اسی قدر تبصرے پر ہم ان کی اردو شاعری کی بحث ختم کرتے ہیں اور ان کی اردو نثر کی طرف چلتے ہیں۔

* * *

اُردو نثر

آپ کی اُردو نثر کا جو کچھ ذخیرہ ہمارے سامنے ہے وہ لے دے کر ایک رسالہ ارشادِ مرشد اکیس صفحوں کا ہے یا خطوط ہیں جو مختلف دوستوں اور مریدوں کے نام ہیں یا ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' ہے جو بارہ صفحات کا ہے۔ اسی مختصر سامان نثر سے اردو کے کچھ نمونے پیش کئے جا سکیں گیں۔ اور ان میں سے بھی خاص طور پر اُردو خطوط کے۔

خط نویسی

خط نویسی اپنی جگہ اُردو نثر کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ غالب کو اردو نثر نگاری میں اس کے خطوط نے وہ مقام بخشا ہے جو اس کے منتخبہ دیوان اردو نے اسے شاعری میں عطا کیا ہے۔ خط نویسی کسی ادیب اور شاعر کی نثر کا اصلی نمونہ اس لئے بھی ہوتا ہے کہ وہ ان خطوط میں اپنی سادگی کو پیش نظر رکھتا ہے اور اپنے پرائیویٹ معاملات کو بے تکلفی سے لکھتا ہے۔ وہاں تکلف اور بناوٹ کا دخل نہیں ہوتا اس لئے اگر کسی کے ادبی نمونوں کو دیکھنا ہو تو اس کے پرائیویٹ خطوط کو دیکھنا چاہیے۔

ایک مضمون نگار جب کسی مضمون کو لکھتا ہے تو اس کو یہ پورا احساس ہوتا ہے کہ اس کا یہ مضمون دوسروں کی نظروں کے سامنے سے بھی گذرے گا اس لئے حتی المقدور وہ اس کو عمدہ اور اچھا بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن پرائیویٹ خطوط میں وہ اس قسم کی احتیاط پر کبھی دھیان نہیں دیتا، لہٰذا اصلیت کے ساتھ جو کچھ خطوط میں لکھتا ہے وہ اس کی زبان اور بیان کا صحیح مرقع ہوتا ہے، ان امور کے پیش نظر ہم پہلے حاجی صاحب کے بعض اردو خطوط پیش کرتے

ہیں۔

مکتوبات حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بنام: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ

از فقیر امداد اللہ عفی عنہ

بخدمت فیضدرجت سراپا خیر و برکت عارف باللہ جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب زاد عرفانہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ فقیر خیریت سے ہے اور آپ کی صحت و سلامتی خدا تعالیٰ کی جناب سے مطلوب۔ قبل ازیں آپ کی خدمت میں اپنی خیریت و کیفیت تحریر ہو چکی۔ ان شاء اللہ خط پہنچا ہوگا۔ روز بروز ضعف زیادہ ہوتا جاتا ہے اور دِل بہت گھبراتا رہتا ہے۔ آپ دُعائے حسن خاتمہ فرمائیں۔

عزیزم مولوی قاری حافظ احمد صاحب مکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، آپ اپنی جماعت سے خیال کر کے دُعا فرمادیں، یہ قاری صاحب آپ سے طالب دُعا ہیں، آپ دُعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہمارا آپ کا حسن خاتمہ فرمادے۔ آمین

(مہر) از مکہ مکرمہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ

(مکاتیب رشیدیہ ۵)

محبی و مخلصی عزیزم مولوی رشید احمد صاحب زید عرفانہ!

بعد سلام سنت الاسلام آنکہ خط آپ کا پہنچا۔ جواب پہلے خط کا ارسال کر دیا گیا

تھا۔ فقیر کو ضعف و نقاہت بہت ہے، نگاہ بھی بہت کم ہو گئی ہے، خط کے لکھنے پڑھنے سے معذور ہے، چار پائی پر نماز پڑھتا ہے، پیروں سے کھڑا نہیں ہوا جاتا ہے، غرض پا بر کاب ہے، سب وجہ سے دُعا کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے۔ آمین

بابت مسافر خانے کے جو قریب پانچ سو اشرفی کے جمع تھیں مولوی بدر الاسلام کے سپرد کیے گئے ہیں، باغوائے مخالفین کے حکام نے ضبط کر لیں، فقیر تو پہلے ہی ایسے معاملات سے دست بردار تھا، حافظ صاحب مرحوم کے انتقال سے اچانک یہ معاملہ آن پڑا، پھر بھی فقیر نے اُس کی طرف التفات نہیں کیا، جو کچھ اُن کا روپیہ تھا اُن کے سالے احمد گاما کے حوالے کیا گیا، مسافر خانہ کے ساتھ بھی علاقہ نہ رکھا، اُس کا ناظر مولوی بدر الاسلام صاحب کو کر دیا گیا تھا، یہ سب منجانب اللہ ہے۔ فقیر دونوں حال میں خوش ہے، ایسے امورات کے سننے سے بھی دل کو پریشانی بعض اوقات ہو جاتی ہے، لہٰذا ایسے امور کے تذکرہ سے یہاں احباب کو منع کر دیا ہے کہ فقیر سے یہ ذکر نہ ہوا کرے۔ (۱)

العبد الضعیف فقیر امداد اللہ عفی اللہ عنہ

(مکاتیب رشیدیہ ص: ۸)

ہم نے اردو نثر کے نمونے میں یہ دو خط پیش کیے ہیں جن سے قاری صاحب کے نثری انداز کا جائزہ لے سکتا ہے، لیکن خطوط اور تصنیف یا مضمون کی عبارت میں فرق ضرور ہوتا ہے اس لیے ارشادِ مرشد سے ایک قطعہ نثر پیش کرتے ہیں۔

مراقبے کا طریقہ

طریقہ مراقبے کا یہ ہے کہ دو زانو نمازی کی طرح سر جھکا کے بیٹھے اور دِل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق سبحانہ تعالیٰ کی حضوری میں حاضر رکھے۔ اول اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کے

---

(۱) حاجی صاحب کے بھتیجے حافظ احمد حسن تھے، جن کی شادی انبالے کے گاما والوں میں ہوئی تھی۔ حافظ صاحب کے انتقال کے بعد ان کی متروکہ جائیداد کے متعلق اشارہ ہے۔

تین بار اَللّٰہُ حَاضِرِیْ، اَللّٰہُ نَاظِرِیْ، اَللّٰہُ مَعِیْ یعنی زبان سے تکرار کر کے پھر مراقب ہو کے ان کے معنوں کا دِل میں ملاحظہ کرے اور تصور کرے۔ یعنی جانے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ حاضر ناظر میرے پاس ہے۔ اس جاننے میں اس قدر خوض کرے اور مستغرق ہو کہ شعور غیر حق کا نہ رہے۔ یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔ اگر ایک آن بھی اس سے غافل ہوا تو مراقبہ نہ ہوگا۔ (ارشادِ مرشد ص:۷)

خطوط کی نثر اور اس قطعۂ نثر میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گے۔ ہمارے خیال میں حاجی صاحب کے خطوط کی نثر ان کی تصنیفی نثر سے زیادہ صاف معلوم ہوتی ہے۔ اردو نثر پر قدرے تبصرے کے بعد ہم فارسی کی طرف قارئین کو لئے چلتے ہیں۔

فارسی ادب

حاجی صاحب نے جس دَور میں زندگی کے سانس لئے ہیں وہ سلطنت مغلیہ کا آخری دَور تھا۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کا عہد اچھی طرح دیکھا ہے۔ دہلی اکثر آنا جانا رہا ہے۔ اگرچہ عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلطنت مغلیہ زوال کی طرف جارہی تھی، اسی طرح حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی انحطاط ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود پوری انیسویں صدی پر فارسی چھائی رہی۔ نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور سکھوں کی علمی زبان فارسی تھی۔ خاص طور پر کایستھوں کے یہاں تو فارسی کی کافی قدر تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ الناس علی دین ملوکھم (لوگ بادشاہوں کے طور طریق پر ہوا کرتے ہیں) کے مطابق ہندوستان میں تمام قومیں فارسی لکھتی اور پڑھتی تھیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دَور میں اگرچہ فارسی دَم توڑ رہی تھی لیکن پھر بھی گلستان، بوستان اور سکندر نامہ کا پڑھا ہوا شخص معیاری قابلیت کا نمونہ سمجھا جاتا تھا۔

غالب جس نے اردو خطوط کے باعث انشا نگاری میں امامت کا مقام حاصل کیا

۱۸۵۷ء سے پہلے اردو میں خط لکھنا کسر شان سمجھتا تھا۔ اسی طرح فارسی میں شعر وسخن کو علمی درجہ حاصل تھا۔ حاجی صاحب کا دور خواہ کچھ بھی ہو فارسی کا ہی دَور تھا اس لئے ان کے زیادہ تر خطوط فارسی میں آج بھی موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی نظموں کا ذخیرہ اردو میں ہے لیکن نثر کا زیادہ تر حصہ فارسی کا ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں جو معرکہ آراء کتاب ہے وہ ضیاء القلوب ہے جو فارسی زبان میں ہے اور جس میں تصوف کے اعلیٰ مضامین کو مختصر عبارت میں بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں رسالہ ”وحدت الوجود“ جو دقیق علمی مسئلہ پر مشتمل ہے وہ بھی فارسی زبان میں ہے۔

اس وقت میرے سامنے جو فارسی تحریروں کا مجموعہ ہے وہ اسی قدر ہے۔ ان دونوں رسالوں کے سوا ”امداد المشتاق“ کے آخر میں جو ان کے خطوط ”مرقومات امدادیہ“ کے نام سے چھپے ہوئے ہیں ایک خط کے سوا کہ اردو میں ہے باقی ساٹھ خط فارسی زبان میں ہیں۔ یہ خط اردو خطوط سے کہیں زیادہ معیاری ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو جو آپ نے خطوط تحریر فرمائے تھے کچھ تو مرقومات امدادیہ میں ہیں اور ایک فارسی خط مکتوبات رشیدیہ میں درج ہے۔ ان خطوط کے علاوہ ایک اور خطوط کا مجموعہ ہے جو حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں اور جو طبع ہو چکا تھا۔ بہر حال حاجی صاحب کے فارسی مکاتیب زبان اور معنی دونوں حیثیت سے معیاری خطوط ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل خط ذوق خاطر کے لئے پیش خدمت ہے۔

* * *

بنام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب
و
حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب

از کمترین خلائق مسمّٰی بہ امداداللہ عفااللہ عنہ

بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم و مولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم باللہ۔ بعد سلام مسنون واشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز باد۔ مکتوب مع پارچہ کھیس یکے مورخہ ۲۶ / جمادی الثانی و دیگر مورخہ ۲۲ / شوال رسیدند۔ از مندرجۂ آنہا آگاہی یافتم از انتقال عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم رنج گردید خداوند تعالیٰ مغفرتش کند برائے او طواف و دعائے مغفرت کردہ شد قبول باد و نیز از دریافت نکاح (۱) ثانی عزیزہ ام ہمشیرہ مولوی محمد قاسم بحسن تدبیر و سعی مولوی صاحب موصوف و آنعزیز خیلے فرحت ہا اندوختم کہ بقلم نمی گنجد و بے اختیار دعائے خیر بحق آں عزیزاں وغیرہ و نہال احمد و برخوردار ضیا احمد از تہ دِل برمی

---

(۱) ہندوستان میں مسلمان شرفا کے خاندانوں میں بھی نکاح بیوگاں کو نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس خلافِ سنت اور کفار کی رسم کو توڑنے کے لئے سخت جہاد کیا۔ آپ نے اپنی کسی تقریر میں حسب عادت نکاح بیوگان کی نصیحت فرمائی تو کسی نے طعنے کے طور پر کہا کہ پہلے اپنی بیوہ بہن کا تو نکاح کردو۔ یہ سن کر آپ بہن کی خدمت میں تشریف لے گئے حالانکہ وہ بوڑھی اور جوان اولاد والی تھیں، لیکن آپ نے عرض کیا کہ آپ کی وجہ سے ایک سنت رسول اللہ زندہ ہوتی ہے انہوں نے قبول کرلیا اور شیخ نہال احمد دیوبندی سے نکاح پڑھایا گیا۔ حاجی صاحب اسی نکاح کے متعلق اس خط میں خوشی کا اظہار فرمارہے ہیں۔ (مصنف)

آید۔ خدا تعالیٰ آں عزیزاں را مدام بر طریق شریعت و رضا مندی خود مستقیم و مستدیم دارد و از نورِ ہدایت شما عالم را منور گرداند۔ و از تمامی نعمائے عرفانی و کمالات قربت خود مشرف سازد آمین۔

و از اجرائے مدرسہ علمِ دین بسعی آں عزیزاں و عزیزم حافظ عابد حسین صاحب چہ خوشیہا رد نمود کہ بہ بیان نمی آید۔ خدائے تعالیٰ ایں امر خیر را جزائے خیر دہاد و آں عزیزاں را باید کہ نفع رسانی را در امورِ دین مثل وعظ و پند و ارشاد و تلقین بر ہمہ امور مقدم دارند و اوقاتِ خود را دریں صرف سازند زیرا کہ دین اسلام بسیار ضعیف گردیدہ و مددگار اینہاں کمیاب شدہ و اگر طالب صادق باشد یا کاذب اگر پیش آید کسر نفسی را بر طاق نہادہ باد مشغول شوند۔ خدائے تعالیٰ ہادی مطلق است ہدایت خواہد نمود و نیز بحکم

''دل بیار و دست بکار''

مشغولی باطن را از دست ندہند و اگر مناسب دانند و در رائے آں عزیزاں آید نسخہ ''ضیاء القلوب'' را نزد مولوی عبدالحکیم صاحب برادر شیخ الٰہی بخش ٹھیکہ دار میرٹھ بفرستند کہ اوشاں طبع خواہند کنانید چرا کہ خط اوشاں نزد احقر آمدہ بود بایں مضمون کہ:

> ''نسخہ مذکور نزدم بفرستند حسب مرضی تو یعنی احقر طبع کنانید نزد مولوی محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحب وغیرہ خواہم فرستاد اوشاں را اختیار است ہر کہ را اہل خواہند دانست خواہند داد۔''

اگر ایں صورت ظہور کرد مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکہ ہیچ حرج و تکلیف نہ شود خود میرٹھ رفتہ در پیش نظر خویش بصحت تمام مع تحشیہ وغیرہ در مطبع منشی ممتاز علی صاحب طبع کنانند۔ و در رسالہ مذکور ہر جا کہ الفاظ غیر مربوط باشند و عبارت خراب باشد اصلاح دہند و ادب را یکسو نہند و الامر فوق الادب را پیش گیرند و نیز

یقین است کہ پرچۂ شجرہا را منشی صاحب درذیل رسالہ طبع خواہند نمود وہم باید دانست کہ حضرت مرشدم میانجیو (نور محمد) صاحب قدس سرہ راانتساب است ازسید صاحب بلاواسطہ حاجی صاحب قدس سرہ پس نام حضرت میانجی صاحب بعد نام سید صاحب بنویسند وحاجی صاحب را انتساب از شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ بواسطہ سید صاحب نیز ودر شجرۂ سہروردیہ از خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ ہمیں قدر رسید کہ شیخ عظیم اللہ اکبرآبادی عن ابیہ عن جدہ ونام پدر وجد شاں معلوم نیست۔ شما ہم بایں طور بنویسید وشجرۂ مداریہ وقلندریہ شاید کہ بسہو نہ نوشتہ ام شما بنویسید واگر فراغ باشد بعد نمازِ صبح ویا مغرب ویا عشا علیحدہ در حجرہ وغیرہ بہ نشینند ودِل راازجمیع خیالات خالی کردہ متوجہ بایں جانب شوند وتصور کنند کہ گویا پیش شیخ خود نشستہ ام وفیضان الٰہی ازسینۂ او بسینہ ام می آید بایں حیثیت اگر دِل بچسپد ذوق وشوق دست دہد فبہا والا ذکر نفی واثبات بجہر متوسط مشغول باشند۔ یک دو ساعت کم وزیادہ مشغول دارند۔

ومولوی عبدالرحمٰن خلف الرشید مولوی احمد علی صاحب راحسب درخواست شان غائبانہ بیعت گرفتہ داخل سلسلۂ بزرگان خود کردہ شد خدا تعالیٰ قبول کند واز فیضان بزرگان سلسلہ مشرف سازد آمین۔ واوشاں را بعد سلام، دعائے خیر فرمودہ گویند کہ مولوی محمد قاسم صاحب ومولوی محمد یعقوب صاحب را بجائے فقیر دانستہ از خدمت شاں فیضیاب بودہ باشند۔ اگر درمقدر است از فقیر نیز ملاقات خواہد شد۔ وبحق برادر شاں نیز دعا کردہ شد انشاء اللہ تعالیٰ اوشاں بصلاحیت خواہند آمد۔ وفکر ارسال مظاہر حق نہ کنند درینولا چنداں حاجت نیست مگر پنج شش جلد قرآن شریف مترجم کہ برحاشیہ اش تفسیر عبداللہ بن عباس مطبوع گردیدہ از منشی صاحب گفتہ ضرور ارسال فرمایند۔ قیمت آنہا کہ از مطبع

برآمدہ برنگارند کہ دریں جا چند اشخاص بسیار شائق اند وقیمت آنہا می دادند مگر من نہ گرفتم وگفتم کہ بروقت آمدن جلد ہائے قرآن شریف گرفتہ فرستادہ خواہد شد۔

وآنکہ درمقدمہ تالیف رسالہ دیگر بطور نصائح بیان عقائد وطرق مسلم بزرگاں ایماء رفتہ بود عزیز من دریں مقدمہ کتب بسیار اند مثل آداب المریدین وغیرہ۔ دیگر آنکہ فقیر بے علم است درین امر جرأت نمی شود مگر چوں مولوی محمد قاسم دریں امر تحریر نماید یا آں عزیز انشاء اللہ خواہد شد۔ موافق مرضی فقیر ومولوی رشید احمد صاحب نیز شریک خواہند شد وحال انتقال مولوی محب اللہ پانی پتی از تحریر سابق معلوم بودہ باشد کہ وقت مراجعت از مدینہ منورہ از دست بدواں شہید شدند انا للہ وانا الیہ راجعون بخدمت عزیز جانم مولوی قاسم صاحب مکرر آنکہ بہ ہمشیرۂ خود وبرخوردار ضیا احمد رابعد سلام ودعائے خیر گفتہ دہند کہ ایں احقر را ازیں عمل خیر شما بسیار فرحت رونمود خدائے تعالیٰ جزائے خیر دہد واز تمامی نعمائے دینی ودنیوی مشرف کناد وبخدمت بھائی صاحب مکرم ومعظم جناب شیخ اسد علی صاحب سلمہ بعد سلام نیاز مبارک باد، اللہ تعالیٰ آں جناب را توفیق اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دہاد امید قوی ست کہ ہمیں عمل خیر وسیلۂ نجات جناب شود عجب نیست۔ وشکر کنند کہ خدا تعالیٰ شما را یک ولی کامل عطا فرمودہ کہ ببرکت انفاس او ایں چنیں اعمال نیک در رضامندی اللہ ورسول بظہور آمد والا ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند۔

عزیز جانم چار خط شما دو مورخہ جمادی الثانی ۳ ۱۲۸ھ بروقت آمدن از مدینہ منورہ وصول یافتم ویک مورخہ ۲۱ رشوال ودیگر مرقومہ ۴ رذیقعدہ رسید از مطالعہ آنہا مسرتہا اندوختم واز جواب ہر یک علیحدہ علیحدہ بسبب بے قابو بودن دست معذورم معاف دارند۔ ورسید مبلغان از حاجی بوعلی بخش صاحب رسید خاطر جمع

دارند۔

مولوی ذوالفقار علی صاحب داخل سلسلۂ بزرگان شدند مگر بسبب عدم فرصت و کم قیام وسفر مدینۂ منورہ وغیرہ ہیچ کردن نتوانستند۔ لہٰذا بآنعزیز حوالہ کردہ می آیند۔ برحال شاں توجہ مرعی دارند واز تعلیم وتلقین دریغ ندارند وہر کس کہ طالب حق اند کاذب باشند یا صادق ازو انکار نکنند باد مشغول شوند بعونہ تعالیٰ صدق شما برکذب شاں غالب خواہد شد۔ اگر در مقدر است ہدایت خواہند یافت۔ فقط از حال عزیز از جان حافظ احمد حسین برنگارند کہ او دریں سال ہیچ حال نہ نوشتہ است معلوم شد کہ برتحریر من کہ او را بطور نصائح نوشتہ بود خفا شد وہیچ از حال خود واہل وعیال نہ نوشتہ است خیر او داند مراسلہ رحمی ضرور است، عزیزاں واقربایاں راسلام فقط۔ (مرقوماتِ امدادیہ ص: ۲۴۷ تا ۲۵۴)

ترجمہ:

کمترین خلائق امداد اللہ عفا اللہ عنہ سے بخدمت بابرکت عالم عامل عزیزم مولوی محمد قاسم ومولوی محمد یعقوب صاحب دام شغلکم باللہ۔ بعد سلام مسنون واشتیاق مشحون مشہود رائے عزیز ہو۔ ایک مکتوب مع پارچہ کھیس مورخہ ۲۶ر جمادی الثانی اور دوسرا مورخہ ۲۲ر شوال پہنچا۔ مندرجہ احوال سے آگاہی ہوئی، عزیز شیخ احمد دیوبندی مرحوم کے انتقال سے رنج ہوا۔ خداوند تعالیٰ اس کی مغفرت کرے اس کے لئے طواف کیا گیا اور مغفرت کی دعا بھی قبول ہو۔ اور مولوی محمد قاسم کی ہمشیرہ کا دوسرا نکاح ان کے حسن تدبیر اور تمہاری اور ان کی کوشش سے مجھے بہت خوشیاں حاصل ہوئیں کہ احاطۂ قلم سے باہر ہیں اور تم عزیزوں کے حق میں بے اختیار دعائے خیر اور نہال احمد اور برخوردار ضیا احمد کے لئے بھی دل کی گہرائی سے نکلتی ہے۔ خداوند تعالیٰ تم عزیزوں کو ہمیشہ اپنی

رضامندی اور شریعت پر قائم اور دائم رکھے اور تمہارے نورِ ہدایت سے عالم کو روشن کرے۔ اور اپنی قربت کے کمالات اور عرفانی نعمتوں سے عزت بخشے آمین۔

اور تم عزیزوں اور عزیزم حافظ عابد حسین صاحب کی کوششوں سے دینی مدرسے کے اجراء سے اسقدر خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کارِ خیر کو ہمیشہ جاری رکھے اور اس کے کوشش کرنے والوں اور شوق دلانے والوں کو جزائے خیر دے۔ اور آپ عزیزوں کو چاہئے کہ امورِ دین کے ذریعہ نفع رسانی مثلاً وعظ، نصیحت اور ارشاد و تلقین کو تمام کاموں پر مقدم سمجھیں اور اپنے اوقات کو ان کاموں میں صرف کریں۔ کیوں کہ دین اسلام بہت کمزور ہو گیا ہے اور اس کے مددگار نایاب ہو گئے ہیں۔ اور اگر کوئی طالب صادق یا کاذب ہی کیوں نہ ہو پاس آئے تو انکساری کو بالائے طاق رکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوں۔ ہادیٔ مطلق تو اللہ تعالیٰ ہے وہ ہدایت کرے گا اور

’’دل بیار و دست بکار‘‘

کے مطابق باطنی مصروفیت کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اگر مناسب سمجھیں اور تم عزیزوں کی رائے ہو ’’ضیاء القلوب‘‘ کا نسخہ مولوی عبدالحکیم صاحب کے پاس جو کہ شیخ الٰہی بخش ٹھیکیدار کے بھائی ہیں میرٹھ بھیج دیں کہ وہ طبع کرائیں گے کیوں کہ ان کا خط احقر کے پاس آیا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

> ’’مذکورہ نسخہ میرے پاس بھیج دیجئے آپ کی حسب مرضی طبع کرا کے مولوی محمد قاسم اور مولوی رشید احمد صاحب وغیرہ کے پاس بھیج دوں گا۔ انہیں اختیار ہے کہ جس کسی کو قابل سمجھیں گے عنایت فرما دیں گے۔‘‘

اگر یہ صورت ہوگئی تو مولوی محمد قاسم صاحب بشرطیکہ کوئی حرج اور تکلیف نہ ہو خود میرٹھ جاکر اپنے سامنے پوری صحت مع حاشئے وغیرہ کے منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں چھپوائیں۔ اور مذکورہ رسالہ میں جہاں کہیں غیر مربوط الفاظ ہوں، یا عبارت درست نہ ہو تو اصلاح کردیں اور ادب کو علیحدہ رکھیں اور ''حکم ادب پر فوقیت رکھتا ہے'' کو پیش نظر رکھیں اور یہ بھی یقین ہے کہ شجروں کے پرچے کو منشی صاحب رسالے کے ذیل میں طبع کریں گے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ حضرت مرشدم میانجی (نور محمد) صاحب قدس سرہ کو سید صاحب سے بلاواسطہ حاجی صاحب قدس سرہ نسبت ہے۔ اس لئے حضرت میانجی صاحب کا نام سید صاحب کو شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سید صاحب کے واسطہ سے نسبت حاصل ہے اور بلاواسطہ بھی۔ اور شجرۂ سہروردیہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان سے اسی قدر اطلاع پہنچی ہے کہ عظیم اللہ اکبرآبادی عن ابیہ عن جدہ اور ان کے باپ اور دادا کا نام معلوم نہیں ہے۔ آپ بھی اسی طرح سے لکھیں اور شجرۂ مداریہ وقلندریہ شاید میں نے بھول کر نہیں لکھا اس لئے آپ لکھ لیں۔ اور اگر فرصت ہو تو صبح یا مغرب اور یا عشا کی نماز کے بعد علیحدہ حجرہ وغیرہ میں بیٹھیں اور دل کو تمام خیالات سے خالی کر کے اس طرف متوجہ ہوں اور تصور کریں کہ گویا اپنے شیخ کے پاس بیٹھا ہوں اور خدائی فیض ان کے سینے سے میرے سینے میں آرہا ہے۔ اس معاملہ میں اگر دلچسپی ہو اور ذوق وشوق ملے تو اچھا ہے ورنہ نفی واثبات کا متوسط آواز میں کریں۔ ایک دو ساعت کم وبیش مصروف رہیں۔

اور مولوی عبدالرحمٰن خلف الرشید مولوی احمد علی صاحب کو ان کی درخواست کے بموجب غائبانہ بیعت لے کر اپنے خاندان کے بزرگوں کے سلسلے میں داخل

کرلیا گیا ہے۔ خداوند تعالیٰ قبول فرمائیں۔ اور سلسلہ کے بزرگوں کے فیض سے عزت بخشے۔ آمین اور ان کو بعد سلام، دعائے خیر سے یاد کر کے کہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب اور مولوی محمد یعقوب کو فقیر کی جگہ جان کر ان کی خدمت سے فیضیاب ہوتے رہیں۔ اگر تقدیر میں ہے تو فقیر سے بھی ملاقات ہوگی۔ اور ان کے بھائی کے حق میں بھی دُعا کی گئی۔ انشاءاللہ وہ راستی پر آجائیں گے۔ اور مظاہر حق بھیجنے کی فکر نہ کریں۔ سردست کوئی خاص ضرورت نہیں ہے البتہ پانچ چھ قرآن شریف کی جلدیں کہ اس کے حاشیہ پر عبداللہ بن عباس کی تفسیر چھپی ہوئی ہے منشی صاحب سے کہکر ضرور بھیجیں۔ ان کی قیمت جو مطبع کی تجویز کردہ ہے لکھیں کیوں کہ یہاں چند صاحبان بہت مشتاق ہیں اور یہ لوگ ان کی قیمت دے رہے تھے، مگر میں نے نہیں لی اور کہہ دیا کہ قرآن شریف آنے پر بھیج دی جائے گی۔

اور دوسرے رسالے کی تصنیف کے مقدمہ میں نصیحت کے طور پر جو عقائد کا بیان اور مسلم بزرگوں کے طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا تو میرے عزیز اس مقدمہ میں بہت سی کتابیں ہیں۔ مثلاً آداب المریدین وغیرہ۔ پھر بات یہ ہے کہ فقیر بے علم ہے اس معاملہ میں جرأت نہیں ہوتی۔ البتہ اگر مولوی محمد قاسم اس معاملہ میں لکھیں یا آں عزیز تو خوب ہوگا۔ فقیر کی مرضی کے مطابق مولوی رشید احمد بھی شریک ہوں گے اور مولوی محب اللہ پانی پتی کے انتقال کا حال پہلی تحریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ مدینہ منورہ سے لوٹنے کے وقت بدوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون عزیز از جان مولوی محمد قاسم صاحب کی خدمت میں مکرر یہ کہ اپنی ہمشیرہ اور برخوردار ضیا احمد کو دُعائے خیر اور سلام کے بعد کہیں کہ اس احقر کو تمہارے اس عمل خیر سے بہت خوشی ہوئی۔ خدائے

تعالیٰ جزائے خیر دے اور تمام دینی اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال کرے اور بھائی صاحب مکرم و معظم شیخ اسد علی صاحب سلمہ کو بعد سلام نیاز مندانہ مبارک باد دیں اللہ تعالیٰ آں جناب کو اتباع سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی توفیق دے۔ قوی امید ہے کہ یہی کارِ خیر جناب کی مغفرت کا ذریعہ بن جائے تو تعجب نہیں ہے۔ اور شکر کریں کہ خداوند تعالیٰ نے تمہیں ایک کامل ولی عطا فرمایا کہ ان کے انفاس کی برکت سے ان جیسے نیک عمل اور اللہ اور رسول کی رضامندی ظہور میں آئی ورنہ ''ایں دولت سرمد ہمہ کس راند ہند''۔

عزیز جانم تمہارے چار خطوط پہنچے۔ دو مورخہ جمادی الثانی ۱۲۸۳ھ مدینہ منورہ سے واپس آنے پر وصول پائے اور ایک مورخہ ۲۱ رشوال ۱۲۸۳ھ کو اور دوسرا ۴ رذیقعدہ ۱۲۸۳ھ کا لکھا ہوا پہنچا۔ اس کے مطالعہ سے مسرتیں نصیب ہوئیں۔ ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ جواب دینے سے ہاتھوں کے بے قابو ہونے کے باعث معذور ہوں معاف فرمائیں۔ اور حاجی بو علی بخش صاحب کے روپیوں کی رسید پہنچی مطمئن رہیں۔

مولوی ذوالفقار علی صاحب بزرگوں کے سلسلے میں داخل ہو گئے لیکن عدیم الفرصتی، قیام قلیل اور مدینہ منورہ کے سفر کے باعث کچھ نہیں کر سکے۔ اس لئے آں عزیز کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ ان کے حال پر توجہ کریں اور تعلیم و تلقین سے دریغ نہ فرمائیں اور جو لوگ کہ حق کے طالب ہیں، کاذب ہوں یا صادق ان سے انکار نہ کریں۔ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اللہ کی مدد سے تمہاری صداقت ان کے جھوٹ پر غالب ہوگی۔ اگر تقدیر میں ہے تو ہدایت پائیں گے۔ فقط عزیز از جان حافظ احمد حسین کا حال لکھیں، کیوں کہ اس سال میں انہوں نے کوئی اطلاع نہیں دی، معلوم ہوا کہ میری تحریر سے جو نصیحت کے طور

پر میں نے لکھی تھی خفا ہو گیا۔ اور اپنا اور اہل وعیال کا کوئی حال نہیں لکھا۔ اچھا وہ جانے مجھے تو صلہ رحمی ضروری ہے۔ عزیزوں اور قریبوں کو سلام فقط

حاجی صاحب کا مذکورہ بالا خط شاید ان کی زندگی کے تمام خطوط میں زیادہ طویل ہے چونکہ آپ مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے اس لئے مہینوں میں ہندوستان کے دوستوں، عزیزوں، مریدوں کے جو خطوط جاتے تھے ان کے جواب میں بہت کچھ لکھنے کی تمنا ہوتی تھی اس خواہش کے ماتحت خط بہت ہی طویل ہو گیا ہے۔

میں نے اس خط کو بچند وجوہ منتخب کیا۔ سب سے بڑی بات تو یہ سمجھی کہ اس خط میں بعض تاریخی واقعات ہیں جو تحقیق کے طالب علم کے لئے تاریخ کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اور بہت سی وہ گتھیاں سلجھا دیتے ہیں جو تحقیقات اور ریسرچ کے طالب علم کو پریشان کرتی ہیں۔ مثلاً:

۱...... دارالعلوم دیو بند کے اجرا اور ترقی کا ذکر۔

۲...... نکاحِ بیوگان کے جہاد میں مولانا محمد قاسم صاحب کی سرگرمی اور اپنی ہمشیرہ کا نکاح۔

۳...... مولانا ذوالفقار علی صاحب والد محترم شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا حج کے لئے جانا اور حاجی صاحب سے ذی الحجہ ۱۲۸۳ھ کے حج میں بیعت ہونا۔

جہاں تک فارسی زبان کا تعلق ہے خط کی عبارت نہایت ہی سادہ اور سہل ہے۔ اردو سے آپ کے فارسی خطوط میں روانی معلوم ہوتی ہے۔

افسوس کہ ہم نے اس خط کو تاریخی اہمیت دیتے ہوئے منتخب کیا ورنہ ان کے دوسرے خطوط بھی ہماری نظروں کے سامنے ہیں جو عبارت اور زبان کے اعتبار سے دلچسپ، برجستہ اور چست ہیں میں اس خط کو لکھتا جاتا تھا اور طوالت سے گھبرا کر کئی دفعہ اس کو چھوڑ کر دوسرے خطوط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا لیکن اسی کو لکھتے چلے جانے پر طبیعت کو مجبور اور قلم کو رواں

پاتا تھا تا آنکہ یہ خط اختتام کو پہنچ گیا۔ اب کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ اور خط پیش کیا جائے۔ البتہ بعض دوسری فارسی عبارتیں ضیاء القلوب اور رسالہ وحدۃ الوجود سے پیش کی جاتی ہیں۔

حسبِ ذیل فارسی عبارتیں حاجی صاحب کے رسالے سے جو ''وحدۃ الوجود'' کے نام سے موسوم ہے پیش کی جاتی ہیں۔ یہ مضمون دراصل مولوی محمد عبدالعزیز صاحب کے خط کا جواب ہے۔ انہوں نے حاجی صاحب کو لکھا تھا کہ:

> ''مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم معتقدان وحدۃ الوجود و وحدۃ الموجود را ملحد وزندیق می گفتند۔ مرید و شاگرد شاں مولوی احمد حسن صاحب نیز ہمچناں می گویند و اقوال ضیاء القلوب را تاویل می دانند تاویل دان آں جز خود دیگرے را نمی شمارند و مولوی رشید احمد صاحب و مولوی محمد یعقوب صاحب نیز ہم بریں مسلک بودہ اند باوجود آں کہ اجازت از تو گرفتہ اند و مشرب اہل چشت می دارند خلاف مشرب چشت سخناں می گویند۔'' (وحدۃ الوجود ص:۹)

ترجمہ:

مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود کے معتقدین کو ملحد اور زندیق کہتے تھے۔ ان کے مرید اور شاگرد مولوی احمد حسن صاحب (امروہوی) بھی یہی کہتے ہیں اور ضیاء القلوب کے اقوال کی تاویل کرتے ہیں اور ان کی تاویلوں کو اپنے سوائے اور کسی کو جاننے والا نہیں سمجھتے اور مولوی رشید احمد اور مولوی محمد یعقوب صاحب کا بھی یہی مسلک ہے حالانکہ آپ سے ہی ان کو اجازت خلافت حاصل ہے اور اہل چشت کا یہ لوگ مذہب رکھتے ہیں اور چشتیوں کے مشرب کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کی حقیقت

”دراصل مسئلہ مذکور حق و بالیقین است صدق آں نگاہ را (آں وقت) معلوم گردد کہ طالب از محنت وورزشہا و ممارست استغراق دراں و ترک خطرات ماسوا از خودی خود شود۔ چوں از خیال خود گذشت گویا از ہمہ گذشت ہیچ شے در نظر او وخیال او نماند۔ ہمہ ہستی حق معائنہ کند۔ وقتیکہ از نظر سالک تقیدات وہستی ما مرتفع گردید جز خدا ہیچ نہ بیند بے خبر گردد بلکہ شعور ایں معنی ہم مرتفع شود۔ ہر چہ بیند۔ ہو ہو گفتن چہ معنی انا گوید۔ ایں مرتبہ را فنا در فنا گویند ایں گفتہا را از نی نباید فہمید بلکہ نائی میگوید مولانا قدس سرہ راست۔

نے کہ ہر دم نغمہ آرائی کند — فی الحقیقت از دم نائی کند
بے فنائے خویش و بے جذب قوی — کے حریم وصل را محرم شوی

دراصل مسئلہ مذکورہ یقینی اور حق ہے۔ اس کی صداقت اس وقت معلوم ہوسکتی ہے کہ طالب (حق) ورزشوں، محنتوں اور اس میں استغراق کی مہارت اور ماسوائے خدا کے اپنی خودی کے خیالات دور ہو جائیں جب اپنے سے گذر جائے تو گویا سب سے گذر گیا۔ اس کی نظر اور خیال میں کوئی چیز نہ رہے گی۔ صرف حق ہی حق دیکھے گا اور جس وقت سالک کی نظر سے ماسوائے خدا کی ہستی اور تعلقات ماسوا اللہ اٹھ جائیں گے تو خدا کے سوائے کچھ نظر نہ آئے گا (اور) بے خبر ہو جائے گا بلکہ اس کا شعور بھی نہ رہے گا۔ جو کچھ دیکھے گا اس میں خدا ہی دیکھے گا۔ ہو ہو کہنا کیا معنی انا (میں) کہے گا۔ اس مرتبہ کو فنا در فنا کہتے ہیں ان باتوں کو بانسری سے نہ سمجھنا چاہئے بلکہ بانسری بجانے والا کہتا ہے مولانا روم نے کہا ہے۔

بانسری جو ہر دم نغمے نکالتی رہتی ہے۔ یہ درحقیقت بانسری بجانے والے کی

پھونک سے نکلتے ہیں۔ اپنے آپ کو فنا کیے بغیر اور جذب قوی کے بغیر تو وصال کی بارگاہ سے واقف نہیں ہو سکتا۔

مثال

مثل آں آہن پارہٗ کہ در آتش سُرخ شدہ نعرہ زد کہ من آتشم انکار ایں قول وے کردہ نمی شود اما واقعی آتش نشدہ است ایں حالتے است بر پارہٗ آہن عارض شدہ وگرنہ آہن آہن است و آتش آتش۔ این است شمہٗ از حقیقت وحدۃ الوجود۔ (رسالہ وحدۃ الوجود)

وحدۃ الوجود کی مثال اس لوہے کے ٹکڑے کی سی ہے جو آگ میں سرخ ہو کر نعرہ لگائے کہ میں آگ ہوں۔ اس کے اس قول کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں وہ لوہا واقعی آگ نہیں بن جاتا بلکہ لوہے کے ٹکڑے پر یہ حالت عارضی طاری ہوتی ہے ورنہ لوہا، لوہا ہے اور آگ آگ ہے۔ یہ ہے کچھ وحدت الوجود کی حقیقت کا حال۔ (رسالہ وحدۃ الوجود)

وحدۃ الوجود کے مضمون کے متعلق حاجی صاحب کی ایک اور فارسی عبارت ملاحظہ ہو لکھتے ہیں:

”اوّل بمصقلہٗ ذکر، نفس مطیع وقلب صافی شود۔ ذوق وشوق رابترقی آرد۔ دِل از خطرات بالسند۔ وقت مراقبہ لا موجود الا اللہ درآید۔ چوں دریں مراقبہ ”از ہمہ اوست“ اغماض نظر کردہ ”ہمہ اوست“ را پیش دارد۔ دریں استغراق فیض باطنی وجذبہٗ یقینی مددی فرماید۔ از ہرچہ بجز اوست بی خبر گردد وشعور ایں بے خبری ہم نمی ماند۔ بیند ہرچہ اند ہرچہ داند، گوید ہرچہ گوید معذور است۔“

ایں است وحدۃ الوجود وحدۃ الموجود مثل آہن پارہ کہ در آتش رنگ آتش گرفتہ نعرہ اَنا النار زدنہ کہ آں کہ بانقلاب حقیقت آتش شدہ از خیال آہن یارگی خود

> گذشتہ منتظر آنست کہ آتش بر خود مستولی گردد، و رنگ خود بخشید۔ در ایں تصور اگر خیال دیگر گذرد در حق وے شرک است کہ مانع مقصود و قاطع طریق اوست۔
>
> **ترجمہ:** ''اول ذکر کی صیقل سے نفس مطیع اور دِل صاف ہوجاتا ہے۔ ذوق وشوق ترقی کی طرف آتا ہے۔ دِل میں خطرات نہیں آتے۔ مراقبہ کے وقت لاموجود الا اللہ اندر پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ اس مراقبہ ''از ہمہ اوست'' سے نگاہیں بند کرکے ''ہمہ اوست'' کو سامنے رکھتا ہے تو اس استغراق میں باطنی فیض اور یقینی جذبہ مدد فرماتا ہے۔ ماسوا اللہ کے جو کچھ بھی ہے (مراقبہ کرنے والا) بے خبر ہوجاتا ہے۔ خبر اس بے خبری کی خبر بھی نہیں رہتی ہے۔ جو کچھ دیکھتا ہے، دیکھتا ہے اور جو کچھ جانتا ہے، جانتا ہے، جو کچھ کہتا ہے، کہتا ہے، (سب باتوں سے) معذور ہے۔ یہی ہے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الموجود جیسے لوہے کا ٹکڑا کہ آگ میں، آگ کا رنگ پکڑ لیتا ہے۔ ''میں آگ ہوں'' کا نعرہ لگاتا ہے حالانکہ وہ واقعی آگ نہیں بن جاتا۔ بلکہ اپنے لوہے کا ٹکڑا ہونے کے خیال سے بھی گذر کر اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ اس پر آگ غالب ہوجائے اور اپنے رنگ میں رنگ دے۔ اس تصور میں اگر دوسرا خیال بھی گذرے تو اس کے حق میں شرک ہے کہ وہ مقصود کے خلاف اور اس کے لئے قاطع راہ ہے۔

اس عبارت میں مسئلہ ''ہمہ اوست'' کی اور وضاحت کے ساتھ تفصیل ہے۔ جو اہل علم وصاحب دِل کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم حاجی صاحب کا منشا یہ ہے کہ وحدۃ الوجود ایسے مسائل میں ہے جس کو عوام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ عوام کے مسائل اور ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ایں مسئلہ بسیار نازک و نہایت دقیق است، فہم عوام بلکہ فہم علمائے ظاہر کہ از اصطلاح عرفا عاری اند، قوت درک آں نمی دارد۔ چہ علما بلکہ صوفیائے کہ ہنوز در سلوک مقام ناکردہ باشد و از مقام نفس گذشتہ بمرتبۂ قلب نارسیدہ، ازیں مسئلہ

ضرر یابند۔“

> یہ مسئلہ نہایت نازک اور نہایت باریک ہے عام لوگوں بلکہ ظاہری علما کی سمجھ جو کہ صوفیا کی اصطلاح نہیں جانتے اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ کیوں کہ علما بلکہ وہ صوفیا جو کہ ابھی سلوک کے مقام پر نہیں پہنچے اور نفس کے مقام سے گذر کر قلب کے مرتبہ پر نہیں پہنچے اس مسئلہ سے نقصان اٹھاتے ہیں۔

پھر تحریر فرماتے ہیں:

> پس ایں جا غور باید فرمود کہ مرد ماں را چہ رسد کہ با کس و ناکس بازار مسئلہ وحدۃ الوجود گرم داریم، عوام را کہ جزوے از ایمان تقلیدی می دارند ازاں ہم بے نصیب سازیم، معارف آگاہ! برائے ہمیں احتیاط، احباب فقیر زباں ازیں قیل وقال بستہ می دارند۔
>
> پس یہاں غور کرنا چاہیۓ کہ آدمیوں کو اس میں کیا ملتا ہے کہ ہر اہل و نااہل کے ساتھ وحدۃ الوجود کے مسائل پر بازار گرم رکھتے ہیں اور عام لوگ کہ تقلیدی ایمان کے سوائے کچھ نہیں جانتے اس سے بھی ہم ان کو محروم کردیں۔ اے معارف آگاہ اسی احتیاط کے باعث فقیر کے احباب اس قیل وقال سے (زبان) بند رکھتے ہیں۔

اس عبارت میں حاجی صاحب نے اپنے مریدین مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے متعلق وہی جواب دیا ہے جو شیخ محی الدین ابن عربی کے متعلق مشہور ہے کہ شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردیؒ جو ابن عربی کے ہم عصر تھے ان سے لوگوں نے ابن عربی کے متعلق دریافت کیا تو شہاب الدین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ” فھو زندیق“ (وہ بے دین ہے) جب ابن عربی کا انتقال ہوا تو حضرت سہروردی نے ان کے متعلق فرمایا: ” مات قطب الوقت من کان ولی اللہ“ (وقت کا قطب چل بسا جو اللہ کا ولی تھا) مولانا محمد قاسم وغیرہ بھی اسی لئے اس مسئلہ میں پڑنے سے منع فرماتے ہیں۔

وحدۃ الوجود کی فارسی زبان

چونکہ یہ رسالہ وحدۃ الوجود کے جیسے نازک مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کی زبان بھی نہایت ٹھوس، علمی اور متین ہے۔ اور گذشتہ خط کے مقابلے میں علمی ہونے کے باعث بلند ہے۔

یہاں تک پہنچ کر اب ہم ''ضیاء القلوب'' سے کچھ فارسی عبارتیں منتخب کر کے اور پیش کرتے ہیں، حاجی صاحب کی فارسی عبارتوں میں بھی ہم نے اس امر کا خاص لحاظ رکھا ہے کہ زبان کے علاوہ ایسی عبارتیں منتخب کی ہیں جس میں قاری کو اسلامی ادب کے علاوہ اپنے ان معتقدات کا علم ہو جو کسی قوم کے لئے ضروری ہو سکتی ہیں۔ نیچے کی عبارت میں زیارت جمالِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم کے حصول کا طریقہ درج ہے۔ حاجی صاحب ''ضیاء القلوب'' میں تحریر فرماتے ہیں:

طریقۂ حصولِ جمالِ زیارت سرکارِ مدینہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

> بعد نمازِ عشا با طہارتِ کامل و جامۂ نو و استعمالِ خوشبو با دب تمام رو بسوئے مدینہ منورہ بنشیند و ملتجی از جناب قدس حقیقت محمدی برای حصولِ زیارتِ جمالِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم بشود و دِل را از جمیع خطرات خالی کردہ صورت آں حضرت بلباس بسیار سفید و عمامۂ سبز و چہرۂ منور مثل بدر بر کرسی تصور کند وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ (راست) وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا نَبِیَّ اللّٰہِ (چپ) وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہِ در دِل خود ضرب کند۔ ایں درود شریف را ہر قدر کہ تواند پی در پی تکرار کند بعد ازاں ایں ہر سہ درود را اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ كَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُّصَلِّیَ عَلَیْهِ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضَاهُ ہر قدر کہ تواند بعدد طاق بخواند و بوقت خفتن بست و یک بار سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ خواند بتصور جمال

مبارک درود گویاں سر بسوی قطب ورو بقبلہ و بر دست راست بخسپد وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ خواند بر کف راست دمیدہ وزیر سر نہادہ بخسپد۔ ایں عمل بہ شب جمعہ یا بشب دوشنبہ بہ بکند۔ چند بار بعمل آرد ان شاء اللہ تعالیٰ بمطلوب خواہد رسید۔

عشا کی نماز کے بعد مکمل طہارت، نئے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے پورے ادب سے بیٹھے اور اللہ تعالیٰ سے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے جمال مبارک کے حصول کے حقیقت محمدی کا طلبگار ہو اور دِل کو تمام وسوسوں سے خالی کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت کا بہت سفید لباس، سبز عمامہ اور چودھویں کے چاند کی مانند روشن چہرے کے ساتھ کہ آپ کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں تصور کرے اور وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ الله داہنی جانب اور وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا نَبِيَّ الله (بائیں جانب) وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَبِيْبَ اللهِ اپنے دِل میں ضرب کرے اور اس درود شریف کو جس قدر بھی کہ کر سکے پے درپے بار بار پڑھے۔ اس کے بعد ان تینوں درودوں (یعنی) اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا اَمَرْتَنَا اَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْهِ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضَاهُ جس قدر بھی کر سکے طاق عدد پڑھے اور سوتے وقت اکیس مرتبہ سورت اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللهِ پڑھ کر جمالِ مبارک کے خیال میں درود پڑھتا ہوا قطب کی طرف سر کر کے اور منہ قبلہ کی طرف داہنے ہاتھ پر سوئے اور وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ الله پڑھ کر داہنے ہاتھ پر دَم کرے اور سر کے نیچے رکھ کر سو جائے۔ یہ عمل جمعہ کی رات یا پیر کی رات کرے۔ (ضیاء القلوب ص: ۴۹)

چند مرتبہ عمل کرے انشاء اللہ تعالیٰ مطلب کو پہنچے گا۔

مذکورہ بالا عبارت سے آپ حاجی صاحب کی فارسی نثر نگاری کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ علم تصوف پر جہاں کچھ لکھتے ہیں اور وہ مسئلہ بھی سادہ اور آسان ہو تو اس وقت ان کی طبیعت کا رنگ اور زبان کا ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ حسب ذیل عبارت میں ناشر نے قرآن کریم کی تلاوت کے طریقے کو کس انداز اور زبان میں بیان فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

طریق تلاوتِ قرآن کریم

> بدانکہ تلاوت قرآن افضل عبادت است وکدام طریق برائے تقرب الی اللہ سوائے فرائض بہتر از تلاوت قرآن نیست پس آداب واستحباب او آں ست کہ با اخلاص تمام با طہارت کامل رو بقبلہ با ترتیل وخشوع وتحزن بعد از اعوذ باللہ وبسم اللہ بملاحظۂ آں کہ کلام با خدا می کند گویا اورا می بیند واگر نتواند بداند کہ او مرا می بیند و باوامر نواہی مرا حکم می فرماید و بر آیت بشارت فرحاں و بر آیت وعید ترساں وگریاں باشد وبجہر والحان خوش کہ موجب جمعیت خاطر ودفع غفلت است بخواند وایں عام است۔ وطریق خاص آں کہ طالب با شرائط مذکور در خلوت کہ کدام مخل خلوت نباشد بعد ادائے دو رکعت نفل باداب وحضور تمام بنشیند وقرآن شریف را روبرو نہند وعظمت کلام کبریائی وتذلل خود ملاحظہ نماید ودِل را از جمیع خطرات خالی کردہ متوجہ بحقیقت قرآنی کہ صفت کلام نفسی حق است گردد ودریں مراقبہ اندک توقف کند۔ چوں خاطر جمع شود وحضوریت بحق تعالیٰ چوں شاگرد پیش استاذ بیقین حاصل آید۔ بعد اعوذ باللہ وبسم اللہ بخشوع وخضوع تمام با ترتیل وتجوید چنانکہ پیش استاذ می خوانند ہیچ دقیقہ قرأت فرو نگذارند، تلاوت نماید ودر حین قرأت خیال کند کہ زبانِ دہن ولسان دِل صنوبری ہر دو برابر تلفظ می کند۔ ازیں ملاحظہ غافل نشود وگر غفلت آید زود اعوذ خواند دِل را حاضر کند۔ چوں ازیں مشق جمعیت خاطر وحضوریت بحق تعالیٰ حاصل آید

بعد ازاں تصور کند کہ ہر بن موی جسد قاری برائے قرأت قرآن زبان گردیدہ و ہر بن مو الفاظ می آیند و تمام قالب قاری حکم شجرۂ موسوی پیدا کردہ است دریں ملاحظہ و در عین قرأت مستغرق گردد۔ چوں در ایں ملکہ حاصل آید بعد ازاں در وقت تصور کند کہ حق تعالیٰ بزبان قاری میخواند و او می شنود و بعد ازاں تصور کند کہ سالک می خواند و حق بگوش سالک می شنود۔ چوں دریں ملکہ شود بعد ازاں در قرأت خود تصور کند کہ او تعالیٰ خود میخواند و خود می شنود و ایں ہیچ نیست نہ وجود سالک نہ وجود موجودات بجز آنکہ آواز یست کہ از ہر جہت می آید و سالک دریں محو است۔ چوں ایں مرتبہ بکمال رسد بفضلہٖ تعالیٰ امید ست کہ معنی حقیقی و اسرارِ قرآنی منکشف گردد و سالک بمطلوب خود برسید۔ (ضیاء القلوب ص:۴۷-۴۸)

سمجھو کہ قرآن کریم کی تلاوت عبادتوں میں افضل ہے۔ اور اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لئے فرائض کے سوائے قرآن کی تلاوت سے بہتر اور کوئی نہیں ہے اس لئے نماز کے آداب اور استحباب یہ ہیں کہ پورے اخلاص اور پوری طہارت کے ساتھ قبلہ کی طرف منہ کر کے ٹھہر ٹھہر کر عاجزی کے ساتھ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کے بعد اس خیال سے پڑھے کہ خدا کے ساتھ باتیں کر رہا ہے اور گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو یہ سمجھے کہ وہ مجھے دیکھتا ہے اور اوامر و نواہی کا حکم دے رہا ہے اور خوشخبری کی آیت پر خوش اور سزا کی آیت پر خوف زدہ اور روتا ہوا ہونا چاہئے اور خوش الحانی سے جس سے دِل کو اطمینان اور غفلت دور ہو پڑھے اور یہ عام طریقہ ہے۔ لیکن خاص طریقہ یہ ہے کہ پڑھنے والا مذکورہ شرطوں کے ساتھ تنہائی میں کہ جہاں کوئی خلل نہ ڈال سکے دو رکعت نفل پڑھ کر پورے ادب اور یکسوئی کے ساتھ بیٹھے اور قرآن کریم کو سامنے رکھے اور اس کی عظمت اور اپنی ذات کو دیکھے اور دِل کو تمام خیالات سے خالی

> کر کے قرآن کی حقیقت کی طرف کہ خدا کے کلام نفسی کی صفت ہے متوجہ ہو اور اس مراقبے میں تھوڑا سا توقف کرے۔ جب دِل مطمئن ہو جائے اور خدا کی طرف دھیان ہو جائے جیسا کہ شاگرد کا استاد کے سامنے ہوتا ہے تو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر پوری عاجزی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر تجوید کے ساتھ جیسا کہ استاد کے سامنے پڑھتے ہیں کوئی دقیقہ قرأت کا نہ چھوڑیں تلاوت کریں اور پڑھتے وقت خیال کرے کہ منہ کی زبان اور صنوبر نما دِل کی زبان دونوں پڑھ رہی ہیں۔ اس ملاحظہ سے غافل نہ ہو۔ اور اگر غفلت ہو جائے تو جلد اعوذ پڑھ کر دِل کو حاضر کرے جب اس مشق سے دِل کو اطمینان اور خدا کی بارگاہ میں حاضری حاصل ہو جائے تو اس کے بعد تصور کرے کہ تلاوت کرنے والے کے جسم کے بال کی ہر جڑ قرأتِ قرآن کے لئے زبان بن گئی ہے اور رویں رویں سے الفاظ نکل رہے ہیں اور قاری کا تمام دِل شجرۂ طور کا سا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ اس ملاحظہ میں بالکل قرأت میں محو ہو جائے، جب اس میں ملکہ حاصل ہو جائے تو اس وقت کے بعد تصور کرے کہ حق تعالیٰ قاری کی زبان سے پڑھتا ہے اور وہ سنتا ہے اور اس کے بعد تصور کرے کہ سالک پڑھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سالک کے کان سے سنتا ہے۔ جب اس میں بھی مشق ہو جائے تو اس کے بعد اپنی تلاوت کے متعلق خیال کرے کہ وہ بلند ذات خود پڑھ رہی ہے اور خود سن رہی ہے۔ اور یہ کچھ نہیں ہے نہ تو سالک کا ہی وجود ہے اور نہ موجودات کا سوائے اس کے کہ ایک آواز ہے کہ ہر طرف سے آرہی ہے اور سالک میں محو ہے۔ جب یہ مرتبہ کمال کو پہنچ جائے تو اللہ کے فضل سے اُمید ہے کہ حقیقی معنی اور اسرار قرآنی واضح ہو جائیں گے۔ اور سالک اپنے مقصد کو پہنچ جائے گا۔

مذکورہ بالا فارسی عبارت قرآن کریم کی تلاوت کے طریقے کے بارے میں ضیاء القلوب

سے لی گئی ہے۔ اب ہم ایک اور دوسری عبارت اسی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔ حاجی صاحب نماز پڑھنے کے مختلف طریقے لکھ رہے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ حسب ذیل عبارت میں پیش فرماتے ہیں۔ ہم اس عبارت کا ترجمہ بھی اردو میں لکھتے ہیں:

بدانکہ وقت ادای نماز روی قلب را متوجہ بسوی حقیقت کعبہ کہ صفت موجودیت حق است ساز دو نور حقیقت نماز را کہ صفت الوہیت او تعالیٰ است ملاحظہ نماید و تصور حقیقت خود کہ مرتبۂ عبدیت ست بعجز تمام پیش آرد و خالص نیت ادای خدمت عبدیت کند و برای تکبیر دست بردارد و خیال نماید کہ از ہر دو جہان دست برداشتہ رجوع الی اللہ گشتہ و بگوید اَللّٰہُ اَکْبَرُ و تصور کند گویا کہ نفس خود را بہ تکبیر ذبح و تصور کند گویا کہ نفس خود را بہ تکبیر ذبح کردہ فنا ساخت و بعد تسبیح و تحمید، قرأت شروع کند و در قرأت ملاحظہ قبولیت حق تعالیٰ کند چنانچہ در حدیث شریف آمدہ است کہ وقتیکہ گفت بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ فرمود حق تعالیٰ ستائش من کردہ بندۂ من۔ چوں گفت الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فرمود حق تعالیٰ بر من ثنا کرد بندۂ من۔ چوں گفت مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ فرمود حق تعالیٰ بندہ من عظمت و بزرگی من کرد چوں گفت اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ فرمود حق تعالیٰ کہ درمیان من و درمیان بندہ من است و مر بندۂ مرا است آنچہ خواست۔ وقتیکہ گفت اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فرمود حق تعالیٰ ایں برای بندۂ من است و مر بندۂ مرا است انچہ خواست پس در ملاحظہ مجاوبہ مستغرق گردد۔ و در رکوع نظر بر پشت پا دارد و ملاحظۂ عظمت و کبریائی او تعالیٰ و تذلل خود کند و در سجود نظر بر پرۂ بینی دارد و ملاحظہ علو او تعالیٰ و تحقر و خاکساری خویش نماید و در قاعدہ نظر بر سینہ دارد و ملاحظہ معنی التحیات کند و دراں حالت یقین داند کہ در حضوری تعالیٰ در مجلس

انبیاء اولیاء داخل است و نیز در ہر نماز ملاحظہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ ملحوظ دارد و اگر خطرہ آید بملاحظہ لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ رفع سازد۔ و در قرأت آواز تلفظ چناں باید کہ گوش خود بشنود بلکہ ہر کہ برابر او باشد او ہم استماع نماید۔ اما چنداں جہر نکند کہ آواز از حلق برآید الا در نماز جہریہ۔

واضح ہو کہ نماز پڑھنے کے وقت دلی توجہ حقیقت کعبہ کی طرف کہ خدائے تعالیٰ کی صفت موجودیت ہے، کرے۔ اور نماز کی حقیقت کے نور کو کہ اس رب العزت کی صفت الوہیت ہے ملاحظہ کرے اور اپنی حقیقت کا تصور جو کہ بندگی کا مقام ہے پوری عاجزی سے کرے اور عبدیت کی خدمت کے ادا کرنے کی خالص نیت کرے۔ اور تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھائے اور خیال کرے کہ دونوں جہانوں سے قطع تعلق کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اللہ اکبر کہے کہ گویا اپنے نفس کو تکبیر کے ساتھ ذبح کر کے فنا کر دیا ہے۔ اور سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ اور الحمد شریف کے بعد قرأت شروع کرے اور قرأت میں حق تعالیٰ کی قبولیت کا تصور کرے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی اور جب بندہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے درمیان اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو کچھ اس نے چاہا۔ جب نمازی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھتا ہے تو

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو کچھ اس نے چاہا پس جواب ملنے کے تصور میں محو ہو جائے۔ اور رکوع میں پاؤں کی پشت پر نظر رکھے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور بلندی اور اپنی عاجزی کو دیکھے۔ اور سجدے میں ناک کے نتھنے پر نظر رکھے اور اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اپنی حقارت اور خاکساری پر غور کرے اور بیٹھنے کی حالت میں سینے پر نظر رکھے اور التحیات کے معنی سمجھے اور اس حالت میں یقین کی کیفیت پیدا کرے کہ خدا تعالیٰ کی حضوری اور انبیاء و اولیاء کی مجلس میں داخل ہے اور ہر نماز میں یہ حالت پیدا کرے کہ وہ اس طرح اللہ کی عبادت کر رہا ہے کہ گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر کوئی وسوسہ پیدا ہو تو اس حدیث سے کہ حضور قلب کے بغیر نماز نہیں ہوتی اس کو دور کرے۔ اور قرأت کے وقت اس طرح پڑھے کہ اپنے کان بھی سنیں اور برابر والا بھی سن لے۔ لیکن اتنی زور سے نہ پڑھے کہ آواز حلق سے باہر نکلے ہاں جہری نماز میں درست ہے۔

طریق دیگر نماز

بشرائط معہودہ در حالت نماز نور حقیقت صلوٰۃ را مثل ستارۂ درخشاں در حیں قیام بر سجدہ گاہ و در رکوع بر پیشانی و در حالت سجدہ بر پرۂ بینی و قعود برابر سینہ مشاہدہ کند و مستغرق گردد۔ پس چوں بایں طور مذکور در ادائے نماز مزاولت و مشق نماید بعونہٖ تعالیٰ نماید حقیقی رو دہد و حقائق و معارف گونا گوں مکشوف گردد و مرتبہ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ہمیں است کہ مقصود دُنیا و مافیہا را گذشتن و باحق پیوستن است وَاللّٰہُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ خداوندا مارا و جمیع دوستان مارا و ہمہ طالبان حق را ازیں دولت مشرف گرداں و دریں بمیراں و برانگیزاں بمنہ و کرمہ و بحرمت النبی وآلہ واصحابہ اجمعین آمین۔ آمین۔ آمین

مذکورہ بالا شرطوں کے ساتھ نماز کی حالت میں نماز کی حقیقت کا نور چمکدار ستارے کی طرح، قیام کی حالت میں سجدے کی جگہ اور رکوع میں پیشانی پر اور سجدے میں ناک کے پروں پر اور بیٹھنے کی حالت میں سینے پر دیکھے اور محو ہو جائے، جب اس طرح مذکورہ طریقہ پر نماز ادا کرنے کی مشق اور مہارت کرے گا تو اللہ کی توفیق سے حقیقی نماز نصیب ہوگی، اور طرح طرح کے حقائق اور معارف ظاہر ہوں گے اور نماز مومن کی معراج ہے کا یہی مقام ہے کہ دُنیا ومافیہا کو چھوڑنا اور خدا سے مل جانا ہے اور خدا یہ توفیق جس کو دے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب دوستوں کو اور سب حق کے طالبوں کو اس دولت سے مشرف کرے اور اسی پر خاتمہ اور اسی پر حشر کرے اپنے فضل وکرم اور حرمت نبی وآلِ واصحاب کے ذریعہ۔ آمین۔ آمین۔ آمین۔

فارسی زبان پر تنقید

ان تمام فارسی نثروں کی زبان اور بیان کے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ یہ تبصرہ مناسب ہوگا کہ حاجی صاحب کی فارسی تعلیم کی تمام مبلغ پرواز گلستان تک ہے لیکن اس کے باوجود ان کو فارسی زبان پر اتنی دسترس حاصل ہے کہ وہ مافی الضمیر اور مطالب کو فارسی زبان میں ادا کرنے پر نہ صرف قادر ہیں بلکہ ان کا ادبی ذوق اس زبان میں قابل آفریں ہے۔

ایک خاص اہم بات جو ہمارے خیال میں ان کی فارسی نثر نگاری کے تمام اطراف وجوانب کو دیکھ کر پیدا ہوتی وہ یہ ہے کہ ان کے فارسی خطوط کی فارسی زبان اور علمی مضامین کی زبان میں تنوع ہے۔ اور جب وہ کسی آسان اور سہل مسئلہ پر کلام کرتے ہیں تو ان کی زبان میں گھلاوٹ یا پاکیزگی اور سلاست بے حد ہوتی ہے۔ لیکن وحدۃ الوجود جیسے علمی اور معرکۃ آراء مسئلے میں ان کی زبان کی متانت اور علمیت کا کچھ اور ہی رنگ ہے جو قاری پر غور کرنے سے واضح ہوگا، اور سلیم الطبع علم پر منکشف ہوگا۔

ہم خیال کرتے ہیں کہ ان کی فارسی زبان میں مہارت اور ادبی قوت جواب تک بقدر ظرف واستطاعت ہم نے بیان کی ہے کافی سمجھتے ہوئے ان کی فارسی شاعری کا جائزہ لینے کی طرف توجہ دیں اور قارئین کو انکی فارسی شاعری سے روشناس کرانے کے لئے اپنی تحقیق اور معلومات کے نتائج پیش کرنے کی کوشش کریں۔

فارسی شاعری

حاجی صاحب کی فارسی شاعری بھی کسی استاذ شعروسخن کی ممنون احسان نہیں۔ وہ اپنے خداداد فطری تقاضوں کو شمع راہ بنا کر چلتے ہیں۔ دِل پر عشق حقیقی کی چوٹ لگی ہوتی ہے اس لئے دِل کی بیتابیوں سے مجبور ہوکر لکھتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان کی فارسی شاعری میں قال ہی نہیں بلکہ حال ہے۔ چونکہ ان کی شاعری کی زمین "عشق حسن ازلی" سے گل بداماں ہے اس لے جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت کے ساز کی آواز ہے۔ وہ خود چلتے ہیں اور دوسروں کو جلانا چاہتے ہیں، وہ ایک شمع ہیں جو خود پگھلتی ہے اور انجمن کو روشن کرتی ہے۔ ان کے سوز میں وہ زندگی ہے جس کو من کی دُنیا کہتے ہیں یا علامہ اقبال کی اُسے خودی کہ لیجئے یا حاجی صاحب کی بے خودی۔ لیکن اس بے خودی اور مستی میں وہ ہوشیار بھی ہیں اور خبردار بھی۔ ان کی مستی اور ہوشیاری کا اندازہ ان کی اس فارسی غزل سے کیجئے۔ لکھتے ہیں:

اگرچہ بے خود ومستم ولی ہوشیاری گردم　　بباطن شاہ کونینم بظاہر خوار می گردم
زچشمت می بمیخواراں رسدازلب بستاں قند　　چومن باایں نہ باآنم زحرماں خواری گردم
چوشد منظور قتل من تغافل چیست اے قاتل　　کہ سر برکف، کفن بردوش، گردِ داری گردم
شراب شوق عالم راتو می طلبی دے بخشی　　مگر محرومم گرد خانۂ خمار می گردم

بیا نور محمد کن دِل امداد را روشن
کہ عکس نور بے کیفم پئے انوار می گردم

ان اشعار سے آپ کو ان کی مستی اور ہوشیاری کا پتہ چل سکتا ہے لیکن بات تو یہ ہے کہ ولی را ولی می شناسد۔ ایک اور غزل میں جو ارکان حج، طواف کعبہ اور صاحب کعبہ کے متعلق لکھی ہے اور جو درد تمنا والوں کے گنگنانے کے لئے خوب ہے۔ لکھتے ہیں۔

رفتم چو بمکہ ہوس کوئے تو کردم دیدم رُخ کعبہ ہوس روئے تو کردم
محراب حرم گرچہ بہ پیش نظرم شد من سجدہ ولی درخم ابروئے تو کردم
در سعی وطواف و بحطیم وبمقامے ہر سمت تمنا رُخ نیکوئے تو کردم
لبیک دُعا خواں ہمہ مخلوق بعرفات چوں قبلہ نما من دِل خود سوئے تو کردم
درعرصۂ عرفات بپا حشر نمودم چوں یاد من آں قامت دلجوئے تو کردم

قربانی حیواں بمِنٰے می کند عالم ۔
قرباں سر خود من بسر کوئے تو کردم

مذکورہ اشعار کو پڑھئے اور ان کی فارسی شاعری کا اندازہ لگائے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ حال اور وجد میں ایسے بے خود ہیں کہ انہیں عام خواہشمندوں کی طرح کی تمنا نہیں ہے بلکہ اس تمنا میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، یہی مراد ہے اس درد سے جو شاعری کی روح ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر ہم ان کی فارسی اور اردو دونوں شاعریوں کے متعلق اس فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ حاجی صاحب کی تمام شاعری میں درد ہے، سادگی ہے، سلاست ہے۔ اس درد کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے بھی لگائے جو انہوں نے انبیٹھہ ضلع سہارنپور کے ایک دوست شاہ سید علی احمد کے خط آنے پر لکھے ہیں۔ سید علی احمد صاحب شاعر معلوم ہوتے ہیں اور ان کا تخلص قابل داد بھی ہے اور قابل احترام بھی۔ حاجی صاحب کی اس غزل کا عنوان ہے:

”جواب خط شاہ سید علی احمد صاحب تخلص صلی علی احمد انبیٹھوی“

اس عنوان سے دو باتوں کا اظہار ہو رہا ہے، اوّل تو یہ کہ حاجی صاحب کے پاس ان کا

کوئی خط آیا ہے جس کے جواب میں انہوں نے حسب ذیل اشعار لکھے ہیں۔ دوم یہ کہ نام کے ساتھ ان کا تخلص صلی علیٰ احمد ہے گویا نام سید علی احمد اور تخلص صلی علیٰ احمد کا خوب تقابل پیدا کیا ہے۔ حاجی صاحب کو اپنے دوست کے خط آنے پر بہت ہی مسرت ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں۔

صبا آورد چوں بوئے گل وصل نگار من　　برآمد بر ہوائے شوق ایں مشت غبار من
بحمد اللہ چہ راحت یافت جان بیقرار من　　کہ آمد ناگہاں نامہ زکوئے شہر یار من
خبر آمد، خط آمد، قاصد آمد ہم پیام آمد　　دلم حیراں کہ باشد بر کدامی جاں نثار من
بایں شکرانہ بر دیدہ نہادم پائے قاصد را　　کہ از نامہ منور کرد چشم انتظار من
بدیدہ گریہ، لب نالاں، بجانم سوز، تن یزداں　　ہمیں تسکین دِل بودی ہمیں صبر وقرار من
بعین گریہ من خنداں، دہم در خندہ من گریاں　　بہار اندر خزاں بود وخزاں اندر بہار من
گہی گریاں وگہ خنداں، گہی حیراں، گہی نالاں　　بجز ایں شغل یک لحظہ نبودی روزگار من
نمی گردو بیان شوق وصل وشکوۂ ہجراں　　غرض جز ذکر وفکر تو نبودی ہیچ کار من
کہ آمد نامۂ خوش ناگہاں صل علیٰ احمد　　یکا یک رفت غمہائے دِل اندوہ گار من
زلطفش چشم آں دارم کہ دائم ہمچنیں جاری　　بماند در دلت یاد دِل اُمیدوار من

کنم تحریر اے امداد تا کی شوق وصل او
رسد اے کاش جائے نامہ آں نامی نگار من

اس غزل کی طرز میں منظوم خط کے کل سترہ اشعار ہیں جن میں سے ہم نے صرف گیارہ اشعار انتخاب کر کے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ ایک ایک شعر سے دوست کی محبت ٹپکتی ہے اور اشعار میں درد ہے۔ زبان صاف اور سلیس ہے۔ زبان فارسی اور شگفتگی کے علاوہ حاجی صاحب نے صلی علیٰ احمد سے فائدہ اٹھا کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا ہے۔

غرض آپ کا فارسی کلام اساتذہ کی طرح بلند درجہ رکھتا ہے۔ البتہ لغزشوں سے کون خالی

ہے۔ غالب اور اقبال کے کلام میں بھی مختلف قسم کی لغزشیں موجود ہیں۔ اور یہ تو خود حاجی صاحب نے اپنی مثنوی (غذائے روح) کے خاتمے پر فرمایا ہے۔

شاعری سے مجھ کو کچھ بہرہ نہیں   علم نظم ونثر بھی رکھتا نہیں
چاہئے مقصود دِل اس یار سے   ہے نہ مطلب خوبی اشعار سے
شاعری سے کچھ نہیں ہے مجھ کو کام   چاہتا ہوں یہ کہ ہووے فیض عام
سن کے یہ زیادہ ہو عشق عاشقاں   اور ہووے دور فسق فاسقاں
شاعروں سے کچھ نہیں ہے التجا   عرض ہے اہل صفا سے یہ ذرا
جو کہ دیکھیں اس میں کچھ سہو وخطا   دیں بنا اپنے کرم سے برملا
کرکے اپنے لطف واحساں پر نظر   اس میں دیں اصلاح بے خوف وخطر

دیکھئے آپ نے کس سادگی سے اپنے آپ کو شاعری اور شعراء سے خارج کیا ہے اور خود فرمادیا ہے کہ میرا مقصد اگر کچھ میں نے اشعار میں لکھا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل دِل لوگوں کے قصے لکھ کر فیض عام پہنچایا جائے اور نثر کی بہ نسبت شعروں سے انسان بالطبع لطف لیتے ہیں اس لئے میں نے شاعری کو فیض کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم اپنے مرکز سے ہٹ کر کسی اور طرف متوجہ ہوگئے۔ حالانکہ سلسلۂ کلام حاجی صاحب کی فارسی شاعری تھا۔

ہاں تو ہم یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ موصوف نہ صرف اردو کے کامیاب شاعر تھے بلکہ فارسی میں شعروسخن کا خوب سلیقہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ ان کے گذشتہ فارسی اشعار سے آپنے اندازہ لگایا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بعض جگہ صنعتوں کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں، ذرا حسب ذیل اشعار کو دیکھئے جو شریف مکہ عبداللہ بن عون کی تعریف میں بصنعت توشیح لکھے ہیں۔ صنعت توشیح کا یہ مطلب ہے کہ شاعر کے اشعار کے ہر مصرع یا ہر شعر کے تمام پہلے حرف لے کر ترتیب وار جمع کردئے جائیں تو ممدوح کا پورا نام بن جاتا ہے۔ اب نیچے کے اشعار ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں:

شاد باش اے شاہ اقلیم عرب   رحمت حق بر تو بادا روز وشب
یا الٰہی سایہ اش را کن دراز   فیض بخش بر سر اہل حجاز
عون حق بر تو بود اے ابن عون   باد خوش از تو خدائے ہر دو کون
دوستت خوش دشمنت برباد باد   اہل حرمین از تو بس دِل شاد باد
لنگر انعامت اے شاہِ کرم   ہست دائم بر سر اہل امم

نام ممدوحت چو خواہی اے امیر
حرف اوّل از سر ہر مصرع گیر

شاعر نے اس صنعت کی طرف آخری شعر میں خود توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ اگر ممدوح آپ اپنا نام ان اشعار سے نکالنا چاہیں تو ہر مصرع کا پہلا حرف لے کر نام نکال لیجئے شریف عبداللہ نکل آئے گا۔

حاجی صاحب کے فارسی کلام پر بسط وتفصیل سے تبصرہ کرنے کی اب چنداں ضرورت نہیں۔ مختصر مختصر طور پر ہم نے اس خصوص میں سب کہہ دیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں گلزارِ معرفت میں ہی ان کے فارسی اشعار کا کچھ حصہ دستیاب ہوسکا ہے جو ترانوے اشعار پر مشتمل ہے جن کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو حاجی صاحب صاحبِ دل، ولی کامل، صاحبِ کشف وکرامات اور اردو فارسی کے شاعر تھے جن کے تذکرے سے ہم نے سب سے پہلے اپنی اس تصنیف کا آغاز کیا ہے اور حتی الامکان تحقیق میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جس قدر حالات کو بیان کرنا مناسب سمجھا حسب ضرورت پیش کردیا ہے، لٰہذا ہم ان کے ذکر خیر کو ختم کرنے سے پہلے اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ ان کو شاعر ہی سمجھنا غلطی ہوگا، بلکہ جیسا کہ ان کے حالات سے معلوم ہوا وہ اولیائے کاملین میں سے ایک تھے، جنہوں نے اپنے فیض سے لاکھوں بندگانِ خدا کو روحانیت وہدایت کا راستہ دکھایا اور اپنی تحریر وتقریر، نثر ونظم میں جو کچھ انہوں نے فرمایا وہ

صرف خدائے کریم جل ذکرہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت کا سامان فراہم کرکے اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے زمرے میں اپنا نام لکھوایا۔

حاجی صاحب کی زندگی کا آغاز ہی بتا رہا تھا کہ وہ کچھ بن کر رہیں گے، چنانچہ شاہ نصیرالدین صاحب دہلوی سے جب بیعت کی تو اسی زمانے میں آپ کی روحانی حالت بلندیوں کی طرف جا رہی تھی۔ روحانی مقامات میں بعض کاملین کو دربار خداوندی سے براہِ راست علم لدنی کی طرح روحانیت کا کمال حاصل ہو جاتا ہے، جس طرح حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات اور احوال عالم باطنی کا علم موسیٰ علیہ السلام سے بھی زیادہ تھا، اگرچہ شریعت کے علوم میں موسیٰ علیہ السلام کی برابر کسی کا علم بھی نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کی باہمی ملاقات، کشتی کا تختہ توڑ ڈالنا، ایک بچے کو ہلاک کر دینا، ٹیڑھی دیوار کو درست کر دینا ان سب واقعات میں موسیٰ علیہ السلام کا حیران ہونا اور تعجب سے بے صبر ہو کر خضر علیہ السلام سے حقیقت کا معلوم کرنا یہ وہ سب صاف صاف باتیں ہیں جو براہِ راست اولیاء کے قلوب پر بارگاہِ خداوندی سے ضوفگن ہوتی ہیں اور کبھی کسی کو کسی روحانی انسان کے ذریعہ روحانیت کی معراج پر پہنچایا جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب فرماتے ہیں:

> ”ظاہر میں اوّل میری بیعت طریقہ نقشبندیہ میں حضرت نصیرالدین صاحب دہلوی خلیفہ حضرت شاہ محمد آفاق صاحب سے ہوئی اور باطن میں بلا واسطہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند جگہ پر رونق افروز ہیں اور حضرت سید احمد صاحب شہید کا ہاتھ آپ کے دست مبارک میں ہے اور میں بھی اسی مکان میں بوجہ ادب دور کھڑا ہوں، حضرت سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں دیدیا۔“ (کراماتِ امدادیہ ص: ۳۹)

بہر حال یہ خود حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے براہِ راست بھی بیعت تھی۔ اب یہ باتیں ہر کسی کے سمجھنے کی ہیں بھی اور نہیں بھی۔ جن پر کیفیات طاری ہوئی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو سینہ بسینہ فیوض کا حاصل ہونا ایک صاف اور واضح سی بات ہے لیکن اس کا انکشاف عوام کو ہونا مشکل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق شیخ سعدی نے ایک کام کی بات کہہ کر بہت سی بحثوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ انہوں نے بوستان میں خوب فیصلہ فرمایا کہ ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن　　　که جاہا سپر باید انداختن

حاجی صاحب کے معاملے میں بھی کہ ان پر ظاہری علوم کے خزانے کھول دیئے گئے تھے اعتقاد کر کے عقلی ہتھیاروں کو ڈال دینا چاہیے۔

جب حاجی صاحب شاہ نصیرالدین صاحب کی وفات کے بعد میانجی نور محمد صاحب جھنجھانوی سے بیعت ہوئے جو لوہاری تھانہ بھون کے قریب ایک آبادی میں بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، تو میانجی صاحب کے کمال باطنی کے باعث حاجی صاحب کہیں سے کہیں جا پہنچے اور میانجی صاحب نے آپ کی اعلیٰ استعداد دیکھ کر آپ کو بندگانِ خدا کی رہنمائی اور بیعت لینے کی اجازت عطا فرمائی۔ چنانچہ ہزاروں تشنگانِ روحانیت نے آپ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کے روحانی کمال کو دیکھ کر میانجی صاحب نے کیا خوب بات فرمائی تھی کہ:

”ہم نے ایک ایسی ہنڈیا پکائی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہ پکی تھی۔“

اس جملے میں میانجی صاحب نے حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی پختگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس پکی ہوئی لذیذ ہانڈی میں سے بڑے بڑے علماء اور صوفیاء نے کھایا اور ہمیشہ کے لئے محو لذت ہو گئے۔

حاجی صاحب کی شاعری بھی ایک لذیذ کھانا ہے جو اس سے لذت لیتا ہے شاد کام ہوتا ہے۔ میرے استاد مولانا عبدالقیوم صاحب ارشق شیر کوٹی نے مجھ سے فرمایا کہ کسی نے حضرت حاجی صاحب کے اشعار اصلاح کے لئے دہلی کے مشہور شاعر مومن کو دکھائے تو بہت کچھ غور کرنے کے بعد کہا کہ اس کلام میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ جہاں کہیں زبان میں سقم ہے اس کی جگہ کوئی اور لفظ فصیح بھی اچھا نہیں لگتا۔

کاش حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذرۂ دردِ دل مجھے بھی نصیب ہو، اور کاش ان کے حالات کے اس سلسلے کے صدقے سے راقم الحروف کی بخشش کا بھی سامان ہو جائے۔

اب حاجی صاحب کے ذکر خیر سے حسبِ استطاعت عہدہ برآ ہو کر دورِ اوّل کے دوسرے بزرگ حضرت قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی طرف اپنے قلم کی باگ موڑتے ہیں اور ہر ایک بزرگ کے حالات اس طرح سے کتابت میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اگرچہ کتاب تو مشاہیر دیوبند کے نام سے ایک ہی ہے لیکن اس کے حصے مختلف ہیں، اور اگر کوئی صاحب چاہیں تو ہر ایک حصہ ایک مستقل تصنیف ہو سکتی ہے۔

والحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ۔

◆

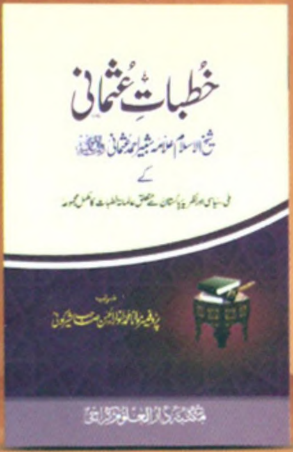
خطباتِ عثمانی
شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی
کے
مکتبہ دارالعلوم کراچی

انوارِ قاسمی
بانی دارالعلوم دیوبند
ناشر
مکتبہ دارالعلوم کراچی

انوارِ عثمانی
مکتوبات
شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی
مکتبہ دارالعلوم کراچی

حیاتِ عثمانی
مکتبہ دارالعلوم کراچی

Faraz: 0302-2691277

مکتبہ دارالعلوم کراچی